ISSN 2454-5260
جنوری۔جون ۲۰۱۵ء
فصیح الدین بلخی نمبر
گوپال پور
اِدراک
مدیر اعزازی
ڈاکٹر سید حسن عباس

مشورت ادراک و هشیاری دهد عقلها را عقلها یاری دهد
مولانا روم

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے
اقبال

ادراک گوپال پور

کتاب ہشتم

جنوری تا جون ۲۰۱۵

فصیح الدین بلخی نمبر

مدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سید حسن عباس

مرکز تحقیقاتِ اردو و فارسی، گوپال پور
باقر گنج، سیوان، بہار-۸۴۱۲۸۶

مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی سیوان کی عدالت میں ممکن ہے۔

خط و کتابت کا پتا:

نیو۔ایف ۱۷، حیدر آباد کالونی

بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، ۲۲۱۰۰۵

موبائل نمبر: ۹۸۳۹۳۳۷۹۷۹

shabbas_05@yahoo.co.in

انتساب

فصیح الدین بلخی مرحوم کے معتقدین
کے نام

علامہ جمیل مظہری

قطعۂ تاریخ وفات

آج ہے فردوس کا منظر مرے پیش نگاہ ۔۔۔ بادہ خواران معانی جمع ہیں ساقی کے پاس

سیڑھیوں پہ حوض کوثر کے ہیں سعدیؔ و کبیرؔ ۔۔۔ زیر طوبیٰ تلسیؔ و ہومرؔ ہیں فردوسیؔ کے پاس

شادؔ و آتشؔ ہیں عراقیؔ و فغانیؔ کے قریب ۔۔۔ میکدے میں میرؔ و غالبؔ حافظ و عرفیؔ کے پاس

اِس طرف ارباب فکر اور اُس طرف ارباب فکر ۔۔۔ اہل دل رومیؔ کے پاس اہل خرد رازیؔ کے پاس

باادب بیٹھا ہے ابن رشدؔ ارسطو کے قریب ۔۔۔ کانٹؔ اور ہیگلؔ ہیں سرگرم سخن طوسیؔ کے پاس

ہے سیاسی بحث میں چانکؔ، نظام الملک سے ۔۔۔ ہنس رہا ہے مارکسؔ افلاطون یونانی کے پاس

چھنتی ہے گاڑھی لب کوثر میں خیامؔ و ریاضؔ ۔۔۔ اور جگرؔ نہر لبن پر کیٹسؔ اور شیلیؔ کے پاس

شہپر شاہیں لئے اقبالؔ بھی ہیں زیر عرش ۔۔۔ ہم سخن جبریل سے سدرہ کی اک کھڑکی کے پاس

الغرض ہے خلد وہ بزم طرب جس میں جمیلؔ ۔۔۔ ہیں سبھی اپنے رفیق فکری و ذہنی کے پاس

با دل شاداب ہاتف ہم کو دیتا ہے خبر

کہ فصیح الدین بلخی آج ہیں شبلی کے پاس

۱۳۸۱ھ

پروفیسر نادم بلخی

قطعۂ تاریخ وفات حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم

خاندان بلخیہ کی جاں فصیح الدین بلخی
آپ کو کھوکر ہوں نوحہ خواں فصیح الدین بلخی

وہ بھلائیں کس طرح سے آپ کی فرقت کے غم کو
آپ نے جن پر کیا احساں فصیح الدین بلخی

ایک میں ہی ہوں نہیں ہر شخص گھر کا ہے یتیم اب
سر پرستی کا نہیں ساماں فصیح الدین بلخی

آہ وہ ماحول جو تھا آپ کے دم سے منور
بجھ گیا ہے اب کہاں تاباں فصیح الدین بلخی

بے سہارا غم زدہ ہے اے پدر !جان پسر وہ
آپ کے دم سے جو تھا شاداں فصیح الدین بلخی

آپ کی ہجرت سے جن کو داغ فرقت مل گیا ہے
آپ تو ان سے نہ تھے نالاں فصیح الدین بلخی

آپ کی تاریخ رحلت کا خیال آیا مجھے جب
مجھ کو ہاتف نے دیا ساماں فصیح الدین بلخی

یہ کہا اُس نے یہی تاریخ مرگ ان کی ہے نادمؔ
''ساکنان خلد میں ہیں ہاں! فصیح الدین بلخی''

۱۹۶۲

فہرست مندرجات

پیش نامہ

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بڑا نام رہے

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ نومبر ۱۹۹۶ء میں جی۔ ال۔ اے کالج ڈالٹن گنج (پلاموں) میں لکچرر کی حیثیت سے جوائن کرنے سے پہلے تک میں فصیح الدین بلخی اور ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے واقف نہیں تھا۔ جب میں اس شہر میں پہنچا تو ان کے اکلوتے فرزند پروفیسر نادم بلخی جیسی محترم و مہربان شخصیت اور ان کے بیٹے پروفیسر مظفر بلخی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پروفیسر نادم بلخی .G.L.A کالج میں صدر شعبۂ اردو تھے اور ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ لیکن ڈالٹن گنج ہی میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی علمی ادبی فیض رسانیوں سے واقفیت ہوئی۔ موصوف کا شمار اردو کی مایۂ ناز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ پلاموں جیسی دور افتادہ جگہ میں رہ کر بھی انھوں نے حتی المقدور علم وادب کی خدمات انجام دیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ایک کتاب 'ذکر نادم بلخی' (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) کے مطالعہ سے کسی حد تک ان کے ادبی اور علمی کاموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو راقم الحروف کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر نادم بلخی کے والد فصیح الدین بلخی بھی علم و ادب کے خادم، تحقیق کے مرد میدان، تاریخ کے دُرِ شاہوار، تنقید کے گوہر آبدار اور سب سے بڑھ کر انسانیت کے علمبردار تھے۔ ان کے علمی کارناموں سے اہل علم واقف ہیں۔ بلخی صاحب کا خانوادہ ایک علمی خاندان کہلاتا ہے جس کے لیے، ہمہ خانہ آفتاب، کی اصطلاح بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کے مضمون میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بلخی صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علم و ادب کی خدمت اور نادر و نایاب مخطوطات، کتبے، دستاویزات اور فرامین و اسناد کی تلاش و جستجو میں صرف کیا۔ ایسے فنائی العلوم کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہماری نسل اُن

کے نام سے بھی واقف ہوگی اس میں شبہ ہے چہ جائیکہ ان کے کارناموں کو مشعل راہ بنا کر تحقیق کے مزید سنگ میل نصب کئے جائیں۔ یا ان کے اور ان جیسے دوسرے اکابرین علم و ادب کے ادھورے کارناموں کو پورا کیا جائے۔

فصیح الدین بلخی کا انتقال ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوا تھا۔ نصف صدی سے زاید کے اس عرصے میں کم ہی اُن کا ذکر کہیں آیا ہوگا یعنی مرتے ہی انھیں بھلا دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ہی پروفیسر نادم بلخی نے ڈالٹین گنج سے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'کوئل' کے "فصیح الدین بلخی نمبر" کی اشاعت کا اعلان کیا تھا۔ نمبر کی اشاعت سے قبل ہی 'کوئل' کی سریلی آواز پلاموں کے گھنے جنگلوں میں گم ہوکر رہ گئی۔ لیکن نمبر کے اعلان کے بعد اس وقت کے مشاہیر اہل قلم نے بلخی صاحب مرحوم کی شخصیت اور علمی کارناموں کے جائزے پر مشتمل مضامین سپرد قلم کئے اور پروفیسر نادم بلخی صاحب کو بھیجے۔ چوں کہ کوئل بند ہو چکا تھا اس لیے یہ مضامین بھی طاق نسیاں کے حوالے ہو گئے۔ اگرچہ پروفیسر نادم بلخی صاحب کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر مظفر بلخی (سابق صدر شعبۂ اردو جنتا شیوراتری و جی ال اے کالج ڈالٹن گنج) نے اپنے تحقیقی مقالے 'فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے، کی تیاری میں ان مضامین سے خوب خوب استفادہ کیا ہے تاہم مشاہیر اہل قلم کی اصل تحریروں کی اپنی خاص اہمیت ہوتی ہے اور اسی لیے انھیں عام ہونا چاہیے تھا مگر نہ ہوسکیں۔ ڈالٹن گنج کے قیام کے دوران پروفیسر نادم بلخی کے ذاتی ذخیرۂ کتب سے استفادے کا مجھے موقع ملا۔ ایک دن یہ تحریریں جو ایک پلندے کی شکل میں رکھی ہوئی تھیں، مجھے ملیں۔ میں نے انھیں جھاڑ پونچھ کر دیکھا تو مختلف اہل قلم کے فصیح الدین بلخی مرحوم پر مضامین نکلے۔ دریافت کرنے پر صورت حال معلوم ہوئی۔ میں نے ان کے تحفظ کا خیال ظاہر کیا تو نادم بلخی صاحب نے نہایت فراخدلی اور شفقت فرماتے ہوئے ساری چیزیں میرے حوالے کر دیں۔ میں نے اپنے رسالے 'ادراک' کے بلخی نمبر میں انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کی نقل نویسی کے کام میں لگ گیا۔ کاغذات بے حد بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بہت مشکل سے انھیں از سر نو ترتیب دے کر نقل کر سکا۔

فصیح الدین بلخی مرحوم پر جن اہل قلم کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں، ان میں اکثر

محتاج تعارف نہیں ہیں اور بیشتر بزرگوار اب اس خاکدان ہست وبود سے جدا ہو کر ابدی آرامگاہ میں محو استراحت ہیں۔ البتہ چند حضرات کا سایہ ہم پر ضرور باقی ہے اور خداوند عالم سے دعا ہے کہ وہ تادیر گیسوے ادب سلجھاتے رہیں اور ہماری راہنمائی فرماتے رہیں۔ مرحوم قلم کاروں کی یاد کو تازہ کرنے کا یہ ایک بہانہ بھی ہے اور موجود قلم کاروں کو کلمۂ خیر سے نوازنے کا موقع بھی۔ چند مضامین نئے ہیں۔ جنھیں بعد میں لکھوایا گیا ہے جن میں پروفیسر مختار الدین احمد صاحب اور پروفیسر شکیل الرحمن صاحب کے علاوہ شعور گوپال پوری (مرحوم) کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے جتنی تفصیل سے خانوادۂ بلخیہ اور اس کے افراد کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی ہے وہ کچھ ان ہی جیسے باکمال لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ مفصل مضمون ایک اہم ماخذ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ خانوادۂ بلخیہ سے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو جو گہری عقیدت تھی وہ ان کی اس تحریر سے پوری طرح عیاں ہے۔ افسوس کہ وہ یہ تحریر کتابی صورت میں نہ دیکھ سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قلم کار حضرات کے عملی تعاون کے لیے سپاس گزار ہوں۔

پروفیسر نادم بلخی اور ان کے اہل خانہ بالخصوص ڈاکٹر مظفر بلخی نے ناچیز پر جس اعتماد واطمینان کا اظہار کیا ہے اس کے لیے ان دونوں حضرات کا ممنون ہوں۔

فصیح الدین بلخی مرحوم۔ قاضی عبدالودود اور پروفیسر سید حسن عسکری تحقیق کی تثلیث کی حیثیت رکھتے تھے۔ پروفیسر سید حسن عسکری اور فصیح الدین بلخی نے فیلڈ ورکس کے ذریعے جو کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں ان سے کم لوگ واقف ہیں۔ ان دونوں حضرات نے دور دراز کے علاقوں میں سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اونچی اونچی عمارتوں پر چڑھ کر اور کنویں میں اتر کر قدیم کتبات تلاش کیے اور ان کے چربے اتارے۔ ایسے کتبوں پر مشتمل کتاب 'پٹنہ کے کتبے' شائع ہو چکی ہے۔

فصیح الدین بلخی پر یہ کتاب ایسے وقت میں منظر عام پر آ رہی ہے جبکہ ان کے فرزند پروفیسر نادم بلخی (وفات: ۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء) اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری خواہش اور کوشش تھی کہ یہ کتاب اُن کی حیات مستعار میں شائع ہو جاتی مگر وسایل کی کمی اور اپنی

نارسائیوں کے سبب ایسا نہ ہو سکا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس کے باوجود 'دیر آید درست آید' کے مصداق اگر اب بھی یہ کتاب شائع ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے تو شائد کچھ دیر نہیں ہوئی۔ خدا کرے یہ مضامین اہل ذوق کے لیے مہمیز کا کام کریں اور ہماری نسل میں بھی فصیح الدین بلخی جیسے لوگ پیدا ہوں۔ جن کا عقیدہ تھا:

'ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بڑا نام رہے'

مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ 'ادراک' کے حنیف نقوی نمبر کے بعد حالات کچھ ایسے رہے کہ باوجود خواہش بسیار، کوئی شمارہ منظر عام پر نہیں آسکا۔ قارئین میں سے اکثر حضرات نے تجدید اشاعت پر بہت زور بھی دیا۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'۔ اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ اہل علم اور صاحبان ذوق 'ادراک' کے اس نمبر کی بھی اسی طرح پذیرائی کریں گے جس طرح انھوں نے 'حکیم سید ظل الرحمن نمبر' اور 'پروفیسر حنیف نقوی نمبر' کو پسند فرمایا تھا۔ 'ادراک' کے ابھی کچھ اور خاص نمبر منظر عام پر آنے کے منتظر ہیں جو احمد جمال پاشا، پروفیسر سید حسن، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر مختار الدین احمد اور پروفیسر لطف الرحمن کی شخصیات اور علمی کارناموں کے جائزے پر مشتمل ہوں گے۔ ہمیں آپ کی حمایت اور تعاون کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سید حسن عباس

فصیح الدین بلخی (۱۸۸۵ـ ۱۹۶۲ء)

شناس نامہ

الف : **سوانحی کوائف**

نام: سید فصیح الدین بلخی

والد کا نام: ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

تاریخ پیدائش: سہ شنبہ ۱۰ فروری ۱۸۸۵ء/ ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ/ پھاگن بدی ۱۹۱۰ سمت

تعلیم: ابتدائی - مدرسہ حکیم صوفی صاحب عظیم آباد میں
انٹرنس - محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں ۱۹۰۵ء
فوجی ریجی منٹل منشی فاضل، جنوری ۱۹۱۰ء

ملازمت: جون ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء، بہ حیثیت معلم ملٹری اسکول کرکی۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ بہ حیثیت معلم۔
جزیرۂ فیجی میں سپریم کورٹ میں ترجمان کی حیثیت سے۔ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۴ء
بہار کوآپریٹو سوسائٹی نوادہ کے نگراں کی حیثیت سے۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء
قانون گو کی حیثیت سے سیوان میں
ڈپٹی مجسٹریٹ جون پور
سرکل آفیسر مونگیر بہ مطابق پروانہ مورخہ ۵ر دسمبر ۱۹۲۰ء
مجسٹریٹ، ریونیو آفیسر اور اڈیشنل افسر ریاست سرائے کیلا۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۷ء
ناظم شعبۂ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۹ء

ازدواج: پہلی شادی دختر سید مظہر حسین ساکن محلہ لودی کٹرہ (پٹنہ) کی صاحبزادی بی بی نور فاطمہ سے ہوئی جن کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔

دوسری شادی ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر سید محمد وارث بلخی کی منجھلی صاحبزادی بی بی رسولن سے ہوئی۔

اولاد: محل اولی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ محل ثانی سے تین بچے ہوئے جن میں دو کا انتقال ہوگیا۔ صرف ایک فرزند سید محمد ابراہیم معروف بہ نادمؔ بلخی ۱۶ ستمبر ۱۹۲۶ء (سرٹیفکٹ کے مطابق ۵رستمبر ۱۹۲۸ء) کو متولد ہوئے۔ ۱۹۵۵ء سے جی۔ ال۔ اے کالج ڈالٹن گنج (رانچی یونیورسٹی) میں اردو کے استاد رہے۔ ۱۹۹۰ میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اسی شہر میں ۱۸رستمبر ۲۰۰۶ء کو وفات پائی۔ نادمؔ بلخی اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی کئی کتابیں ہیں۔ ان کے تین لڑکے ڈاکٹر مظفر بلخی (استاد اردو جنتا شیوا اتری کالج و جی۔ال۔ اے کالج ڈالٹن گنج)، حیدر بلخی (ملازم جی۔ال۔اے کالج) اور مصطفی بلخی (اردو ٹیچر جواہر نوودے اسکول لکھنو) اور ایک بیٹی آمنہ خاتون ہے۔ پروفیسر نادم بلخی کے احوال وآثار کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ذکر نادم بلخی ترتیب وپیشکش: ڈاکٹر سید حسن عباس۔

ناشر: مرکز تحقیقات اردو وفارسی گوپال پور، سیوان، ۲۰۰۵ء

وفات: ۱۴رمارچ ۱۹۶۲ء

تدفین: پٹنہ (محلہ دوندی بازار) کے قبرستان میں ہوئی۔ مزار کے کتبے کا قطعہ تاریخ وفات جناب سید محمد یوسف وکیل نے لکھا، جو اُن کی قبر پر سنگِ مرمر پر کندہ ہے، قطعہ یہ ہے:

از بس کہ جہاں است لبے زشت و قبیح
جاں داد و بگریختہ ز یا ل مرد صبیح
ایں کتبہ بخواں کہ سال مرگ است ہمیں
'آسودہ بایں تربت صاف است فصیح' ۱۹۶۲ء

(ب) آثار: مطبوعہ

تاریخ : ۱۔ **تاریخ مگدھ** (اردو) سنہ تصنیف ۱۹۴۳ء/ ۱۳۶۲ھ، صوبہ بہار کی مکمل تاریخ۔ ۲۰ ابواب پر مشتمل انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۴ء، ۴۶۹ صفحات، بار اول، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، بار دوم

۲۔ **وہابی موومنٹ** (انگریزی) کلاسیکل پبلشنگ ہاوس دہلی، سنہ اشاعت ندارد

کتبہ شناسی : ۳۔ **پٹنہ کے کتبے** (بہ شمول داناپور و منیر) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۳ء، ۱۱۲ صفحات

تذکرہ : ۴۔ **تذکرہ نسوان ہند**، سنہ تصنیف ۱۹۵۶ء، غیر منقسم ہندوستان کی تقریباً ۵۰۰ ایسی خواتین کا تذکرہ جنھوں نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ۵ حصوں پر مشتمل۔ شمسی پریس پٹنہ، جولائی ۱۹۵۶ء۔

۵۔ **تذکرہ ہندو شعرا ے بہار**، صوبہ بہار کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین ۱۲۵ فارسی اور ریختہ گو ہندو شعرا کا تذکرہ مع انتخاب کلام ناشر: نیشنل بک سنٹر ڈالٹن گنج (پلاموں)، ۱۹۶۲ء، ۱۶۸ صفحات

ادبیات/تنقید ۶۔ **انشادِ شاد** (کتابچہ) شاد عظیم آبادی کے کلام پر اصولی تنقید و تبصرہ۔ اس میں شاد کے منتخب اشعار کو زبان و فن کے معیار پر جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ دی قومی پریس لیمیٹڈ بانکی پور پٹنہ، ۲۴ صفحات، سنہ اشاعت ندارد (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان شائع ہوا ہوگا)

۷۔ **گولڈن جدید فارسی ٹرانسلیشن و کمپوزیشن**، سکنڈری اسکول طلبہ کے لیے ناشر : اقبال پبلشنگ ہاوس، خزانچی روڈ پٹنہ مطبع : ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ، تاریخ و سال اشاعت ندارد، ۱۳۴ صفحات

فہرست مضامین: ترجمہ ۱-۹۶ مضامین ۹۷-۱۱۶

نامہ ہا (خطوط) ۱۱۷-۱۲۵۔ درخواست ۱۲۶-۱۲۹۔ فرہنگ ۱۳۰-۱۳۴

(ج) غیر مطبوعہ ۱۔ آثار بلخیہ : یہ کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۴۹ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ مخطوطہ نہایت خستہ حال ہے۔ کتاب میں خاندان بلخیہ کے بزرگوں کا تذکرہ مختلف مآخذ کی مدد سے جمع کیا گیا ہے۔

۲۔ دستور سخن : کتاب کا موضوع قواعد و زبان کی باریکیاں ہے۔

۳۔ علم نجوم: مخطوطہ کا سائز ۵×۱۰ انچ ہے۔ تاریخ کتابت ۲ / ربیع الثانی بروز چہار شنبہ ۱۹۱۰ عیسوی ہے۔ کاتب کا نام سید مرتضی حسن، صفحات ۱۰۹۔ کتاب کا موضوع علم نجوم ہے جس میں اس علم کے مبادیات بیان کئے گئے ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اس اعتبار سے کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ کتاب چند ابواب اور ہر باب چند فصلوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ مقالاتِ فصیح : بلخی صاحب کے اردو مضامین کا مجموعہ ہے جسے ترتیب دے کر بہار اردو اکاڈمی پٹنہ کے حوالے کیا گیا تھا۔ راقم سطور نے کتابت شدہ مسودہ دیکھا تھا مگر ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ عنقریب یہ کتاب مرکز تحقیقات سے منظر عام پر آئے گی۔

'مقالات فصیح' کے علاوہ بقیہ مسودات پروفیسر نادم بلخی صاحب کے پاس محفوظ تھے۔ جواب پروفیسر مظفر بلخی کی تحویل میں ہوں گے۔

(د) بلخی صاحب کے نام انتساب: پروفیسر شکیل الرحمن نے 'ہندوستان اور پاکستان میں زبان کا مسئلہ' (برائے بحث) نامی کتابچے کا انتساب فصیح الدین بلخی صاحب کے نام اس طرح کیا ہے:

"محترم جناب فصیح الدین بلخی صاحب کے نام جن کی شفقت اور ہمدردی کے لازوال سرمایہ کا میں ہمیشہ رہین منت رہوں گا۔"

۱۶ صفحے کا یہ کتابچہ مکتبۂ ترقی ادب، گذری پٹنہ سٹی نے لیبل لیتھو پریس پٹنہ سے ایک ہزار کی تعداد میں ۱۹۵۲ء میں شائع کیا تھا۔

☆☆☆

والد محترم

والد محترم حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم و مغفور نے اپنی غیر مطبوعہ تصانیف میں کئی کتابیں چھوڑی تھیں، ان میں ایک ''ہندو شعرائے بہار'' بحالت اوراق پریشان تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کی اشاعت پر خصوصی دھیان دیا گیا، اور یہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوگئی۔ دوسری غیر مطبوعہ کتاب ''تحریک وہابیہ'' (WAHABI MOVEMENT) تھی خدا کا شکر ہے کہ یہ بھی کلاسیکل پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی سے چھپ گئی۔

پیش نظر کتاب سے متعلق چند باتیں پہلے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ایک بڑے محقق، ناقد اور مورخ کا بلا شبہ گراں مایہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ تحقیق و تنقید سے متعلق طرح طرح کے نظریات عام ہو چکے ہیں۔ مارکسی، نفسیاتی، تاثراتی، کلاسیکی، وجودی، متنی وغیرہ کے علاوہ مخفی تنقید و تحقیق (OCCULT CRITICISM & RESEARCH) کا بھی ایک نیا اپروچ منظر عام پر آیا ہے، حالانکہ یہ کوئی نیا اپروچ نہیں ہے اس لیے کہ علوم کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک جو پردہ خفا میں نہیں ہے اور دوسرا جو مخفی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مخفی علوم (OCCULT KNOWLEDGES) ہی کو منظر عام پر لانے کا دوسرا نام دراصل تحقیق ہے اور مخفی علوم کو منظر عام پر لانے کے کئی طریقہ ہائے کار ہوتے ہیں جن میں دو نہایت ہی اہم ہیں یعنی مطالعہ اور فیلڈ ورک (FIELD WORK)۔ والد مرحوم کی یہ کتاب ایسی ہے جس کا بیشتر دار و مدار فیلڈ ورک پر ہے۔ جس کی تکمیل میں ان کی عمر کا ایک لمبا عرصہ گذرا۔ اس طریقۂ کار پر عمل پیرا ہونے والے محقق کو حد درجہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں۔ بات ایک عرصۂ دراز کی ہے۔ اس وقت میری عمر دس سال یا اس سے کچھ زیادہ کی ہوگی۔ وہ ان دنوں ریاست سرائے کیلا میں مجسٹریٹ تھے۔ پوجا کی تعطیل میں وہ اپنے وطن پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے صوبۂ بہار کی

ایک مشہور درگاہ اور دیگر تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میری ضد پر وہ تیار ہو گئے۔ وہ سب سے پہلے اس مشہور درگاہ میں گئے، ان کے ساتھ ایک دوربین، ایک آہنی برش، کاغذ کی کئی بڑی بڑی شیٹیں اور کاجل سے بھرا ہوا ڈبہ تھا۔ درگاہ میں داخل ہو کر جب انھوں نے کتبات کا چربہ حاصل کرنا چاہا تو مجاوروں نے ہنگامہ برپا کر دیا اور یہ کہا کہ ان پتھروں پر کندہ حروف جناتی ہیں ان کو چھونے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی جان بھی خطرے میں ہوگی اور ہم لوگوں کے لیے بھی مصیبتیں درپیش ہوں گی۔ لہٰذا ہم لوگ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ مرحوم کے سمجھانے بجھانے کے باوجود جب وہ لوگ تیار نہیں ہوئے تو وہ خانقاہ تشریف لے گئے اور سجادہ نشین کی آمادگی پر ہی وہ ان کتبات کے چربے حاصل کر سکے۔ اس طرح کی بہت ساری دشواریوں کا فیلڈ ورک کے دوران ان کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اس کتاب کے اندر جتنے کتبات (۱) کی نقلیں درج ہیں، اگر ان مقامات میں انھیں تلاش کرنا چاہیں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ حادثات زمانہ کے ہاتھوں ان میں سے بہت سارے کتبوں کا اب وجود نہیں، جن کو اپنی تحقیق و جستجو کے نتیجہ میں مرحوم نے محفوظ کر لیا اور یہ نتیجہ ان کی اس گہری دلچسپی کا تھا جو مخفی علوم کو بروئے کار لانے کا ایک اہم ذریعہ ہوتا ہے جسے ہم فیلڈ ورک کہتے ہیں۔ وہ اس میدان کے صرف مرد مجاہد ہی نہیں بلکہ غازی بھی تھے۔ خانقاہوں، مٹھوں، درگاہوں، مقبروں، مندروں، مسجدوں، جنگلوں، کھنڈروں، ویرانوں، نگروں اور گاؤں گاؤں کی سیر میں اپنا وقت گذار کر ماضی کی گم شدہ کڑیوں کی چھان بین اور صوبہ بہار کے اندر مخفیات (OCOCULTISM) کی داغ بیل رکھنے والے وہ ایک اہم محقق تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج ان کے انتقال کے لگ بھگ تیس سال بعد ان کی محنت کا یہ پھل مطبوعہ کتاب کی شکل میں ایک ثمر دار شجر بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے۔

مخفیات کا جہاں تک تعلق ہے، علم نجوم بھی ایک ایسا علم ہے جس کا رشتہ مخفی علوم سے ہے۔ والد مرحوم اس علم کے بھی ایک اچھے عالم تھے۔ چنانچہ علم نجوم سے متعلق جو ان کی کتاب بہ عنوان ''علم نجوم'' بصورت مخطوطہ اس وقت میرے پاس محفوظ ہے، اس کی اشاعت بھی اشد

ضروری ہے۔ اللہ کو اگر منظور ہوا تو انشا اللہ تعالیٰ میری زندگی میں یہ کتاب چھپ جائے گی ورنہ میرے بعد ان کے نبیرہ ڈاکٹر مظفر بلخی سلمہٗ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کارخیر کو انجام دیں۔

اب تک مرحوم کے جتنے مطبوعہ مضامین و مقالات اور کتابیں ہیں، ان کی روشنی میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ صوبہ بہار کے ایک اہم رجحان ساز محقق تھے جو اس خاکدان ہست و بود میں نہ رہنے کے باوجود اس لیے موجود ہیں کہ ان کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ دنیا کے علم و ادب کے لیے گنج ہائے گراں مایہ ہے۔

'کتبات عظیم آباد' (۲) اس کتاب کا عنوان ہے۔ عظیم آباد ذرا وسیع تر معنوں میں لیا گیا ہے جس میں منیر اور دانا پور بھی شامل ہیں۔

☆☆☆

ا۔ ۲۔ مراد 'پٹنہ کے کتبے' شائع کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ہے۔

کچھ دیر سادات بلخ کے ساتھ

حضرات بلخ میں جن کا نام میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے گھر کے بزرگوں سے سنا وہ حضرت ابراہیم ادہم بلخی کا تھا۔ بعد کو اسکول کی ایک انگریزی نصابی کتاب میں ان پر ایک نظم پڑھی۔ کچھ اور بڑا ہوا تو حضرت شقیق بن ابراہیم بلخی سے واقف ہوا جو اپنے وقت میں زہد اور علم ومعرفت میں بے نظیر تھے۔ یہ دونوں بزرگ دوسری صدی ہجری کے ہیں اور خراسان میں اپنے عہد کے بڑے اہم اور جلیل القدر بزرگوں میں گزرے ہیں، جنھوں نے سلطنت بادشاہی اور دنیاوی جاہ وجلال پر زہد وریاضت کو اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دی۔

مشہور روایت ہے کہ ابراہیم ادہم بلخ کے شہزادے تھے۔ ایک روز شکار کو نکلے۔ ایک خرگوش کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ غیب سے ندا آئی کہ کیا تجھ کو اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ابراہیم گھوڑے سے اترے۔ وہیں ایک چرواہا ملا۔ اسے اپنا گھوڑا سارے ساز وسامان کے ساتھ دے دیا اور اپنے کپڑے اتار کر اسے بخش دیئے اور اس کے کپڑے پہن کر چل دیئے۔

قاضی بلخ کو خط میں لکھا کہ تیس سال سے روزانہ ارادہ کرتا ہوں کہ تجھے خط لکھوں۔ لیکن لکھ نہ سکا۔ میں اس قدر مشغول ہوں کہ کسی مخلوق کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ خدا تجھے ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔ بعض سیرت نگاروں نے ان کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، کچھ یہ ہیں:

☆ بیچارگان ومسکینان، این توانگران در دنیا راحت می طلبند خطا می کنند ونیابند۔

(یہ توانگر کیسے بے چارے اور مسکین ہیں کہ دنیا میں آسایش کے طلبگار ہیں، غلطی کرتے ہیں، نہیں پاتے۔)

☆ هرگاه که به طعام خوردن محتاج می گردم، صبری کنم تا مضطری گردم آن گاه از آن طعام می خورم مانند آن کس که به میت مضطر شود۔

(جب کھانے کی حاجت ہوتی ہے، صبر کرتا ہوں، یہاں تک کہ بیقرار ہوجاتا ہوں، وایسی حالت میں کچھ کھاپی لیتا ہوں بالکل اس شخص کی طرح جو مردار کھانے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے)

☆ روزی ابراہیم را گفتند که گوشت گراں شد، گفت ارزاں سازیدش، حاضران گفتندش: به چه ارزاں کنیم،، گفت: به نا خریدن۔

(ایک روز لوگوں نے ابراہیم سے کہا گوشت بہت گراں ہوگیا ہے۔ فرمایا ارزاں کردو۔ حاضرین نے پوچھا کس طرح ارزاں کردیں؟ فرمایا: نہ خرید کر)

جامیؔ نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ اک بار حضرت ابراہیم ادہم نے حضرت شقیق بلخی سے پوچھا کہ رزق کے متعلق تمہارا کیا معمول ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا معمول یہ ہے کہ اگر کچھ میسر آجائے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں، نہ آئے تو صبر سے کام لیتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم ادہم نے فرمایا کہ خراسان کا ہر کتا یہی کرتا ہے۔ انھوں نے پوچھا آپ کا معمول کیا ہے؟ فرمایا۔ اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اگر کچھ مل جاتا ہے تو ایثار سے کام لیتا ہوں۔

روایت ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم نے ایک خادم خریدا۔ اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے کہا خادم کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ آپ جو چاہیں رکھ دیں۔ انھوں نے دریافت کیا تیرا کیا نام رکھوں۔ اس نے جواب دیا جو آپ کی مرضی ہو۔ فرمایا: تجھے کیسا لباس پہناؤں۔ خادم نے کہا جیسی حضور کی مرضی قرار پائے۔ پوچھا تجھے کیا کھانا کھلاؤں۔ خادم نے جواب دیا جو حضور چاہیں کھلائیں۔ حضرت نے کہا پھر تیری اپنی کوئی مرضی، کوئی خواہش نہیں۔ بولا خادم کی کوئی مرضی نہیں ہوا کرتی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رونے لگے فرمایا اگر بندگی یہ ہے جو تو کہہ رہا ہے تو ہم بندگی کرنے کے لائق نہیں۔

جب فارسی ادب سے دلچسپی شروع ہوئی تو سامانی عہد کے دو شاعروں شہید بلخی اور ابوشکور بلخی سے شعر العجم کے ذریعے تعارف ہوا۔ پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔

مطالعہ کے دوران ان متعدد علما و ادبا، شعرا، مصنفین کے حالات اور ان کی تصانیف سے سرسری واقفیت ہوئی جن کا تعلق سرزمین بلخ سے تھا۔ تاریخ بغداد، تاریخ دمشق اور تاریخ مصر وغیرہ کی طرح کوئی کتاب بلخ کی تاریخ پر نہیں ملتی۔ ممکن ہے اس کی وجہ وہ ہو جس کی طرف معاصر دانشمند ڈاکٹر نذیر احمد نے اشارہ کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> جہاں اسلامی دور میں ایران کے اہم تہذیبی مرکزوں سمرقند، بخارا، نیشاپور، ہرات، غزنہ، اصفہان، شیراز کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں وہاں بلخ و ارباب بلخ پر بھی پوری توجہ مبذول کی گئی اور ان تصانیف میں بلخ کے اہل قلم و دانش، محدث و فقیہ، شاعر و ادیب، عارف و صوفی، مورخ و محقق، سبھوں کا تذکرہ شامل کیا گیا۔ لیکن ان میں سے اکثر کتابیں وحشی منگولوں کی بربریت کی نذر ہوئیں جو بچیں ان میں سے اکثر کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہوئیں۔

اس موضوع پر صفی الدین واعظ بلخی مولف فضائل بلخ نے فنا شدہ کتابوں میں حسب ذیل کا ذکر کیا ہے:

سلوۃ العارفین مؤلف محمد بن عبدالملک بن خلف طبری سلمی متوفی ۴۷۰ھ جو ۴۵۹ھ میں تالیف ہوئی۔ کتاب السلوۃ مولفہ علی بن یوسف صوفی (متوفی ۴۶۳ھ)، نہزۃ الخاطر و نزھۃ الناظر تالیف ابن القفطی (متوفی ۶۴۶ھ)، کتاب النوادر تالیف ابو اللیث سمرقندی (متوفی ۳۷۶ھ)، کتاب العافیہ تالیف علی بن حسن مستملی، امالی محمد بن کعب قرضی (متوفی ۱۱۹ یا ۱۲۰ھ)، امالی شیخ الاسلام محمد بن احمد بلخی (متوفی ۵۸۴ھ)، امالی قاضی القضاۃ ابوبکر اسکافی (متوفی ۴۷۵ھ)، الدلائل تالیف ابوالعباس مستغفری (متوفی ۴۳۲ھ)، مناقب بلخ تالیف ابوزید احمد بن سہل بلخی (متوفی ۳۲۲ھ)، تاریخ بلخ تالیف محمد بن از ہر بلخی (متوفی ۳۱۶ھ) طبقات علی بن طاہر، کتاب البھجہ، تالیف شیخ الاسلام یونس بن طاھر النصری البلخی (متوفی ۴۱۱ھ)، طبعقات از عبداللہ جویباری (دوسری صدی ہجری)، کتاب الکبیر "کتاب علمائے بلخ" طبقات اھل بلخ از ابواسحاق ابراھیم بن احمد المستملی

(معاصر امام بخاری)، تاریخ بلخ تالیف سید ناصر الدین سمرقندی (متوفی ۵۵۶ھ)۔

بلخ کی تاریخ پر جو کتابیں فنا ہونے سے بچ گئیں اور جن سے مولف نے دوران تصنیف استفادہ کیا وہ یہ ہیں۔

الحد ائق لاھل الحقائق مولفہ ابن الجوزی (م ۵۹۷ ھ)، کتاب ضحاک (ضحاک بن مزاحم بلخی متوفی حدود ۱۰۰ھ؟) جمل الغرائب تالیف قاضی شہاب الدین محمود نیشاپوری (م چھٹی صدی ہجری)۔ ان کتابوں کے علاوہ۔ رسالۂ قشیریہ امام عبد الکریم بن ہوازن القشیری (م ۴۶۵ھ) تذکرۃ الاولیاء خواجہ فرید الدین عطار (م ۶۲۷ھ) حلیۃ الاولیاء حافظ ابو نعیم ابن عبد اللہ الاصفہانی (م ۴۳۰ھ) اور متعدد کتب علوم عقلیہ ونقلیہ دور ان تالیف مؤلف فضائل بلخ کے پیش نظر رہی تھیں۔

یہاں بلخ اور اصحاب بلخ پر اس اہم کتاب کا ذکر ضروری ہے۔ شیخ الاسلام صفی الدین ابوبکر عبد اللہ بن عمر بن داؤد واعظ بلخی اپنے عہد کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے ۶۱۰ھ میں عربی میں فضائل بلخ لکھی۔ لیکن یہ کتاب اب مفقود ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ جسے عبد اللہ محمد بن محمد بن حسین حسینی بلخی نے بلخ کے حکمراں ابوبکر عبد اللہ کی ایما پر ۶۷۶ھ میں کیا تھا، حسن اتفاق سے مخطوطے کی شکل میں لینن گراڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں محفوظ رہ گئے۔ فاضل معاصر آقائی عبد الحئ حبیبی استاد کابل یونیورسٹی نے اس کا نہایت قابل قدر، عمدہ علمی وتنقیدی اڈیشن تیار کیا اور اپنے مفصل قیمتی حواشی اور محققانہ تعلیقات کے ساتھ ۱۳۴۰ھ شمسی میں تہران سے شائع کرایا۔ اردو دنیا ممنون کرم ہے فارسی واردو کے مشہور محقق ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی جنھوں نے فضائل بلخ، کی تلخیص اور اس کا اردو ترجمہ تیار کیا اور ضروری حواشی وتعلیقات کے ساتھ اسے دہلی سے ۱۹۸۹ء میں تذکرۂ علمائے بلخ، کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اردو ترجمہ نہ ہوتا تو اردو قائین کو اصل کتاب فضائل بلخ اور اس کے مولف کے کارناموں کا علم بھی نہ ہوتا۔ ہوتا بھی تو دیر میں ہوتا اور صرف فارسی دانوں ہی کو ہوتا۔ ان کا مقدمہ قیمتی فوائد پر مشتمل ہے اور راقم اس سے مستفید ہوا ہے۔ اس اردو ترجمے کا دوسرا ایڈیشن ترمیم واضافے اور تصحیحات کے بعد جناب مشفق خواجہ صاحب کے زیر اہتمام کراچی سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

'فضائل بلخ' ایک مقدمہ اور تین فصلوں پر مشتمل ہے:
فصل اول: فضائل بلخ، فصل دوم شمائل اور فصل سوم: علمائے بلخ کا تذکرہ ہے۔ اس میں بلخ کے ان ستر علما و فضلا و فقہا کے حالات درج ہیں جو بلخ میں مدفون ہیں۔ اسی طرح کی کتاب شدالازار مولفہ جنید شیرازی م ۶۸۸ھ ہے جس میں شیراز کے ایک ہزار ان مشاہیر کا ذکر ہے جو شیراز میں مدفون ہیں۔ فاضل مترجم کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری تخصیص کی وجہ سے بعض اہم فضلائے بلخ (ابوزید بلخی، مولف مناقب بلخ اور ابوالمعاشر بلخ) کا اس تذکرے میں شمول نہ ہوسکا کہ ان کی وفات بلخ میں نہیں کہیں اور ہوئی ہوگی۔
کتاب کی فصل دوم کا خاتمہ یحییٰ بن معاذ رازی (م ۲۵۸ھ) کے اس قطعے پر ہوتا ہے:

رحلنا غدوة من اهل بلخ   علی بلخ ومن فیها السلام
أقمناما أقمنا فی السرور   وریف انهم قوم کرام
اذا رمت المقام بارض قوم   ففی بلخ یطیب لک المقام

(صبح ہم بلخ والوں سے دور چلے گئے، بلخ اور بلخ کے رہنے والوں پر سلام ہو۔ جب تک ہم اس جگہ ٹھہرے مسرت دشادمانی سے ہم کنار رہے۔ اس لئے کہ یہاں کے رہنے والے بہت اچھے اور پاکیزہ لوگ ہیں۔ اگر تمہارا کسی جگہ قیام کا ارادہ ہو تو بلخ کا انتخاب کرو کہ وہاں تمہارا قیام بہت خوشگوار ہوگا۔)

مقام عبرت ہے کہ جس شہر بلخ میں ساتویں صدی ہجری میں ۱۸۴۷ مساجد، ۴۰۰ کالج، ۹۰۰ مدارس تھے، جہاں ۱۲۰۰ عالم ومفتی اور ۵۲۰ ادیب وشاعر تھے، جس شہر میں ۵۰۰ حمام ۴۰۰ گنبد یخواں، ۳۰۰ عوامی حوض اور ۱۲۰۰ سردابے تھے، وہاں اب ویرانی اور وحشت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر نذیر احمد، حکیم سنائی غزنوی کے سمینار منعقدہ کابل میں شرکت کے بعد جب بلخ کی زیارت کے لئے پہنچے تو یہ دیکھ کر بہت افسردہ ہوئے کہ بلخ کی وہ ساری شان وشوکت اب قصۂ پارینہ ہوگئی ہے۔ شہر بالکل اجڑ چکا ہے۔ یہ ہرا بھرا شہر جو کسی زمانے میں بے حد آباد اور شاداب تھا اب چھوٹا سا گانورہ گیا ہے۔ پرانی یادگاروں میں صرف تین چیزیں شکستہ حالت میں باقی رہ گئی ہیں: مزار عکاشہ جو چوتھی یا پانچویں

صدی کی یادگار ہے، اس کی مسجد باقی ہے نہ اس کا گنبد محفوظ ہے۔ یہی حال تباہ گنبد خواجہ پارسا کا ہے جو ۸۶۷ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ بلخ کا وہ قلعہ بھی جو شہر کے مشرق میں واقع ہے، کھنڈر کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ بلخ کی ویرانی و تباہی کا ان کے دل پر دیر تک اثر باقی رہا اور 'فضائل بلخ' کی تلخیص و ترجمے کا داعی وہی ان کا گہرا قلبی تاثر تھا جس نے ان سے یہ کام کرایا اور اس طرح تاریخ اسلام کے کچھ عبرت ناک صفحات انہیں پیش کرنے کا موقع ملا۔

بلخ سے علما و ادبا، شعرا و مصنفین اور صوفیہ کرام کے قافلے کس زمانے میں اور کن اسلامی ممالک میں کوچ کرنے شروع ہوئے، موجودہ تاریخی مصادر سے ان کی واضح تصویر نہیں ابھرتی۔ قیاس چاہتا ہے کہ بلخ کے لوگ حملۂ تاتار سے پہلے بھی اور بعد کو بھی آس پاس کے مقامات کے سفر ضرور کرتے رہے ہوں گے اور کچھ لوگ وہاں اقامت پذیر بھی ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اس کی شہادت نہیں ملتی۔ ہاں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ روزگار اور مناسب حالات کی تلاش میں کئی صدیوں سے سپاہی پیشہ لوگوں کے ساتھ علمی اور دینی دلچسپی رکھنے والے اصحاب ہندوستان وارد ہوتے رہے اور علمی و ثقافتی مرکزوں لاہور اور دہلی میں رحل اقامت ڈالتے رہے۔

بلخ سے ہندوستان آنے والوں میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے سبقت کی۔ سادات بلخ میں جو اصحاب بلخ کی سکونت ترک کر کے دہلی پہنچے ان میں امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) کے والد بزرگوار امیر سیف الدین محمود اور ایک بزرگ عالم جو علوم شریعت و طریقت دونوں سے واقف تھے، مولانا شمس الدین بلخی کا نام تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ تاتاریوں کے حملے اور بلخ کی تباہی کے بعد امیر سیف الدین پٹیالی ضلع ایٹہ آ کر آباد ہوئے اور مولانا شمس الدین بلخی (جو حضرت ابراہیم ادہم بلخی کی ساتویں پشت میں تھے) محمد بن تغلق کے عہد (۷۲۵-۷۵۲ھ) میں کچھ دن دربار دہلی سے منسلک رہے پھر صوبۂ بہار چلے گئے اور امیر۔ بہار شریف کی خانقاہ میں مقیم ہوئے اور حضرت شیخ احمد چرم پوش کے حلقہ بگوش اور انہی کے مرید و خلیفہ ہوئے۔

لاہور یا متحدہ ہندوستان کے کسی اور خطے میں بلخی حضرات کی بود و باش کی اطلاع نہیں ملتی۔ صرف صوبۂ بہار میں اور وہاں کے بھی چند مقامات (قصبۂ بہار شریف، فتوحہ، منیر شریف،

سملی اور عظیم آباد اور ان کے اطراف) میں اس خانوادے کے افراد ملتے ہیں اور یہ وہی ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت شمس الدین بلخی سے ملتا ہے اور جوان تینوں صاحبزادگان مولانا مظفر بلخی (م ۷۸۸ھ)، حضرت معز الدین بلخی اور حضرت قمر الدین بلخی سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت مظفر بلخی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ انہیں مخدوم الملک حضرت سید شاہ شرف الدین احمد (م ۷۸۲ھ) سے شرف بیعت و خلافت حاصل تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے آپ کا سلسلۂ نسب آپ کے بھتیجے حضرت حسین نوشہ توحید (م ۸۴۴ھ) سے چلا جو مولانا مظفر بلخی کے مرشد اور خلیفہ تھے۔ اس مضمون میں جن بلخی حضرات کا ذکر ہے ان سبھوں کا نسبی تعلق حضرت حسین نوشہ توحید بلخی سے ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں بہار میں بلخیوں کے جس خانوادے نے ادبی شہرت حاصل کی اس کے سربراہ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی تھے۔ میں ان سے یا ان کے کارناموں سے واقف نہیں۔ سید یوسف الدین احمد بلخی جو باطن تخلص کرتے تھے اور جن کی خدمت میں میں برسوں حاضر ہوتا رہا وہ ڈاکٹر صاحب کا اور ان کے صاحبزادگان ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ عربی و فارسی سے اچھی طرح واقف تھے اور اردو میں ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بہ حیثیت شاعر کے غیاث الدین صاحب کا کبھی ذکر نہیں آیا۔ ان کا سال وفات ۱۹۰۰ء ہے۔

ان کے چاروں بیٹے حفیظ الدین بلخی، عزیز الدین بلخی، نظام الدین بلخی اور فصیح الدین بلخی ادیب و شاعر تھے اور بہار میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔

سید حفیظ الدین بلخی کا تذکرہ پہلی مرتبہ کلیم الدین احمد کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' نظر سے گزرا۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایک گلدستہ ''تحفہ بہار'' شائع کرنا شروع کیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کب تک نکلتا رہا اس کا کوئی شمارہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ شعر انہی کے ہیں:

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں ۔۔۔ یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

پھر عالم خیال ہے جولاں گہ امید ۔۔۔ ناکامیوں سے تنگ دل منتشر نہ ہو

کچھ نہ تھا، سب کچھ ہوا، پھر کچھ نہیں ۔۔۔ رنگ ہے آغاز کا انجام میں

جن کو ہے آداب مجلس کا لحاظ   خاک اڑتی ہے انہی کے بام میں

احمد اللہ قادری اور مظفر بلخی نے اپنی کتابوں میں ان کا حال لکھا ہے اور نمونۂ کلام درج کیا ہے۔ تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں برما میں ۱۹۳۶ء/ ۱۳۵۴ھ میں وفات پائی۔

حضرت مظفر بلخی (متوفی ۷۸۸ھ) کا فارسی دیوان انہی نے مرتب کر کے قاضی عبدالودود بیرسٹر کے والد قاضی عبدالوحید صدیقی مرحوم (۱۲۸۹ھ-۱۳۲۶ھ) کے مطبع حنفیہ واقع محلہ بخشی پٹنہ سٹی سے ۱۹۰ء میں شائع کیا تھا۔ والد صاحب (حضرت مولانا ظفر الدین قادری ۱۸۸۰ء- ۱۹۶۲ء) کے کتب خانے میں مطبع حنفیہ کی چھپی ہوئی متعدد کتابیں تھیں۔ یاد آتا ہے کہ یہ دیوان بھی وہاں میری نظر سے گزرا تھا۔

سید عزیز الدین بلخی، ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کے منجھلے بیٹے تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کا زمانہ پایا۔ لیکن میں نے کبھی نہ ان سے ملاقات کی نہ انہیں کہیں دیکھا۔ قاضی عبدالودود صاحب ان کے ادبی رسالے 'رفتار زمانہ' کا ذکر کرتے تھے۔ جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے کچھ شمارے ان کے پاس تھے۔ میری نظر سے اس کا کوئی شمارہ آج تک نہیں گزرا۔ اگرچہ اس کی تلاش میں برابر رہا۔ بلخی صاحب سے غائبانہ تعارف ان کی مشہور تصنیف، تاریخ شعرائے بہار، کی وجہ سے ہوا جو میرے کتب خانے کی ابتدائی اور بنیادی کتابوں میں ہے اور جس کا معلوم نہیں میں نے کتنی بار مطالعہ کیا۔ یہ کتاب میرے کتب خانے میں ۲۵ رمئی ۱۹۴۰ء کو داخل ہوئی۔ بعض اغلاط واوہام کے باوجود یہ کتاب قدیم شعرائے بہار کے موضوع پر اب بھی بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ شعرائے بہار، کی پہلی جلد میں ۱۱۵۰ھ سے ۱۳۰۰ھ تک کے صوبۂ بہار کے تین سو متقدمین ومتوسطین کے حالات واشعار ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں مکمل ہوئی۔ شعرا کے تذکرے، تاریخی نام ہے۔ یہ ۱۳۰۵ /۱۹۳۱، میں پٹنہ سے شائع ہوئی۔ آخر کتاب میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا فارسی قطعہ تاریخ شائع کیا گیا ہے۔ حصۂ دوم جیسا کہ مولف نے لکھا ہے۔ ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۵۰ھ بہار کے تقریبا چار سو شعرائے متاخرین ومعاصرین کا تذکرہ ہے مع نمونہ کلام وتاریخ ولادت وفہرست تصنیفات وتالیفات۔ ان میں مشاہیر اور کہنہ مشق شعرا کے ساتھ غیر معروف، گوشہ نشین اور نو مشق شعرا کو بھی تا بہ امکان نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ دوسرا حصہ جو زیر طبع تھا، اشاعت سے محروم رہا۔ کچھ یاد آتا ہے کہ اس کا مسودہ مؤلف کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ کے پاس محفوظ تھا۔ اب ان کے اعزہ کے پاس ہوگا۔ مل جائے تو اسے ضرور شائع کر دینا چاہیے۔

سید عزیز الدین بلخی کی دوسری شائع شدہ کتاب 'انسان کی پرواز' ہے۔ یہ ہوائی جہاز کی ایجاد کے متعلق مفصل تاریخی سر گذشت ہے۔ اس میں ایروپلین کے تیار کرنے اور ہوا میں چلانے کے اصول وطریقے اور ہدایات، تصاویر اور نقشہ جات کے ساتھ درج ہیں۔ فصیح الدین بلخی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انہوں نے مذہب اور انسان کے عقائد اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ضخیم کتاب ''دین ودنیا'' تصنیف کی تھی لیکن یہ شائع نہ ہوسکی۔

تذکرہ نویسی اور نثر نگاری کے ساتھ ساتھ وہ شعری ذوق بھی رکھتے تھے۔ راز تخلص کرتے تھے۔ وہ فارسی اور اردو میں شعر تو کہتے ہی تھے لیکن فارسی میں بھی بند نہ تھے بلکہ ابتدا میں تو وہ فارسی میں ہی شعر کہتے رہے۔ ان کا فارسی میں قصیدہ رائیہ، رفتار زمانہ، میں شائع ہوا تھا۔ اردو اشعار کے کچھ نمونے احمد اللہ قادری اور ڈاکٹر مظفر بلخی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ دو شعر انہی کے ہیں۔

جادہ پہ رکھ گیا تھا فقط داغ بیل تو ۔۔۔ اے قیس راہ عشق کی تکمیل ہم نے کی

ملتے ہیں راہ میں غیروں کے محلّے پہلے ۔۔۔ آتے آتے مرے گھر تک وہ اٹک جاتے ہیں

عزیز الدین بلخی کی تاریخ وفات ۱۹ رشوال ۱۳۵۳ھ/ ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء ہے۔

نظام الدین بلخی کو جو داغ کے شاگردوں میں تھے، دیکھنے اور ان سے ان کا کلام سننے کا مجھے بار بار موقع ملا۔ کسی مشاعرے میں ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضامن ہوتی تھی اس لیے منتظمین مشاعرہ انہیں مدعو کرنے اور مشاعرے میں ان کی شرکت کو یقینی بنانے کے لئے سوسو جتن کرتے تھے۔ خیال ہوتا تھا کہ بلخی صاحب شریک نہ ہوئے تو مشاعرہ پھیکا رہے گا۔ کبھی کبھی ان کی علالت کے باوجود غرض مند اصحاب انہیں گھیر گھار کر مشاعرے میں لے آتے تھے۔ اور ان کی علالت ونقاہت کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ پٹنہ کالج کا ایک مشاعرہ یاد آتا ہے۔ مشاعرہ شروع ہونے کا وقت ہو گیا اور حضرت نظام الدین بلخی محفل میں موجود نہ تھے۔

میرے آس پاس کچھ طلبہ بار بار اٹھ اٹھ کر دیکھ رہے تھے کہ وہ آئے یا نہیں۔ مشاعرہ شروع ہوگیا۔ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کچھ مایوس اور بیزار سے بیٹھے ہیں۔ (یہ لوگ شعر سننے کم، داد دینے زیادہ آتے تھے) اسی اثنا میں مدعو کرنے والے کچھ اصحاب کی جلو میں بلخی صاحب ہال میں داخل ہوئے۔ مایوس دلوں کے چہرے پر تازگی آگئی۔ وہ واقعی مضمحل نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ انہیں بٹھا دیا گیا۔ خاموش بیٹھے رہے، معلوم ہوا، لرزے کی کیفت ہے اور بخار بھی ہے۔ منتظمین نے کہا تھا آپ شعر بے شک نہ پڑھیں، صرف مشاعرے میں چل کر بیٹھ جائیں۔ اختتام مشاعرہ کے قریب صدر جلسہ نے اخلاقاً ان سے درخواست کی کہ ہمیں مسرت ہوگی اگر بلخی صاحب غیر طرح ہی میں اپنے دو چار شعر پڑھ دیں۔ میں نے سمجھا اپنی علالت کا ذکر کر کے معذرت کر کے بیٹھ جائیں گے۔ لیکن وہ اپنا نام سنتے ہی تڑپ کر اٹھے، مائک پر تشریف لائے اور مصرع طرح پر ایسی زوردار غزل سنائی کہ مقطع تک پہنچتے پہنچتے ان کا لرزہ اور بخار سب غائب تھا۔ سائنس کالج کی ''بزم سخن'' اور پٹنہ کالج کی ''بزم ادب'' کے سالانہ جلسے اور مشاعرے پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک انہیں دیکھنا اور ان کا کلام سننا یاد آتا ہے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے ایک مشاعرے منعقدہ ۲۶ر ستمبر ۱۹۳۵ء میں انہیں مدعو کرنے جو سینیئر طلبہ گئے تھے وہ ان کے اخلاق کی تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے گیا کے بسکٹ کھلائے، نمکین کشمیری چائے پلائی اور بیاض سے تازہ کلام بھی سنایا۔ مشاعرے کی طرحیں دو تھیں، پہلی طرح کا مصرع تھا:

اک سکون ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

دوسری طرح تھی:

جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں

مشاعرہ بہت کامیاب رہا تھا۔ سات بجے شام کو پروفیسر عبدالمنان بیدل کی صدارت میں شروع ہوا تھا اور پونے پانچ بجے صبح کو ختم ہوا۔ پٹنہ سٹی اور دانا پور تک کے شعرا شریک تھے۔ میں سب سے کم عمر طالب علم تھا مشاعرے کا، اس لئے سب سے پہلے مجھ سے پڑھوایا گیا تھا۔ میں نے دوسری طرح پر غزل لکھی تھی۔ تین شعر یاد آتے ہیں:

نہ مرنے کے وسیلے ہیں نہ جینے کے سہارے ہیں
بڑی مشکل سے یہ دو چار دن ہم نے گزارے ہیں
عجب انداز سے اس شوخ نے گیسو سنوارے ہیں
فلک پر صورت آئینہ حیراں سب ستارے ہیں
ورق بکھرے ہیں شاید مصحف ہستی بسمل کے
وگرنہ ہاتھ میں قاتل کے کیوں قرآں کے پارے ہیں

مدرسے کے ہال میں مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں بلخی صاحب کی شعر خوانی کا والہانہ انداز یاد آتا ہے۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ لیکن ایسی کیفیت میں ڈوب کر پڑھتے تھے شعر پڑھتے وقت مائک کے سامنے ان کا رخ ہوتا تھا لیکن قافیہ و ردیف تک پہنچتے پہنچتے ایک دائرے کی شکل میں گھوم کر پھر مائک کے سامنے آجاتے تھے۔ جب بلخی صاحب کا نام پکارا جاتا تو پورے ہال میں ایک طرح کی گرم لہر دوڑ، جاتی تھی اور حاضرین و سامعین داد دینے کو سنبھل کر بیٹھ جاتے تھے ''داد'' سے زیادہ ''بیداد'' ہوتی تھی۔ سینٹ ہال (جہاں یہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے) کی چھت بلخی صاحب کے کلام کی گونج اور حاضرین کی داد سے ایسا لگتا تھا کہ اڑ جائے گی۔

جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا اور سنا تو ان کی عمر پینتالیس چھیالیس کی ہوگی۔ (ایک ملاقات میں اپنا سال ولادت انھوں نے ۱۸۸۲ء بتایا تھا) چھوٹے قد کے آدمی تھے، جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ قمیض اور چوڑی مہری کا بڑے خالصے کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اس کے اوپر سیاہ شیروانی ہوتی تھی۔ سیاہ رنگ کے فریم کا دبیز چشمہ لگاتے تھے۔ عام طور پر ننگے سر رہتے تھے لیکن کبھی کبھی انہیں ترکی ٹوپی میں دیکھنا بھی یاد آتا ہے۔ پان کے بڑے شائق تھے،۔ غزل پڑھتے وقت بھی منہ میں پان بھرا رہتا تھا۔ اس حال میں صحیح سالم شعر کس طرح سناتے رہتے تھے، اس پر کبھی کبھی تعجب بھی ہوتا تھا۔

بہت اچھی زبان لکھتے تھے اور غزل کے شعر خوب نکالتے تھے، آخر داغ کے شاگرد تھے:

جناب داغ کا یہ فیض کم نہیں بلخیؔ
سخن زباں کے لئے ہے زباں سخن کے لئے

تغزل اب کہاں فیض جناب داغؔ ہے بلخیؔ
تمہارا شعر جو ہوتا ہے استادانہ ہوتا ہے

وہ بلخیؔ اور کبھی کبھی نظامؔ تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں نام اور تخلص دونوں آگئے ہیں:

نظام الدین بلخی کہہ رہا ہے حال دل اپنا

افسوس کہ ایسے قادرالکلام شاعر کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا۔ کم از کم مجھے اطلاع نہیں۔ ان کی کچھ غزلیں سید احمد اللہ ندوی نے تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں اور ڈاکٹر مظفر بلخی نے فصیح الدین بلخی: حیات بلخی اور کارنامے، میں محفوظ کردی ہیں۔ بزم ادب یا بزم سخن (پٹنہ) کی ایک روداد میں ان کے کچھ اشعار چھپے تھے۔ یہ روداد میرے کتب خانے میں پٹنہ میں محفوظ تھی، اب نہیں ملتی:

پچاس سال پہلے مجھے ان کے یہ شعر پسند آئے تھے اور میں نے اپنی بیاض میں لکھ لئے تھے۔ یہ اب بھی پسند ہیں:

پہن لیا تھا کسی وقت جامۂ ہستی
اجل کھڑی ہے اسی جامۂ کہن کے لئے

نمود صبح پہ کیا حال شمع کا ہوگا
تمام رات جو روئے گی انجمن کے لئے

اجل پلٹ گئی منھ پھیر کے جو یہ دیکھا
کہ ایک تار بھی باقی نہیں کفن کے لئے

مکاں کی قید نہیں لامکاں کی شرط نہیں
وہی بہشت ہے اپنی جہاں پہ تو نکلے

کبھی کسی کو تمہارا سراغ کچھ نہ ملا
تمہارے چاہنے والے جو چار سو نکلے

چلا ہے شوق شہادت میں آج پھر بلخیؔ
الٰہی کوچۂ قاتل سے سرخرو نکلے

اور یہ غزل تو پوری مرصع ہے جو ایک مشاعرے میں ان سے سنی تھی:

سراپا عشق ہے بلخی سراپا دل نہ بن جائے
بھرا گھر لوٹ میں اجڑی ہوئی منزل نہ بن جائے

میں ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ آ گیا۔ پھر نہ ان سے مل سکا اور نہ کسی مشاعرے میں ان سے غزل سن سکا۔ ان کی وفات ۸۴ رسال کی عمر میں ۱۹۶۶ء میں پٹنہ میں ہوئی۔

سید فصیح الدین بلخی (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۶۲ء) مولوی حفیظ الدین بلخی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ لیکن علم وفضل میں سب بھائیوں سے بڑے تھے۔ وہ ایک نامور مورخ، ممتاز محقق، دیدہ ور نقاد اور ایک محتاط اور مستند مصنف تھے، جنھوں نے مختلف اور متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور جن کی تحریرات ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔

ڈاکٹر مظفر بلخی نے ان کی حیات اور کارناموں پر ایک مبسوط اور قابل قدر مقالۂ علمیہ لکھا ہے جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے اور جو کتابی شکل میں پٹنہ سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

میں نے ان کی بعض کتابیں اور کچھ مضامین ندیم، معاصر اور تہذیب میں پڑھے تھے۔ غائبانہ تعارف سید یوسف الدین بلخی صاحب نے کرایا تھا، لیکن ان سے ملنے کا موقع ۱۹۵۶ء سے پہلے نہیں مل سکا۔

میں کوئی ڈھائی تین سال یورپ میں قیام کے بعد اپریل ۱۹۵۶ء کو ہندوستان پہنچا۔ ہفتہ عشرہ علی گڑھ میں ٹھہرتا ہوا پٹنہ پہنچا تو چند دنوں کے بعد، یورپ سے مراجعت اور آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ پانے کی خوشی میں قاضی عبدالودود صاحب نے ایک شام مجھ سے ملنے کے لئے اپنے دوستوں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور کچھ اور اصحاب علم ودانش کو مدعو کیا۔ اس شام کچھ ایسے اصحاب بھی تشریف لائے جنھیں میں نے پہلے قاضی صاحب کے یہاں نہیں دیکھا تھا (جیسے پروفیسر حافظ شمس الدین اور پروفیسر عبدالمنان بیدل) اس شام عبدالباری ساقی اور فصیح الدین بلخی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ عبدالباری ساقی صاحب سے ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب نے ملایا اور بلخی صاحب سے میرا تعارف پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نے کرایا۔ انھوں نے فرمایا میں ان

سے واقف ہوں۔ وہ چائے کے بعد بہت شفقت سے ملے اور دیر تک یورپ کے کتب خانوں اور وہاں کے نوادر کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ طے یہ ہوا کہ کسی دن میں یونیورسٹی لائبریری آؤں اور ان سے اس موضوع پر تفصیل سے باتیں کروں۔ مجھے وہاں کا وہ ذخیرۂ کتب بھی دیکھنا تھا جو بلخی صاحب نے بڑے شوق اور محنت سے جمع کیا تھا۔ چنانچہ ان سے ملنے کی تاریخ اور وقت مقرر ہو گیا۔

میں وقت مقررہ پر پہنچا تو وہ منتظر ہی نہ تھے بلکہ از راہ لطف انھوں نے وہ مخطوطات علاحدہ رکھ دئے تھے جو انہیں مجھ کو دکھانے تھے۔ پہلے انھوں نے جیسا کہ مجھے توقع تھی یورپ کے نوادر کا حال سننا چاہا۔ میں ان کے لئے کچھ نوٹس بنا کر لے گیا تھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ اوکسفورڈ میں ان کی دلچسپی کی کتابیں یہ ہیں، تذکرۂ شورش، تذکرہ عشقی، تذکرۂ مسرت افزا، دیوان فغاں، (مکتوبۂ سید برکات علی عظیم آبادی، ۱۲۴۰ھ) دیوان میر غلام حیدر رونق عظیم آبادی، کلیات صدرالدین فائز، دیوان شاہ قدرت اللہ دہلوی، تذکرۂ ہندی مصحفی، کلیات سودا۔ میں نے ان سے کہا خواجہ امین الدین امینؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۱۹۹ء) کے اردو اشعار، باڈلین لائبریری کے تذکروں سے جمع کر کے لایا ہوں۔ شورش نے لکھا ہے ''قریب چہار صد شعر گفتہ'' تذکرہ شورش، تذکرۂ عشقی، مسرت افزا، گلزار ابراہیم، گلشن ہند اور ایک مجہول الاسم تذکرے سے ۳۵۲ شعر نقل کر لئے ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا اس طرح میں نے محمد جوشش عظیم آبادی کے بھائی محمد عابد دل عظیم آبادی کے کوئی ۴۰۰ شعر شورش، عشقی، امراللہ الہ آبادی ایک مجہول تذکرہ نگار کے تذکروں سے جمع کر لئے ہیں تو کہنے لگے فوراً چھپوا دیجئے۔ میں نے کہا قاضی صاحب سے اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی ان کے اشعار جمع کئے ہیں اور وہ شائع کرنا چاہتے ہیں اس لئے اب میری توجہ اس کام کی طرف نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے یہ اشعار مرتب کئے۔ طباعت کے لئے ان کی کتابت کرائی (منشی منیر الدین صاحب سے جو سید منظر علی ندوی مرحوم کے برقی پریس میں ملازم تھے) میں نے یہ کتابت شدہ اجزا دیکھے تھے۔ اب وہ مقدمہ لکھنے والے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ دیوان دل عظیم آبادی کا ایک نسخہ دریافت ہو گیا ہے۔ اب اس نسخے کے مطالعہ و مقابلے

کے بعد ہی ''اشعار دل'' کی طباعت ہوسکتی ہے۔ کئی مہینوں کے بعد پٹنہ جانا ہوا تو میں نے ''اشعار دل'' کے بارے میں پوچھا۔ فرمایا اب جب دیوان دریافت ہوگیا ہے تو انتخاب کیا چھاپا جائے۔ فصیح الدین بلخی صاحب نے برٹش میوزیم کے نوادر کا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا ہزاروں ہیں۔ لطائف السعادت (انشا)، شمس البیان (طپش) 'دیوان جہان'، ''گلزار ابراہیم''۔ میں نے کہا دیوان عبدالوہاب یکرو اور دیوان عبید اللہ خان مبتلاؔ کے عکس لایا ہوں اور گلدستۂ حیدری سے تذکرۂ حیدری کی نقل برٹش میوزیم میں بیٹھ کر تیار کی ہے۔ وہاں مرزا غالب کی قاطع برہان اور مثنوی ابر گہر بار کے مطبوعہ نسخے بھی دیکھے۔ آخرالذکر ۵ رمئی ۱۸۶۸ء کو اور اول الذکر ۲۲ رجولائی ۱۸۶۹ء کو داخل ہوا، ہاں درفش کاویانی ۵ رمئی ۱۸۶۸ء کو وہاں پہنچ چکی تھی۔ بلخی صاحب نے پوچھا تاریخ کی کوئی کتاب بھی دیکھی۔ میں نے کہا کنگس کالج کیمبرج میں عنایت اللہ کی تاریخ دل کشا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ ہے۔ تاریخ الہ وردی خاں مہابت جنگ بھی وہاں موجود ہے۔ اسی کالج کی لائبریری میں دیوان نعیم دہلوی اور دیوان آبرو بھی ہے۔ یہ نسخہ تعجب نہیں آبرو کی نظر سے گذرا ہو۔ بعض مقامات پر اصلاحیں اور ترمیمیں ایسی ہیں کہ مصنف ان کا مجاز ہوسکتا ہے۔ بعض غزلوں میں ''س'' کے نشانات ہیں اور کہیں کہیں حاشیے پر اضافات بھی ہیں۔ یہیں دیوان ولی، دیوان میر، دیوان یقین (مکتوبہ منشی چین رائے کایستھ در دارالخلافہ شاہ جہاں آباد ۲۳ء شاہ عالم بادشاہ غازی) کے نسخے بھی موجود ہیں۔

انڈیا آفس لندن کی کتابوں میں جو میرے زیر مطالعہ رہیں، میں نے ایک مجموعۂ اشعار ازسراج کا ذکر کیا جو ۱۴ر محرم ۱۱۹۱ء کا مکتوبہ تھا اور جس میں حضرت جان جاناں مظہر کو ''مظہر سلمہ'' لکھا تھا۔ یہاں گلشن ہند مرزا لطف، عیار الشعرا، ازخوب چند ذکا (نام کاتب کا درج نہیں لیکن، حواشی کیول رام کے لکھے ہوئے ہیں)، تذکرۂ خیراتی لال بے جگر، کلیات سودا بھی محفوظ ہے جسے شاعر نے رچرڈ جونسن کو پیش کیا تھا۔ دیوان کے سرورق پر دو سطریں انگریزی میں لکھی ہیں غالباً جونسن کی لکھی ہوئی:

M.Richard Johnson

The Gift of Author Mirza Sauda

یہیں بیاض سید اصغر علی بسمل دیکھی جس میں نواب ضیاء الدین رخشاں سلم اللہ تعالیٰ کی غزل: تاب نہیں اور خواب نہیں، درج ہے۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرور، مکاشفات الاسرار، (حضرت جی غمگین دہلوی) دیوان آغا جان عیش، نورتن رنگین، اور سعات یار خاں رنگین کی تصانیف محفوظ ہیں اور سب بہ خطِ رنگین۔

میں مخطوطات کے نام اپنی یادداشت کی کتاب سے پڑھتا جاتا تھا اور بلخی صاحب کی حیرت اور شوق میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کہنے لگے کاش ان سب مخطوطات کے عکس میں یہاں منگوا سکتا۔ میں نے کہا ایک کتاب سب سے پہلے منگوایئے اور وہ شاہ محمد کمال کا تذکرہ مجمع الانتخاب ہے مکتوبہ شیخ کرم علی در ۱۲۵۵۔ یہ کوئی ڈھائی سو اردو شعرا کا خاصا ضخیم تذکرہ ہے جس میں بہت سے شعرا کے کلام کا طویل انتخاب درج ہے۔ بعض شعرا کے دواوین ناپید ہیں، اس لئے تذکرے کی اہمیت ظاہر ہے۔

پھر میں نے فرانس اور جرمنی کے بعض کتب خانوں کی اپنی پسندیدہ کتابوں کا ذکر کیا اور انہیں بتایا کہ پیرس میں عمدۃ المنتخبۃ تذکرۂ سرور کا بہت اچھا نسخہ ہے اور ٹیوبنگن میں کربل کتھا (فضلی) کا نسخہ میں نے دریافت کرلیا ہے جو ابتک مفقود سمجھا جاتا تھا۔ یہیں تذکرۂ ریاض الوفاق از ذوالفقار علی مست کا منحصر بفرد نسخہ مجھے ملا جس کا بیشتر حصہ میں نقل کر کے لایا ہوں اور آج کل قاضی صاحب اس کا مطالعہ کررہے ہیں۔ اس گفتگو میں اتنی دیر ہوگئی کہ میں پٹنہ یونی ورسٹی لائبریری کے لئے حاصل کردہ مخطوطات بہت اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ علی گڑھ سے دوسری تعطیل کے موقع پر آیا تو بلخی صاحب سے ملا اور ان کے ساتھ ہی لائبریری گیا۔

معلوم ہوا ہزار سے زائد مخطوطات بہار کے شہروں اور قصبات سے انہوں نے حاصل کئے ہیں۔ شوق تلاش میں وہ بتاتے تھے چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی دو گئے۔ بہار شریف اور استھانواں کے درمیان میں ایک بستی ''جانا'' ملتی ہے۔ وہاں ایک رئیس قطب صاحب رہتے تھے۔ میں نے ان کے یہاں دوالماریوں میں کتابیں رکھی دیکھی تھیں، انہیں وہاں بھی بعض کام کی کتابیں ملیں۔ میں نے اس روز تذکرہ گلزار ابراہیم، دیوان فدوی، کلیات فرحت، دیوان سلطان جان، رقعات قتیل، مکتوبات ٹیپو سلطان، خطوط فارسی سید احمد شہید دیکھے۔ مولانا آزاد بلگرامی

کی سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان اور دیوان احمد منشا خاص طور پر دلچسپی سے دیر تک دیکھتا رہا۔ پہلی کتاب مدت ہوئی بمبی میں چھپی تھی۔ نہایت معمولی بازاری ایڈیشن تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کے اچھے نسخے ملیں تو اسے شائع کروں۔ آخر ایک نسخہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنؤ کے کتب خانے کا مولانا آزاد لائبریری میں ملا اور دو نسخے کتب خانہ خدا بخش میں دستیاب ہوئے جن میں ایک خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسی سال ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ کے ایک طالب علم مولوی فضل الرحمٰن سیوانی سے اپنی نگرانی میں اسے مرتب کرایا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ ملی۔ یہ کتاب علی گڑھ سے دو جلدوں میں شائع کرا دی گئی ہے۔ مرزا احمد منشا، میر، انشاء اللہ خاں انشا کے داماد تھے اور ان کا آخری زمانہ عظیم آباد میں گذرا۔ وہیں غالباً ۱۲۵۵ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ سید عزیز الدین احمد بلخی مرحوم نے تاریخ شعرائے بہار میں ''حیات فریاد'' کے مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے کو حضرت مہدی آخر الزماں کا نائب کہتے تھے۔ غنیمت ہے کہ وہ اپنے کو نائب ہی کہتے تھے، اگر خود مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر لیتے تو اہل عظیم آباد کیا بگاڑ لیتے۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ خدا بخش میں بھی ہے۔ ان کے کچھ فارسی خطوط کا بھی پتا چلا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہو سکا۔

فصیح الدین بلخی کی مطبوعہ کتابوں سے کم تعداد ان کی ان تصانیف کی نہ ہوں گی جو اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ مظفر بلخی نے اپنی کتاب کے باب یازدہم میں ان کی چند غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ آثار قدیمہ (اس کا ایک حصہ 'پٹنہ کے کتبے' کے نام سے خانہ خدا بخش سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا ہے) آثار بلخیہ، دستور سخن، علم نجوم سب اشاعت کے لائق ہیں۔ پہلی دو کتابیں خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کے مضامین کی تعداد پچاس سے کیا کم ہوگی۔ کتب خانہ خدا بخش بہار اردو اکادمی اگر انہیں ''مقالات فصیح'' کے نام سے دو تین جلدوں میں شائع کرائے تو یہ بہت مفید علمی خدمت ہوگی۔ یا یے تحتانی لکھ چکا تھا کہ معلوم ہوا مرحوم کے علمی و ادبی مقالات بہار اردو اکادمی میں زیر طبع ہیں۔

فصیح الدین بلخی صاحب شاعری میں بھی بند نہ تھے۔ تفنن طبع کے طور کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ میں نے ایک ملاقات میں جس میں بہار کے مشاعروں اور بعض معاصر شعرا کا ذکر ہو رہا تھا

جب گفتگو نظام الدین بلخی تک پہنچی تو میں نے کہا آپ بھی شعر ضرور کہتے ہوں گے (میں نے ان کی کوئی غزل کسی موقت الشیوع رسالے میں پڑھی نہ انہیں کسی مشاعرے میں پڑھتے ہوئے سنا تھا) اس لئے کہ آپ کے خاندان کے بڑے چھوٹے سب شاعر ہیں۔ کچھ ہاں کچھ نہیں کر کے رہ گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے پھر ذکر چھیڑا، وہ کچھ خاموش رہے پھر انھوں نے کوئی اور بات شروع کر دی، میرا خیال ہے وہ اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کے مقابلے میں شاعری کو دون مرتبہ سمجھتے ہونگے۔

یاد آتا ہے کہ بہار میں غالبؔ کے تلامذہ اور خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی کے سلسلے میں ان سے میری خط کتابت ہوئی تھی، شاید دو ایک خط، کہیں محفوظ بھی ہوں۔ انھوں نے اپنا ایک مضمون ''صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت'' جو رسالہ نگار (لکھنؤ) میں چھپا مجھے بھیجا تھا تا کہ اپنے زیر تحریر مضمون ''غالب اور بہار'' میں فائدہ اٹھا سکوں۔ ان کے ساتھ جیسا کہ میں نے لکھا خط کتابت تو زیادہ نہیں رہی لیکن ۱۹۵۶ء سے ان کی وفات تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں جب بھی علی گڑھ سے پٹنہ جاتا تو ان سے ملنے کی کوشش ضرور کرتا۔ یہ ملاقاتیں کبھی کتب خانہ خدا بخش میں ہوتیں، کبھی پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں، کبھی سید حسن عسکری صاحب کے گھر اور کبھی قاضی عبدالودود کی قیام گاہ پر ان سے ملنے کی مسرت حاصل ہوتی۔

فصیح الدین بلخی صاحب کی وفات ۱۴ر مارچ ۱۹۶۲ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ ''فصیح الدین بلخی وارد ایوان جنت شد'' سے سال وفات مستخرج ہوتا ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی تربت ٹھنڈی رکھے۔

ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کے خاندان کا ذکر ابھی کچھ دیر اور۔

عزیز الدین بلخی اور نظام الدین بلخی مرحومین کے صاحبزادگان سے میں واقف نہیں۔ ان سے ملنا یاد نہیں آتا۔ ممکن ہے کچھ یہاں ہوں اور کچھ دوسرے ممالک میں جا بسے ہوں، حفیظ الدین بلخی کے صاحبزادے رفیع الدین بلخی سے واقف ہی نہیں ان سے دو ایک ملاقاتیں بھی یاد ہیں۔ پٹنہ کے کامیاب وکیل تھے۔ خلیق اور خوش گفتار تھے۔ بہت ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ محلہ سبزی باغ میں اخبار اتحاد کا دفتر تھا جس کے ایڈیٹر سلطان احمد صاحب سے میں وہاں

ملنے جایا کرتا تھا۔ ان کا مربیانہ اور مشفقانہ انداز مجھے یاد آتا ہے۔ میری کم عمری کا زمانہ تھا لیکن وہ میری غزلیں اور میرے مضامین اتحاد میں شائع کرتے تھے (یہ شاہ سبحان احمد سہسرامی کے بھائی تھے جو خشکی کے راستے ہر پانچ قدم پر سجدہ کرتے حرمین شریفین پہنچے تھے) مطبع اور اخبار کا دفتر ایک بڑے وسیع مکان میں تھا۔ بالائی حصے کے ایک کمرے میں سلطان احمد صاحب رہتے تھے۔ اس عمارت میں مولانا شفیع داودی کو میں نے دیکھا تھا۔ ان کی پارٹی کا دفتر تھا۔ جب یہ پارٹی ختم ہوئی اور اخبار بند ہوا تو سلطان احمد صاحب گورنمنٹ اردو لائبریری چوہٹہ پٹنہ میں سید حسن آرزو پھلواروی کی وفات کے بعد لائبریرین مقرر ہو گئے تھے۔ یہیں انھوں نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک کتاب لکھی تھی جو انھوں نے مجھے علی گڑھ بھیج کر یہ یاد دلایا تھا کہ وہ مجھے بھولے نہیں ہیں۔

یہ جملۂ معترضہ ذرا طویل ہو گیا۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ جب مولانا شفیع داودی کی پارٹی ختم اور اتحاد کا دفتر بند ہوا تو اس علاقے کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ بعد کو جب رفیع الدین بلخی صاحب یہاں آئے تو اس علاقے میں چہل پہل شروع ہوئی۔ وکلا دوست اور موکل صاحبان کے ساتھ ادیب و شاعر اور ادب نواز حضرات کی آمد و رفت کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔ انہیں غالبؔ سے خاصی دلچسپی تھی۔ ان کی کتاب 'تجزیۂ کلام غالب'، کراچی سے چھپی تھی اور اس کا ایک نسخہ میرے پرانے کرم فرما سید الطاف علی بریلوی نے اپنے ادارے کی اور مطبوعات کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ کتاب تو ان کی پڑھ چکا تھا، ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے اس کا ذکر یوسف الدین بلخی صاحب سے کیا۔ کہنے لگے ان سے ملاقات کیا مشکل ہے۔ ابھی چلئے۔ اور انھوں نے اپنے ساتھ لے جا کر ان سے ملاقات کرا دی۔ اپنے موکلوں اور تائیدوں کے ساتھ مصروف تھے لیکن انہیں چھوڑ کر وہ بلخی صاحب کے پاس آ گئے اور مجھ سے ملے۔ میرے پوچھنے پر کہ اردو ادب اور غالبؔ سے ان کی دلچسپی کیسے شروع ہوئی؟ انھوں نے دیر تک اس موضوع پر گفتگو کی۔ وہ اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کو اضافات کے ساتھ ہندوستان سے شائع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے انجمن سے یا مالک رام کے ذریعہ مکتبہ جامعہ سے چھپوانے کا مشورہ دیا اور اپنی سی کوشش کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

دوسری ملاقات بھی ۵۶ء میں ہی ہوئی۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ کہیں باہر سے آئے تھے۔ پسینے میں شرابور تھے۔ بیل کا شربت بنوایا۔ خود بھی پیا، مجھے بھی پلایا، کچھ اس کے فوائد بھی بیان کئے۔ اس اثنا میں جمیل مظہری صاحب آ گئے۔ ان سے پوچھا کہ کیا خواجہ فخر الدین سخن دہلوی کے اخلاف میں پٹنہ یا بہار میں کوئی ایسے صاحب موجود ہیں جن سے غالبؔ کے خطوط مل سکیں۔ یہ ماننے کے وجوہ ہیں کہ ان سے غالبؔ سے خط کتابت ہوئی تھی۔ جمیل مظہری صاحب غالبؔ کے شاگرد شوقی رامپوری کے بارے میں کہنے لگے کہ مولانا آزاد ان کا اپنی صحبتوں میں ذکر کرتے تھے کہ ان کے پاس غالبؔ کے کچھ رقعات تھے خود ان کے نام۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ خطوط مولانا دیکھنے کا ذکر کرتے تھے۔ بولے یہ یاد نہیں۔ رفیع الدین صاحب نے کہا اس سلسلے میں آپ میرے چچا فصیح الدین بلخی صاحب سے دریافت کریں۔ وہ شوقی سے تو نہیں لیکن سخن دہلوی کے خاندان کے لوگوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ انہیں سخن کی تصویر اسی خانوادے سے ملی ہے۔

افسوس وہ شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے۔ ۵۳ سال کی عمر میں ۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو پٹنہ میں انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔

اس خانوادے کا وہ فرد جس نے شعر و شاعری میں زیادہ نام پیدا کیا اور نمایاں مقام حاصل کیا وہ سید فصیح الدین بلخی مرحوم کے صاحبزادے سید محمد ابراہیم نادم بلخی ہیں۔ زود گو اور بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔ مختلف اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں کامیاب ہیں۔ میر تقی میر نے چھ دیوان لکھے اور مصحفی نے آٹھ، صفیر بلگرامی کے بھی آٹھ دیوان ہیں:

آٹھواں فضلِ الٰہی سے ہے دیواں تیرا ‌ ‌ ‌ مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیرؔ

ان (نادمؔ) کے متعدد شعری مجموعے میں نے پڑھے ہیں جو وقعت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ ہائیکو پر مشتمل منی نظموں کا مجموعہ ترلوک (۱۹۹۸ء) ان کا تیرھواں شعری مجموعہ ہے جو میری نظر سے گزرا۔ وہ تقریباً ساری اصناف سخن، نظم، غزل، سانیٹ، قطعات، رباعیات، دوہے پر قدرت رکھتے ہیں۔ 'جیون درشن' (۱۹۸۹ء) اور میٹھی میٹھی بولیاں' (۱۹۹۴ء) دوہوں

کے مجموعے ہیں۔ نقطوں کا حصار، (۱۹۸۸ء) میں رباعیاں ہیں اور دو پہر کا دائرہ (۱۹۸۴ء) دھوپ میں صحرانوردی، (۱۹۸۷ء)، میں اور باطنی ارتعاش، (۱۹۹۶ء) ان کے دواوین غزلیات ہیں۔ ان کی کتابیں آغاز سحر، (۱۹۶۱ء)، ذوق سفر، (۱۹۷۹ء)، تحفے، (۱۹۸۵ء)، چودہ طبق، (۱۹۹۱)، ضیائے عرفان، (۱۹۹۵ء) جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں، میری نظر سے نہیں گزریں۔ ان کے علاوہ منظومات میں غزلوں کا مجموعہ، کشف تغزل، آزاد غزلوں کا مجموعہ، آزاد لہریں، نظموں کا مجموعہ، شام سے پہلے، ہنوز منتظر اشاعت ہیں۔ (شبدوں کی آواز جو دوہوں کا مجموعہ ہے حال ہی میں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے۔)

پروفیسر نادم بلخی نثر میں بھی بند نہیں۔ بہت صاف ستھری نثر لکھتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ، شعاع نقد، (۱۹۹۳ء) گزرا ہے، وہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کے معترف ہوں گے۔ اس میں جدید شعرا میں رشید اعجاز، ظفر ہاشمی، ناوک حمزہ پوری، آندھرا پردیش کے سیف، ظہیر غازی پوری، عتیق احمد عتیق، اور شارق جمال کی شاعری پر جہاں فکر انگیز تبصرے ہیں، وہاں انھوں نے انیسویں صدی عیسوی کے شاعر مومن دہلوی اور صفیر بلگرامی پر بھی قابل قدر معلوماتی مضامین لکھے ہیں۔ شعاع نقد، کے دو مضمون نادم بلخی نے اپنے دو معاصروں مبارک عظیم آبادی (متوفی ۱۹۵۸ء) اور قاضی عبدالودود (متوفی ۱۹۸۴ء) پر سپرد قلم کئے ہیں۔ معاصر بایں معنی کہ ہر چند یہ دونوں عمر میں ان سے بڑے تھے، ایک کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں ہوئی اور دوسرے کا سال ولادت ۱۸۹۶ء ہے۔ لیکن انھوں نے دونوں کا زمانہ ہی نہیں پایا، دونوں سے ملنے جلنے اور انہیں قریب سے دیکھنے کے بھی انہیں موقع ملے اور ان کی تحریرات نظم ونثر بھی ان کی نگاہ سے گذریں۔ ان دونوں صاحبوں سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں صراحت کی ہے کہ ان کے والد فصیح الدین بلخی کی والدہ اور قاضی صاحب کا نسب نامہ آگے کی پشت میں قاضی امین الحق ابن قاضی کمال الحق تک پہنچ کر ایک ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قاضی صاحب کے پردادا اور فصیح الدین بلخی مرحوم کی نانی سگے بھائی بہن تھے۔ قاضی صاحب اور بلخی، دونوں خاندانوں کی زمین اور جائداد ایک ہی جگہ بخشی محلے میں تھی۔ نادم صاحب کو ان کے بارے میں بہت کچھ معلومات اپنے خاندان

کے لوگوں سے حاصل ہوئے اور انہیں خود بھی ان سے ملنے ملانے کے مواقع ملے۔ کبھی تنہا ان کے پاس گئے اور متعدد بار اپنے والد فصیح الدین بلخی صاحب کے ساتھ انہیں وہاں جانے کے مواقع ملے۔ قاضی صاحب کی بیشتر کتابیں اور مضامین انھوں نے پڑھے اور اپنے تاثرات ایک مضمون کی شکل میں پیش کئے۔

مبارک عظیم آبادی کی سوانح حیات اور ان کی شاعری اور فن پر بھی بہت جامع اور پر از معلومات مضمون لکھا ہے۔ ان سے ان کے خاندانی تعلقات تھے۔ نادم صاحب کے والد فصیح الدین بلخی ہی نہیں ان کے تینوں چچا حفیظ الدین بلخی، عزیز الدین بلخی اور نظام الدین بلخی سے بھی گہرے مراسم تھے۔ بخشی محلہ میں یہ خاندان آباد تھا جہاں مبارک عظیم آبادی آتے تھے اور مشاعروں اور ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ نادم صاحب کا ان کے بچپن ہی سے مبارک صاحب کے یہاں آنا جانا رہا جب ان کا ''شعور شعر و شاعری سمجھنے سے قاصر'' تھا۔ سن شعور پر پہنچنے کے بعد بھی وہ ان سے ملتے رہے اور ان سے فیض حاصل کرتے رہے اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ مبارک عظیم آبادی کی زندگی کے آخری عہد کو انہیں نزدیک سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ نادم صاحب نے یہ مضمون قلمی تحریروں اور مطبوعہ مواد کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن مضمون کی کامیابی کا راز اس امر میں ہے کہ انہیں اپنے خاندان کے بزرگوں سے مبارک صاحب کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل ہوئے اور پھر وہ خود ان سے برسوں ملتے رہے۔ اس لئے شاعر کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جس قدر حق نادم صاحب کو ہے وہ ان کے معاصرین میں شاید کم لوگوں کو حاصل ہو۔

مجھے آخری الذکر دونوں مضمون خاص طور پر پسند آئے اور میں نے انہیں بہت توجہ اور شوق سے پڑھا۔ اس لئے بھی کہ قاضی صاحب سے میرے تعلقات کوئی ۴۵ رسال رہے۔ یہ ۱۹۳۸ء میں شروع ہوئے اور ان کی وفات ۱۹۸۴ء تک قائم رہے۔ اس نصف صدی میں انھوں نے مجھے پانچ سات سو خطوط و رقعات تو ضرور لکھے ہوں گے اور ہزار بار سے زیادہ ان سے ملاقات کے مواقع مجھے ملے ہوں گے۔ جہاں تک ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی (وہ ایک زمانے میں اسی نام سے مشہور تھے) کا تعلق ہے میں نے انہیں بھی متعدد مشاعروں اور ادبی

صحبت میں دیکھا اور پڑھتے ہوئے سنا۔ درگاہ شاہ ارزاں اور خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں بھی لیکن زیادہ تر تکیہ بارگاہ عشق میتن گھاٹ میں۔ وہ وہاں رجبی شریف کے جلسوں میں جو شاہ حمید الدین احمد سجادہ نشین کے اہتمام میں برسوں ہوتا رہا، ضرور شریک ہوتے تھے۔ جلسہ تو رات کو ختم ہوجاتا تھا اور محفل ختم ہوجاتی تھی لیکن مقررین، مہمانان گرامی (مجھے شاہ شفیع فردوسی اور یاس بہاری وغیرہ کے نام یاد آتے ہیں) اور کچھ خاص اصحاب خانقاہ میں قیام پذیر ہوتے۔ بعض اصحاب صبح ناشتے کے بعد بعض دن کے کھانے کے بعد اور چند اصحاب عصر کے وقت رخصت ہوتے۔ ڈاکٹر مبارک عام طور پر وہیں شب باش ہوتے۔ میں کچھ طالب علموں اور نوعمروں کے ساتھ ان کی جائے قیام پر پہنچ جاتا تھا۔ ان کی باتیں سنتے جو ظرافت سے خالی نہ ہوتیں۔

ان کا مطبوعہ دیوان مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ جو شعر میں نے ان سے سنا یا کہیں پڑھا، ان میں سے چند یاد ہیں:

کہتی ہے تکمیل محبت اس کو محبت کہتے ہیں — جلتی ہے جب شمع مبارکؔ جلتا ہے پروانہ بھی

مری خاک بھی اڑے گی بہ ادب تری گلی میں — تری آستاں سے اونچا نہ مرا غبار ہوگا

یہ غم کدہ ہے اس میں مبارکؔ خوشی کہاں — غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

یہ پوری غزل رسالہ ندیم (گیا) میں چھپی تھی۔

کسی کو دیر کسی کو حرم مبارک ہو — ہمیں وہ در کہ جہاں دل کی آرزو نکلے

یہ داغؔ سخن سنج کا ہے فیض مبارک — بلبل کو بھی گفتار ہماری نہیں آتی

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا

ہم کو معلوم ہے انجام محبت کیا ہے — ایک دن موت کی امید پہ جینا ہوگا

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا — یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا

خدا کے واسطے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
مرے شیشہ میں مئے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے

ڈاکٹر مبارک کی وفات پٹنہ سٹی میں ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

نادم بلخی کے دونوں مضامین (مبارک عظیم آبادی اور قاضی عبد الودود حیات و خدمات)،

شعاع نقد، میں شائع ہوئے۔ نثر میں ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے اپنے والد فصیح الدین بلخی مرحوم کی سوانح حیات، دلچسپ کہانی ان کی، کے نام سے لکھی ہے۔ نام نیک رفتگاں ضائع مکن، پر عمل کرتے ہوئے کتب خانۂ خدا بخش اور بہار اردو اکاڈمی کو ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

نادم بلخی کے صاحبزادے ڈاکٹر مظفر بلخی (صدر شعبۂ اردو جے۔ ایس۔ کالج ڈالٹن گنج) سے ملاقات نہیں رہی کچھ خط کتابت رہی۔ اپنے جد امجد فصیح الدین بلخی مرحوم کی حیات اور کارناموں پر انھوں نے ڈاکٹر احمد سجاد کی نگرانی میں مقالۂ تحقیقی تیار کیا ہے جس پر انہیں رانچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ یہ کتابی شکل میں پٹنہ سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ انھوں نے مجھے بھیجا تھا اور اسی زمانے میں اپنی رائے اس کتاب پر لکھ کر بھیج دی تھی۔ اس مضمون کے لکھتے وقت وہ ہمیشہ میرے پیش نظر رہی اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان سے توقع ہے کہ وہ اپنے خاندانی علمی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

بلخی حضرات میں مولانا حکیم سید شاہ تقی حسن سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فردوسیہ فتوحہ (ضلع پٹنہ) اور حکیم علیم الدین بلخی سابق پرنسپل طبیہ کالج پٹنہ بھی یاد آتے ہیں۔ شاہ تقی حسن نے غالباً مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور والد صاحب علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے۔ ان کی طالب علمی کا زمانہ تو مجھے یاد نہیں۔ ان سے ملاقاتیں اس وقت شروع ہوئیں جب میں بہار میں اُردو نثر، پر کام کر رہا تھا۔ حضرت حسین نوشہ توحید بلخی کی زندگی وتصانیف پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی بعض غیر مطبوعہ تصانیف دیکھنے میں خانقاہ فتوحہ بھی گیا تھا۔ خلیق اور خوش گفتار آدمی تھے اور بہار میں جب اختلال کا دور شروع ہوا تقسیم ہند کے بعد تو فتوحہ کا قیام ترک کر کے محلہ عالم گنج پٹنہ کو انھوں نے اپنا مسکن بنا لیا۔ ایک دو بار یہاں بھی ان کی اقامت گاہ پر ان سے ملنے گیا تھا۔ یورپ سے واپسی (۱۹۵۶ء) کے بعد ان سے ملنا یاد نہیں آتا۔ شاید ۱۹۵۵ء میں ہی سفر آخرت اختیار کر چکے تھے۔

حکیم علیم الدین صاحب کو میں نے متعدد مجالس میں دیکھا، ملاقات کا موقع صرف ایک

دوبارہی ملا۔ طبیہ کالج کے لائق و فائق اساتذہ میں ہیں اور وہاں کے کامیاب پرنسپل۔ متقاعد ہونے کے بعد سلطان گنج یا عالم گنج میں مقیم ہیں۔ طبابت کرتے ہیں اور سلسلۂ رشد و ہدایت بھی جاری ہے۔ بارک اللہ فی عمرہ وحفظہ اللہ۔ (حکیم صاحب عالم گنج میں رہتے تھے اور بینائی سے محروم ہو چکے تھے اور اب بقید حیات نہیں ہیں۔ حسن عباس)

یہ مضمون غیر مکمل رہے گا اگر بلخی خانوادے کی اس اہم شخصیت کا ذکر نہ کروں جس سے میرے سب سے زیادہ قریبی تعلقات رہے اور جس سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ شخصیت سید یوسف الدین احمد بلخی کی ہے۔

مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ آج کی طرح نصف صدی سے پہلے بھی جونیر اور سینئر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ نصاب میں انگریزی کا درس بھی شامل تھا۔ سینئر حصے میں ماسٹر سید صفیر الدین انگریزی پڑھاتے تھے۔ وجیہہ آدمی تھے عینک لگاتے تھے۔ خشخشی داڑھی رکھتے تھے۔ شیروانی پہنتے تھے اور سولا ہیٹ لگاتے تھے۔ یہ اپنی صورت و شکل وجاہت اور انگریزی کے استاد ہونے کی مناسبت سے طالب علموں میں پوپ صاحب کہلاتے تھے۔ مدرسے کے جونیئر حصے میں مظفر صاحب نام کے ایک گورے خوبصورت آدمی انگریزی کا درس دیتے تھے۔ یہ سگار پیتے تھے اور آن بان کے آدمی تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد حکومت بہار کے کسی محکمے میں ملازم ہو گئے۔ بعد کو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ان کی جگہ پر یوسف الدین بلخی صاحب کا تقرر ہوا۔ جو ایم اے تو اردو فارسی میں تھے لیکن مدرسے میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس زمانے میں وہ ماسٹر یوسف الدین بلخی کہلاتے تھے۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ درجہ چہارم سے درجہ ہفتم یا شاید ملاّ کی جماعت تک بچوں کو انگریزی درس دیتے تھے۔ لیکن اپنے نام کے ساتھ، استاد السنۂ مغربیہ، لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ باطن تخلص کرتے تھے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے سوا انہیں کہیں اور شعر پڑھتے نہیں دیکھا۔ نجی صحبتوں میں بھی ان کا شعر سنانا یاد نہیں آتا۔ نہ انھوں نے کسی کو شاگرد بنایا اور نہ خود انھوں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمیذ تہ کیا۔ وہ اس معاملے میں تلمیذ الرحمن تھے۔ ممکن ہے ابتدا میں انھوں نے اپنے ماموں سید عزیز الدین بلخی رازؔ سے اول فیوض حاصل کئے ہوں لیکن یہ بات قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے جونیئر حصے کا جہاں ملا تک تعلیم ہوتی تھی میں طالب علم نہیں رہا۔ اس لئے میں ان سے اس زمانے میں زیادہ واقف نہ ہوسکا۔ متوسطات تک کی تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کر کے براہ راست، مولوی، کی جماعت میں داخل ہوا۔ عالم، کی تعلیم کے دوران ظہر کی نماز مدرسے کے سینئر طلبا و اساتذہ کے ساتھ نوری مسجد میں پڑھتا تھا۔ وہاں روزانہ انہیں دیکھتا تھا۔ وہیں اندازہ ہوا کہ والد صاحب علیہ الرحمہ سے ان کا گہرا قلبی تعلق ہے اور وہ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ظفر منزل بھی تشریف لاتے اور دینی و اسلامی موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ تصوف کے مسائل پر گفتگو ہوتی اور بزرگان دین خاص طور پر مخدوم الملک اور ان کے خلفا اور ان کی تعلیمات و افکار موضوع رہتے۔ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم سے انہیں بہت محبت تھی، ان کے ذکر پر وہ کبھی کبھی آبدیدہ اور گلوگیر ہو جاتے۔ بعض خطوں پر ۷۸۶ (بسم اللہ الرحمن الرحیم) کے بعد ۹۲ (نام پاک محمد) کا ہندسہ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بعض خطوں کی پیشانی پر ''ھوالشرف المظفر'' بھی میں نے لکھا ہوا پایا ہے۔ بعض مکتوبات و تحریرات کے آخر میں خاکپائے فردوسیاں سید یوسف الدین احمد بلخی، لکھا کرتے تھے۔ فردوسی سلسلے میں بیعت رکھتے تھے۔

ماسٹر یوسف الدین بلخی میرے گھر والوں کے لئے صرف بلخی صاحب تھے۔ جب کہا جاتا، بلخی صاحب آئے تھے، بلخی صاحب نے پیغام بھیجا ہے، بلخی صاحب کا رقعہ آیا ہے، تو مراد ماسٹر یوسف الدین بلخی ہی ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میں صرف ایک بلخی سے واقف تھا اور وہ یہی یوسف الدین بلخی صاحب تھے۔

بلخی صاحب کو جیسا میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا، تقریباً ایسا ہی انہیں ان کے آخری زمانے میں پایا۔ وہ دبلے پتلے چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ انہیں ہمیشہ شروانی میں ملبوس دیکھا۔ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ بعد کو جب اس کا رواج ختم ہوا تو سیاہ بالوں والی رومی ٹوپی استعمال کرنے لگے۔ دبیز تال کی عینک لگاتے تھے۔ رنگ صاف تھا۔ نرم لہجے میں دھیمی آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے اور انہیں ہمیشہ، آپ کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ والد صاحب علیہ الرحمہ کے معتقدین میں تھے اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے۔ اس

لحاظ سے میں ان کا عزیز تھا۔ لیکن کچھ یاد نہیں آتا کہ انھوں نے 'تم' کہہ کر خطاب کیا ہو۔ ظہر کی نماز وہ پابندی کے ساتھ مدرسہ شمس الہدیٰ کی نوری مسجد میں جماعت ادا کرتے۔ زیادہ تر میں نے دیکھا کہ وہ والد صاحب کے ساتھ وضو کر رہے ہیں۔ انھی کے ساتھ سنت کی نماز پڑھ رہے ہیں اور انھی کے قریب بیٹھ کر فرض ادا کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں دینی مسائل پر گفتگو کرتے اور اسلامی تعلیمات اور مسائل تصوف پر سوالات کرتے۔ وہ سلسلہ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وسیع المشرب تھے۔ صوفیائے کرام کے مسلک کے پابند تھے۔ نماز ظہر کی امامت عام طور پر جب بھی اور جس قدر انہیں موقع ملتا مدرسہ کے پرنسپل، شیخ الہند کے شاگرد مولانا محمد سہول عثمانی کرتے تھے۔ وہ نہ ہوتے تو کوئی اور۔ مسجد میں حاجی سید نور الہدیٰ صاحب مرحوم کے زمانے میں بھی کوئی امام مقرر نہ تھا۔ موذن ایک لمبے تگڑے پشاوری تھے۔ نام یاد نہیں رہا۔ عام طور پر لوگ انہیں آغا صاحب کہتے تھے۔ یہ مولانا محمد سہول صاحب کے بڑے جاں نثار مرید تھے۔ مدرسے کے اساتذہ میں غیر مقلد بھی تھے، دیوبندی بھی، خانقاہی بھی اور بریلوی بھی تھے۔ لیکن کسی کو کسی کے پیچھے نماز پڑھنے میں تامل نہ تھا۔ مدرسہ شمس الہدیٰ میں دین کی تعلیمات ہوئی تھیں لیکن وہ دیوبند، بریلی، سہانپور، فرنگی محل وغیرہ کے مدارس کی طرح کوئی دینی مدرسہ نہ تھا۔ حکومت انگلیشیہ کے زیر اہتمام چلنے والی ایک علمی درس گاہ تھی۔ وہاں کے اساتذہ اپنے معتقدات و اعمال کے پابند تھے۔ لیکن خیالات کے اختلافات کے باوجود اس ادارے کا علمی ماحول کبھی درہم ہوتے نہیں دیکھا۔ مولانا محمد سہول مرحوم کو میں نے بیسوں بار محفل میلاد شریف میں شریک ہوتے اور قیام کرتے ہوئے صلوۃ وسلام پڑھتے دیکھا ہے۔

بلخی صاحب کی تعلیم کسی مدرسے میں نہیں ہوئی۔ کالج میں پڑھا۔ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ نسلاً سادات بلخی سے تعلق رکھتے تھے اور مشرباً وہ فردوسی تھے۔ مدرسے میں انہیں علمی و دینی فضا ملی جس سے وہ زیادہ سے زیادہ مذہب سے قریب ہوتے گئے۔ میں نے ان کی ایک پرانی تحریر دیکھی ہے جس میں انھوں نے سید شاہ محمد محسن داناپوری سجادہ نشین خانقاہ ابوالعلائیہ داناپور اور دوسرے ابوالعلائی حضرات کے درمیان اختلافات دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

بلخی صاحب کو اردو ادب سے دلچسپی تھی۔ موزوں طبع تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن کم گو تھے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے مشاعرے کے سوا نہیں کہیں اور شعر سناتے نہیں دیکھا۔ سائنس کالج کی بزم سخن اور پٹنہ کالج کی بزم ادب میں بھی نہیں۔ انھوں نے یا ان کے کسی عزیز شاگرد نے شاید ان کا کلام جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میرے پاس ان کے لکھے ہوئے دو قطعات محفوظ ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں مدرسہ شمس الہدیٰ سے بلخی صاحب کا تعلق کب تک قائم رہا اور کب وہ رانچی کالج کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں وہ پٹنہ میں تھے اور سینٹ ہال کے سامنے کی گلی جس میں محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ، مولانا سید علی اصغر جعفری، مولانا مسعود عالم ندوی، محمد... اور جس کے آخری سرے پر قیوم قائد رہتے تھے، اسی گلی کے ایک مکان میں سید یوسف الدین بلخی اور ان کے چھوٹے بھائی سید محمد اسحاق واقف مقیم تھے۔ بیسوں بار ان سے اس مکان میں ملنے گیا ہوں۔ پھر شاید یہ کہیں اور منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں میں علی گڑھ آ گیا۔ تعطیلات میں پٹنہ جاتا تو کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی، کبھی قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں، کبھی کتب خانہ خدا بخش میں، کبھی کہیں اور۔ تعطیلات میں وہ اکثر رانچی سے پٹنہ آجاتے تھے جہاں سے ان کا وطن موضع ''سائیں'' بھی قریب تھا اور ان کی سسرال بہار شریف بھی۔ فسادات بہار کے بعد سائیں جانا تو ان کا کم ہو گیا تھا اور رانچی کالج سے متقاعد ہونے کے بعد وہ مستقل طور پر سجاد منزل، محل پر، بہار شریف میں مقیم ہو گئے تھے۔ اپنی بیگم کی وفات (اواخر ستمبر ۱۹۶۶ء) کے بعد بہار شریف سے جمشید پور منتقل ہو گئے جہاں ان کی صاحبزادی اور داماد رہتے تھے۔ بقیہ دن وہیں گذرے۔

ان کا تحریر کردہ پہلا مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ''ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد'' ہے۔ یہ آقای احمد بن محمد علی بن محمد باقر اصفہانی مشہور بہ بہبہانی کے سفر نامے، مرآۃ الاحوال جہاں نما، سے ماخوذ ہے۔ مصنف تین بار عظیم آباد آئے تھے۔ اس شہر کے بارے میں انھوں نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا قاضی عبدالودود صاحب کی فرمائش پر بلخی صاحب نے اردو میں

ترجمہ و تلخیص کیا تھا جس کی دو قسطیں جن میں مصنف نے ۱۲۲۱ھ میں عظیم آباد پہنچنے کا اور وہاں کے مشاہیر سے ملنے کا حال لکھا ہے، رسالہ 'معیار' کے تیسرے اور پانچویں شمارے (مئی۔ جولائی ۱۹۳۶ء) میں قاضی صاحب نے شائع کیا تھا۔ معروضات، میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آقای بہبہانی نے اس شہر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ معیار، میں بالاقساط شائع ہوگا۔ لیکن رسالہ بند ہوگیا اور باقی قسطیں شائع نہ ہوسکیں۔

ان کا دوسرا مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ''اردو نمائش پٹنہ کا سرسری خاکہ'' ہے جو ہماری زبان کے ۲۲/دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ان کے اور مضامین بھی ضرور شائع ہوئے ہوں گے لیکن ان کا دیکھنا یاد نہیں آتا۔ بہت دنوں سے وہ فرہنگ بہار، (بہاری الفاظ، محاورات وامثال کا لغت) تیار کرنے میں مصروف تھے۔ یہ ۱۹۶۵ء کے اواسط میں مرتب ہوچکا تھا۔ انہیں اس کی اشاعت کی فکر ہوئی۔ انھوں نے کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ کے مالکوں سے بات کی۔ لیکن وسائل کی کمی کے سبب وہ اصحاب تیار نہ ہوئے۔ شاد بک ڈپو کے حافظ سید ظہیر احمد مجروحؔ عظیم آبادی کی طرف رجوع کیا۔ وہ آمادہ ہوئے لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ بھی کچھ نہ کرسکے۔ ان کے عزیزوں میں ایک بزرگ سید مہدی حسین صاحب منیری شہودی تھے جن کا بمبئی میں کاروبار تھا۔ بلخی صاحب نے ان کے ذریعے کوشش کی کہ وہاں کے ایک ناشر حسین مرزا جو کتابوں کی طباعت واشاعت کرتے تھے، فرہنگ بہار چھاپ دیں۔ کسی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اب انھوں نے مجھے لکھا کہ میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور صاحب سے بات کروں اور اس کتاب کو انجمن سے چھپوادوں۔ یہ ایک آل انڈیا ادارہ ہے میں اس کا رکن تھا۔ اس لیے مجھے معلوم تھا کہ کتنے مسودات ہندوستان بھر سے آتے رہتے ہیں لیکن وسائل محدود ہونے کی وجہ سے سارے مسودات اشاعت کے لئے قبول نہیں کئے جاسکتے۔ پھر اس کے بھی اپنے قاعدے اور ضابطے ہیں۔ سال میں ایک بار سالانہ جلسے کے موقع پر مسودات کی منظوری ملتی ہے۔ منظوری کے بعد بھی کتاب کے انطباع پذیر ہونے میں سال دو سال یا اس سے بھی زائد کی مدت لگ جاسکتی ہے۔ میں نے بلخی صاحب کو لکھا کہ انجمن سے کتاب کے چھپوانے میں تو مسائل کا سامنا ہوگا اور تاخیر بھی ہوگی۔ آپ چاہیں

تو یونیورسٹی کے رسالے فکر ونظر میں یہ شائع ہوجائے اور وہ بھی قسط دار۔ انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے پھر لکھا کہ اگر کتابی شکل میں شائع ہوجائے تو بہت اچھا۔ یہ نہ ہوسکے تو رسالے میں چھپوا لیجئے۔ مین سو دو سو جتنے نسخے آپ کہیں گے فاضل چھپوا دوں گا۔ سرورق لگوا کر اسے کتابی شکل دے دوں گا کہ آپ دوستوں اور اہل ذوق احباب میں تقسیم کرسکیں۔ وہ اس پر آمادہ ہوگئے۔ پروفیسر آل احمد سرور صاحب انجمن کے سکریٹری بھی تھے اور یونیورسٹی کے رسالہ فکر ونظر کے اڈیٹر بھی وہ چھ ماہ کے لئے بعض جامعات کی دعوت پر امریکہ جانے لگے تو وہ تشریف لائے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں عارضی طور پر انجمن کی سکریٹری شپ قبول کرلوں اور ان کی غیر موجودگی میں انجمن اور فکر ونظر کا کام بھی دیکھوں۔ میں نے معذرت کی۔ چند دنوں کے بعد وہ دوبارہ تشریف لائے تو ان کے اصرار پر میں فکر ونظر کی ادارت کے لئے تیار ہوگیا۔ انجمن کا کام دیکھنے کے لئے پروفیسر مسعود حسین صاحب آمادہ ہوگئے۔ میں نے اس سہ ماہی رسالے کے دو شمارے مرتب کئے اور ان میں بلخی صاحب کی 'فرہنگ بہار' کے دونوں حصے دو قسطوں میں (فکر ونظر ۱۹۷۰-۱۹۷۱، جلد ۱ شمارہ ۱-۲) شائع کردیے اور جو معاوضہ مضمون کا انہیں یونیورسٹی سے ملا اس سے ان کے مضمون کے سو دو سو نسخے چھپوا کر انہیں بھیج دیئے۔ جو رقم بچی وہ بھی انہیں روانہ کردی گئی۔

اس طرح فرہنگ بلخی جس پر انھوں نے محنت کی تھی اور جس میں زندگی کے کئی سال صرف کئے تھے، ضائع ہونے سے بچ گئی۔ یاد آتا ہے کہ انھوں نے کسی خط میں لکھا تھا کہ احباب میں تقسیم کے بعد بقیہ نسخے وہ قاضی رئیس کے مکتبہ کتاب منزل سبزی باغ میں رکھوا دیں گے۔ معلوم نہیں اس کا موقع ملا یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے کچھ ہی مہینوں کے بعد ان کی رحلت کی اطلاع ملی۔

علی گڑھ سے چھپا بلخی صاحب کا یہ مضمون کسی طرح ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب کو مل گیا۔ وہ ایسی چیزوں کے قدرداں ہیں۔ انھوں نے اسے کتابی شکل میں کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ سے شائع کردیا۔ انہیں طبع اول کی داستان نہیں معلوم ہوسکی۔ اس لئے انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

بلخی صاحب کی کسی اور تصنیف کا مجھے علم نہیں۔ بارہویں صدی ہجری کے ایک قدیم شاعر میر ضیاء الدین ضیا دہلوی متوفی قبل از ۱۲۱۵ھ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۴۲ء میں ان

کے پاس تھا۔ یہ بڑا نادر نسخہ تھا۔ یہ قاضی عبدالودود صاحب کے پاس کچھ دنوں تک رہا تھا۔ انھوں نے جو لکھا ہے کہ ''ایک عزیز کی مہربانی سے مجھے بھی اس کی زیارت کا اتفاق ہوا ہے'' (معاصر مارچ ۱۹۴۲ء) تو عزیز سے مراد ہمارے سید یوسف الدین احمد بلخی ہی ہیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''میر ضیا دہلوی، میر وقائم وغیرہ کے معاصر تھے۔ غالباً حملۂ درّانی کے بعد دہلی سے اودھ گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کے بعد عظیم آباد چلے آئے اور یہیں متوطن ہوئے۔ مہاراجا شتاب رائے کا ایک بیٹا زمانہ تالیف تذکرۂ میر حسن میں ان کا سرپرست تھا۔ تلامذہ میں میر حسن دہلوی اور میر محمد رضا عظیم آبادی مشہور ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ دیوان قاضی صاحب نے بلخی صاحب سے حاصل کرلیا تھا۔ شعر انھوں نے زیادہ نہیں کہے۔ جو کہے وہ محفوظ نہ رہ سکے یا کسی وجہ سے شائع نہ ہوسکے۔ میرے والد مرحوم سے وہ محبت کرتے تھے اور عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی وفات (۱۹ر جمادی الآخر ۱۳۸۲ھ/ ۱۸ر نومبر ۱۹۶۲ء) پر فارسی میں قطعہ تاریخ وفات لکھ کر انھوں نے ۱۰ر مئی ۱۹۷۰ء کو مجھے بھیجا تھا۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے:

خبرے صبح دم بگوش آمد — دل یوسف بشد ملول وحزین
از جہاں رفت افسر علما — عزت قوم وملک ظفر الدین
ماہر علم ظاہر و باطن — سالک راہ بود وہادی دین
درہمہ سلسلہ اجازت داشت — پیکر خلق وزہد وفقر ویقین
صوفیان ہم شدند شاگردش — باہزار افتخار وصد تمکین
باد اعلی مقام در جنت — روح پاکش بباد سدرہ نشین
از سر کرب سال فوتش گفت — قلق باطن وصال ظفر الدین

۲۰ — ۱۴۰۲
-۲۰
۱۳۸۲ھ

ان کا اردو کا ایک قطعہ دسمبر ۱۹۵۹ء کا کہا ہوا خود ان کا بھیجا ہوا میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے۔ ایک خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء کو آں عزیز کی خدمت میں ایک رجسٹرڈ لفافہ ارسال کیا جس میں ایک خط منظوم تھا ایک منثور اور ایک سند رکنیت دائمی کی جو بزم ادب رانچی کالج نے آں عزیز کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ہنوز اس خط کا جواب نہیں ملا ہے جس کا بے تابی سے انتظار ہے۔"

خط منثور اور سند رکنیت تو ضائع ہو گئی لیکن خط منظوم جو بلخی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کاغذات میں مل گیا۔ وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

خط منظوم بہ حسن خدمت جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو رضوی بہاری پی۔ ایچ۔ ڈی (آکسن) پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) شعبۂ علوم اسلامی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(از ناچیز سید یوسف الدین احمد بلخی فردوسی باطنؔ، سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو رانچی کالج۔ رانچی)

مرحبا مرحبا اے فارس میدان ادب — حبذا حبذا اے فاضل اعجاز رقم
ہیں زمانے میں محقق بھی سخن سنج بھی ہیں — صاحب نقد و نظر بھی ہیں مگر تم سے کم
میرے شاگرد ہیں رانچی کے غلام مرشد — صاحب علم و ہنر پیکر اخلاص و کرم
میرے اشعار کے دیواں کے مرتب ہیں وہ — ان کی کاوش سے یہ اوراق پریشاں ہیں بہم
زیور طبع سے آراستہ ہوں یہ افکار — ان کا اصرار ہے یہ اور تقاضا پیہم
آرزو یہ ہے کہ تحریر تعارف سے کرے — زینت صفحۂ قرطاس کوئی اہل قلم
جو خصائل ہیں وہی اس میں نمایاں ہو جائیں — اور توصیف ہو ایسی جو نہ ہو بیش نہ کم
میں کہاں اور کہاں حسن عروس شہرت — پھر بھی منظور نہیں مجھ کو کسی دل پہ ستم
اس لئے عرض ہے بس تم ہی قلم بند کرو — تم ہو مشہور زماں اور شہیر عالم
گنج حکمت بھی ہو تم، صاحب تقویٰ بھی ہو — اور محبت بھی ہے مجھ سے بہ کمال و اتم
یا خدا حضرتِ مختار سلامت بادا — اور تابندہ رہے نیرّ اقبال و حشم

سایۂ رحمت باری رہے دائم سر پر
سن لے باطن کی تو یہ عرض طفیل ادہم

بلخی صاحب سے میری خط کتابت علی گڑھ کے دوران تعلیم (۱۹۴۳ء۔ ۱۹۵۲ء) میں بہت کم رہی۔ اس زمانے کا ان کا کوئی خط محفوظ نہیں۔ لیکن میری یورپ سے واپسی (۲۱/اپریل ۱۹۵۶ء) کے بعد اپنی وفات تک جو خط انھوں نے لکھے، وہ زیادہ تر محفوظ رہے۔ ان کی تعداد ۱۸/ہے۔ پہلا خط جو محفوظ ہے وہ جمعہ ۱۲/فروری ۱۹۶۰ء کا لکھا ہوا ہے جو انھوں نے سجاد منزل، محل پر، بہار شریف ضلع پٹنہ سے تحریر کیا ہے۔ آخری خط پر تاریخ تحریر ۱۸/ ۱۰/ ۷۰ درج ہے۔ اس پر ۲/ریلولا اسکول ایریا، جمشید پور کا پتا درج ہے۔ میرا خیال ہے کہ رانچی کالج سے سبکدوشی کے بعد وہ اپنی سسرال بہار شریف میں مقیم ہو گئے ہوں گے لیکن ستمبر ۱۹۶۶ء میں اہلیہ کی وفات کے بعد وہ تنہائی محسوس کرنے لگے ہوں گے۔ ان کی اولاد میں صرف ایک بیٹی ہیں جو اپنے شوہر مطلوب عالم صاحب کے ساتھ جمشید پور میں رہتی ہیں۔ ان دونوں نے انہیں جمشید پور بلا لیا ہوگا اور وہ بہار شریف سے جمشید پور منتقل ہو گئے ہوں گے۔ بلخی صاحب کی یہ بچی پیدا ہوئی تو انھوں نے والد صاحب سے اپنی عقیدت کی بنا پر اس کا نام رکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنی بیٹیوں کے نام رزینہ خاتون، ولیہ خاتون، ریحانہ خاتون، صفیہ خاتون، شمیمہ خاتون اور نعیمہ خاتون رکھے تھے۔ انھوں نے بلخی صاحب کی اس بچی کا نام رضیہ خاتون رکھا۔ بلخی صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:

> میرے خویش کا نام مطلوب عالم ہے۔ یہ Tisco میں نوکر ہے اور پتا وہی ہے جو میرا ہے اور میں انہی کے ساتھ رہتا ہوں۔

اس خط پر تاریخ تحریر ۳۰/ ۳/ ۷۰ درج ہے۔

بلخی صاحب اپنے ایک خط مورخہ ۶/ستمبر ۱۹۶۶ء میں تحریر فرماتے ہیں:

> دسمبر ۱۹۶۴ء کے بعد آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بے حد اشتیاق ملاقات ہے۔ اس کے بعد کی تعطیلات میں بھی منتظر رہا۔ اگر آپ کے پٹنہ آنے کی اطلاع ہوتی تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ معلوم کیجیے کہ اکتوبر

میں آپ کی یونیورسٹی کی تعطیل کب سے کب تک ہوگی اور دسمبر میں
کب سے کب تک۔ اپنی قیام گاہ کا پتا تحریر کیجئے گا کہ اگر حسن اتفاق
سے علی گڑھ پہنچوں تو آسانی سے در دولت تک پہنچ سکوں۔

میں نے انہیں لکھا کہ میں خود آپ سے ملنے کا بے حد مشتاق ہوں۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ میں خود حاضر ہوں گا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۶۶ء کی تعطیل سرما میں جب میں پٹنہ اور پھر راجگیر گیا تو ایک صبح میں بہار شریف پہنچا اور محلہ محل پر، جاگران کا مکان، سجاد منزل، تلاش کیا۔ اور ان کی خدمت میں دن بھر حاضر رہا۔ تاریخ اب یاد نہیں لیکن دن جمعہ کا تھا۔ یہ اس لئے یاد رہ گیا کہ ان کے ساتھ محلے کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی۔ پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ۲۴؍فروری ۱۹۷۱ء کو جمشید پور سے ان کے خویش مطلوب عالم صاحب کا خط مورخہ ۲۲؍فروری علی گڑھ میں موصول ہوا:

نہایت ہی افسوس کے ساتھ خبر دیتا ہوں کہ جناب سید یوسف الدین
احمد بلخی صاحب کا ۱۹؍فروری قریب ۸؍بجے شب کو انتقال ہو گیا۔ خدا
انہیں جنت نصیب کرے۔ ۲۰؍فروری دن کے گیارہ بجے انہیں سپرد
خاک کیا گیا۔

رہے نام اللہ کا

بلخی صاحب کے چھوٹے بھائی سید محمد اسحاق سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب وہ میڈیکل کالج پٹنہ کے طالب علم تھے۔ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ "جانچ گھر لین" والے مکان میں رہتے تھے۔ (اس زمانے میں یعنی ۳۵۔۳۶ء میں نہ وہاں جانچ گھر تھا نہ اس نام کی کوئی گلی تھی) یاد آتا ہے کہ اس گھر میں بلخی صاحب کے چھوٹے برادر نسبتی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ اسحاق صاحب سے کم عمر تھے لیکن یہ بھی میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ سید حمید سجاد یا سید زاہد سجاد یا ایسا ہی کوئی نام تھا۔ دبلے پتلے، گورے خوبصورت آدمی تھے۔ عینک لگاتے تھے اور سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ اب یہ یاد نہیں، یہ بھی اسی مکان میں بلخی صاحب کے ساتھ رہتے تھے یا ہوسٹل میں رہتے تھے اور ان لوگوں سے ملنے کو جاتے تھے۔ انہیں پھر کہیں نہیں دیکھا۔

خاندان کے اور لوگوں کی طرح اسحاق صاحب بھی شاعر تھے۔ واقف تخلص کرتے تھے۔ غزلیں بھی لکھتے تھے اور نظمیں بھی جو اکثر مسدس کی شکل میں ہوتی تھیں۔ کہتے تھے کہ ابتدا میں وہ سید عزیز الدین بلخی رازؔ مرحوم سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ 'فطرت' (جو راج گیر سے سید صبا رشیدی شائع کرتے تھے) اور ندیم، میں جس کے ایڈیٹر انجم مان پوری تھے، واقف بلخی کے منظومات دیکھے تھے۔ لیکن ان سے پہلی ملاقات سائنس کالج کی بزم سخن یا پٹنہ کالج کی بزم ادب میں ہوئی تھی۔ سینٹ ہال میں ان ادبی انجمنوں کے سالانہ جلسے ہوتے تھے، ان میں انہیں اپنا کلام پڑھتے ہوئے سنا۔ انعامی مقابلوں میں ان کا انعام لینا بھی یاد آتا ہے۔

میں اس زمانے میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تعلیم پارہا تھا۔ ابھی انگریزی شروع نہیں کی تھی۔ نثر و نظم دونوں کا شوق تھا۔ بزم ادب کے انعامی مقابلے میں شریک ہوا اور اردو صحافت، بہار میں اردو نثر، اور شاد عظیم آبادی، پر مضامین لکھ کر اول انعامات حاصل کئے۔ صحافت والا مضمون بہت طویل تھا۔ افسوس کہ بزم ادب والوں سے ضائع ہوگیا۔ بہار میں اردو نثر، بہت دنوں تک پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو میں محفوظ تھا۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے ایک مضمون میں (جو معاصر میں اور بعد کو ان کے مضامین کے مجموعے میں شائع ہوا) اس مضمون کا حوالہ دیا ہے۔

قاضی محمد سعید کے مضمون... مطبوعہ رسالہ ندیم گیا میں بھی اس کے حوالے ہیں۔ یہ مضمون بھی گم ہوگیا۔ شاد عظیم آبادی، پر میرے مضمون کے ممتحن مولانا عبدالباقی خاں بی اے (جامعہ سابق مدیر اخبار آزاد (لاہور) تھے۔ انہوں نے اس پر بہت اچھی رائے لکھی تھی۔ وہ میں نے دیکھی تھی۔ مضمون تو یہ بھی وہیں سے ضائع ہوا لیکن اس کا ایک حصہ اسی زمانے میں رسالہ عالمگیر لاہور میں شائع ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بزم ادب، پٹنہ کالج نے ''شاعر'' پر بہترین نظم کے لئے عبدالمنان بیدلؔ میڈل، دیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں ؛ بزم سخن، سائنس کالج کے سالانہ جلسے میں نعت سرور عالم پر افسر الدین میڈل اور، بغاوت، پر منیر الہدیٰ میڈل تفویض کیا تھا۔ اس زمانے میں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتا تھا۔

سید محمد اسحٰق بلخی سے کسی وجہ سے جواب یاد نہیں، رابطہ منقطع ہوگیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۱۹۶۵ء میں انہوں نے نسبتاً کم عمری میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

ان کے کچھ اعزا کراچی میں ہیں۔ وہیں سے سال دو سال پہلے ان کا مجموعہ کلام، برگ خزاں رسیدہ، شائع ہوا ہے۔

صفحات بالا میں ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب کی فرمائش پر بہار میں خاندان بلخیہ کے ان ارباب علم واصحاب قلم کا ذکر کیا گیا جن کی خدمت میں مجھے حاضری کا شرف حاصل رہا۔ ان سے میرے ذاتی تعلقات رہے۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ۔ یہ یادداشت قلم برداشتہ ارتجالاً لکھی گئی ہے۔ مقصد یہ کہ آئندہ والی نسل اپنے بزرگوں کو یاد رکھے اور ان کے کارناموں سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ درمیان میں کہیں کہیں اور باتیں بھی یاد آتی گئیں اور وہ بھی سپرد قلم ہوتی رہیں کہ یہ بھی محفوظ ہو جائیں۔

☆☆☆

ش۔م۔عارف ماہر آروی

بہار کے بلخی حضرات کی اردو خدمات

بلخ افغانستان کے شہر مزار شریف کے مشرق کی طرف ۲۲ کیلو میٹر پر ۶۷ درجہ مشرقی طول البلد اور ۳۶.۴۵ شمالی عرض البلد پر واقع تھا۔(۱) اس کا یونانی نام Baktra تھا جسے قدیم یونانی Baxtpa کہا کرتے تھے۔ مگر دارا نے اس کو باخترس Baxtirs لکھا ہے اس کا محل وقوع بحر خزر (Caspian Sea) سے مشرق اور ماوراء النہر (صغد) کے جنوب قندھار و سیستان (Aracosia) کے شمال میں تھا۔ ایرانی فرماں رواخورس (۲) (خسرو یا سائرس) جس کی فتوحات مغرب میں ایشیائے کوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہوئیں۔ نیز شمال میں قفقاز (Cauassia) تک بھی پھیلی۔ اس کا زمانہ عروج ۵۴۹ قبل مسیح کے قریب کا زمانہ تھا۔ اس نے مغرب کی جانب ملک پر ملک فتح کر کے آخری سرے تک قبضہ کر لیا۔

یونانیوں کے عروج کے قبل میڈیا (الجبال) اور فارس (میڈیا کا مشرقی حصہ) کی متحد سلطنت کو مینڈھے کی شکل میں حضرت دانیال نے خواب میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (Horns) تھے۔ ذوالقرنین کے معنی بھی دو سینگوں والا کے ہوتے ہیں جس کی تصدیق بائبل بھی کرتی ہے۔

عہد قدیم میں باختر نام کی کوئی جگہ سکندر کی فتح کے پہلے نہ تھی۔ سکندر کی فتح کے بعد باختری ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے اس کا نام باختر سامنے آیا جو Kushan کے زمانہ میں بدھ مت کی عبادت گاہ تھی۔ ہوان سنگ ۶۲۸ عیسوی میں جب وہاں گیا تھا تو اس نے اس شہر کے باہر جنوب کی طرف نو بہار یا نو وہار جو بدھ مذہب کے منادر کا مجموعہ تھا، دیکھا تھا۔ ان مندروں میں جانے کے لئے اس پھاٹک سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا جو نو بہار کہا جاتا تھا۔ یہ منادر

دریائے بلخاب کے کنارے آباد تھے جو شہر کے بیچ سے گذرتا تھا۔ بلخاب شمال میں ترمذ کی طرف بہتا تھا۔ اس سے بارہ نہریں نکالی گئی تھیں۔ بلخاب آمودریا (جیحون) سے جاملتا تھا اور جیحون سے بارہ فرسخ کے فاصلہ پر بلخ تھا۔

کوامک ترکوں کے زمانہ میں بلخ ایک ترک شہزادہ (طغارستان کے بیغو) کی حکومت کے زیراثر تھا۔ ۶۵۳ عیسوی میں خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ نے احنف بن قیس سے اس کا محاصرہ کرا کر تاراج کر دیا اور اس کے گیارہ سال بعد ۶۶۴ عیسوی میں قیس بن ہشم نے شہر پر قبضہ کر کے نوبہار کو تباہ اور اس کے گنبدوں کو مسمار کر دیا۔ برمک نے جو نوبہار پر حکمراں تھا عربوں کی اطاعت قبول کر لی۔ بعد میں تورکش بیگی نیزک ترخاں نے جوسیستان (Aracoia) اور طاس ھلمند کا بادشاہ تھا اس نے عربوں کے قبضہ سے چھڑا لیا اور وہاں کے برمکی فرماں روا اور اس کے اہل خاندان کو قتل کر دیا مگر خوش قسمتی سے خالد (۳) کا باپ (۴) بچ گیا جو بعد میں وزرائے عباسیہ کا مورث اعلیٰ ہوا۔

قتیبہ بن مسلم کے زمانہ (۷۱۰ عیسوی) تک بلخ یک بعد دیگرے مختلف لوگوں کے قبضہ میں آتا جاتا رہا۔ عربوں نے اپنی حفاظتی فوجیں شہر سے ۳ فرسخ مشرق کی طرف برقان میں رکھی تھی۔ ۷۲۵ عیسوی میں خراسان کے والی اسد بن عبداللہ القسری نے اپنی حکومت مرو سے بلخ منتقل کر دی اور شہر کی تعمیر شروع کی۔ اس کے بعد داؤد بن عباس جو بلخ کا خودمختار حکمراں تھا اس نے بلخ میں ایک عظیم الشان محل ''نوشاد'' بنوایا مگر اس کی حکمرانی ۸۷۱ عیسوی میں یعقوب بن لیث نے ختم کر دی اور ''نوشاد'' بھی منہدم کر دیا۔ ۹۰۰ عیسوی میں بلخ سامانیوں (۵) کے زیرنگیں ہوگیا۔ سامانیوں کے دور میں بلخ دو حصوں میں منقسم تھا۔ اندرون شہر مدینہ یہ شہرستان اور ربض مضافات شہر جو ایک بڑی نواحی بستی تھی دو حصوں میں آباد تھے اور دونوں کے درمیان فصیل تھی۔

سامانیوں کے بعد ۱۰۰۶ عیسوی میں غزنویوں کا دور آیا۔ محمود غزنوی (متوفی ۱۰۳۰ عیسوی) نے مرنے کے ایک سال پہلے موسم سرما بلخ میں گذارا تھا (۶) محمود غزنوی کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا اور اس کا جانشین اس کا بھائی محمد ہوا۔

۱۰۴۰ عیسوی میں بلخ پر چغری بے نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلخ سلجوقیوں کے قبضہ میں آ گیا مگر ۱۱۶۵ اور ۱۱۹۸ کے درمیان بلخ پر قرا ختائیوں کا قبضہ ہو گیا پھر ۱۱۹۸ میں بلخ کے حکمراں

غوری ہو گئے لیکن کچھ ہی سالوں بعد ۱۲۰۶ میں خوارزم شاہ نے اس پر قبضہ کرلیا اور آخر کار ۱۲۲۰ میں چنگیز خاں نے اس پر حملہ کر کے تباہ و برباد کرڈالا۔ اس تباہی و بربادی پر بلخ کے امیر ابوالحسن یمن الدین المعروف بہ امیر خسرو (پ ۱۲۵۲۔ف ۱۳۲۴ء) کے والد امیر سیف الدین محمود ہجرت کر کے ہندوستان آرہے اور آگرہ کمشنری کے ضلع ایٹہ کے پیٹالی میں آباد ہو گئے۔

غزنویوں کے عہد میں سلطنت غزنی کا دار الخلافہ غزنی رہا مگر ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کی نگرانی کے لیے محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے نیالتگین کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا چنانچہ ابراہیم غزنوی (۱۰۹۶-۱۰۵۹) کے زمانہ میں بلخ، بخارا اور ایران کے مختلف علاقوں سے اہل علم کھنچ کھنچ کر لاہور آنے لگے۔ ۱۱۹۳ میں سلطان محمد غوری نے ترائین کی جنگ میں فتح حاصل کر کے ہندوستان کے مغربی علاقوں پر قبضہ کرلیا اور ان علاقوں کی دیکھ بھال کے لیے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کے بعد آرام شاہ نائب ہوا مگر امرائے سلطنت نے التمش کو ۱۲۱۰ میں تخت نشین کر دیا اس زمانہ میں حضرت نظام الدین اولیاء کا طوطی بول رہا تھا۔ التمش کے بعد کئی سلطان ہوئے حتی کہ ۱۲۳۶ میں غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا۔ اس کا کوکب شاہی مولانا برہان الدین بلخی تھے جو بلبن کے مشیر خاص بھی تھے۔ بلبن کو اس کے فرزند شہزادہ فخر الدین محمد جوناں خاں عرف الغ خاں نے بنگال (لکھنوتی) کی مہم سے واپسی پر دلی کے نزدیک افغان پور میں فروری مارچ ۱۳۲۵ میں چالاکی سے قتل (۷) کرا کر خود محمد بن تغلق کے نام سے سلطان بن بیٹھا۔ اسی سلطان کے عہد میں مولانا شمس الدین بلخی ہندوستان تشریف لائے۔ آپ حضرت ابراہیم ادھم بلخی (۸) کی ساتویں پشت میں تھے یعنی شمس الدین بلخی بن علی بلخی بن حمید الدین بلخی بن سراج الدین بلخی بن سید بزرگ بلخی بن سلطان محمود بلخی بن ابراہیم ادھم بلخی۔ ہندوستان آنے پر حضرت شمس الدین بلخی دربار دلی میں کسی ممتاز عہدہ پر فائز ہو گئے مگر دربار کی کسی حرکت پر منغص ہو کر تارک الدنیا ہو گئے اور بہار شریف چلے آئے کہ امیر شریف کے حضرت شیخ احمد چرم پوش'' کا شہرہ تھا چنانچہ حضرت چرم پوش'' نے حضرت شمس الدین بلخی کا استقبال کیا اور اپنا مرید وخلیفہ بنایا۔ امیر ہی میں اپنے پیرومرشد کے پہلو میں آپ کا مزار شریف ہے۔ بلخ روحانی وادبی اعتبار سے ہر دور میں سرفہرست رہا ہے۔ مولانا روم کا تعلق بھی بلخ

سے رہا ہے۔ ابوشکور بلخی ہی کے تصور میں پہلے پہل تاریخ گوئی کا خیال آیا چنانچہ اس کی مثنوی آفریں نامہ کے خاتمہ پر ایک تاریخ درج ہے جس سے ۳۳۳ برآمد ہوتا ہے:

چنین داستان کس نہ گفت از خیال
کہ سہ صد وسی و سہ بود سال

بہار میں بلخی حضرات کا سلسلہ حضرت شمس الدین بلخی کے ورود سے ہی شروع ہوتا ہے۔ آپ کے تین فرزند: حضرت مولانا مظفر بلخی، حضرت معز الدین بلخی اور حضرت شیخ قمرالدین بلخی تھے۔ آخر الذکر دونوں بھائی اپنے والد کے تربیت یافتہ اور حضرت چرم پوش کے مرید ہوئے مگر بڑے بھائی مولانا مظفر بلخی کو شرف بیعت حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰ منیری سے حاصل ہے۔ سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱-۱۳۷۴) نے آپ کی علمیت اور زہد وتقویٰ کی شہرت سن کر ایک کوشک میں درس وتدریس کی خدمت سپرد کی مگر کچھ دنوں بعد آپ اپنے پیر کی خدمت میں بہار شریف آرہے۔ آپ کو کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ آپ کے وصال ۷۸۸ / ۱۳۸۷ کے بعد آپ کے بھتیجہ حضرت شیخ الاسلام حسین نوشہ توحید بلخی بن حضرت معز الدین بلخی خلیفہ ہوئے اور انہیں کی آل واولاد آج بھی موجود ہیں جن کا ذکر پیش نظر مقالہ میں آئے گا۔

مولانا مظفر بلخی فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے۔ آپ کے فارسی مکتوب اور کلام دردائی نے نقل کئے ہیں۔ شاعری میں آپ برہان تخلص فرماتے تھے۔ چونکہ اہل تصوف کا واسطہ عوام سے براہ راست رہا اس لیے عوامی زبان میں رشد وہدایت کا کام بھی انجام پایا چنانچہ حضرت برہان کا ایک ریختہ دوہا بھی ملتا ہے جو یوں ہے۔

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں
جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائیں گتیاں

آپ ہی کے زمانہ میں بہار کے حضرت ملک (۹) بیو بن ابو بکر بن غوث الاعظم تھے جن سے بہار کی ملک برادری اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے اور انھیں اپنا مورث اعلیٰ تصور کرتی ہے۔

حضرت مظفر بلخی کا وصال بہ عہد فیروز شاہ تغلق ۷۸۸ / ۱۳۸۷ میں ہوا۔ آپ کے خلیفہ آپ کے بھتیجہ حضرت حسین نوشہ توحید بلخی بن حضرت معز الدین بلخی برادر خرد حضرت مظفر بلخی

ہوئے۔ چونکہ حضرت مظفر بلخی کے پیرو مرشد حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری سلسلہ فردوسیہ (۱۰) میں خلافت یافتہ تھے اس لیے حضرت شرفا سے جو سلسلہ چلا وہ فردوسیہ کہلاتا ہے۔ اسی مناسبت سے بلخی حضرات فردوسی لکھتے ہیں۔

ولادت ظفر آباد میں ہوئی۔ اور وصال ۲۴ ذی الحجہ ۸۴۴ / ۱۴۴۰ء بہ عہد سید خاندان کے سلطان محمد شاہ (متوفی ۱۴۴۵) میں ہوئی۔ حضرت نوشہ توحید کو بھی شعر و سخن سے شغف تھا مگر آپ کا کلام فارسی زبان میں ہی دستیاب ہے۔ آپ کے دو صاحبزادے، حضرت حسن دائم جشن بلخی فردوسی اور حضرت سلیمان تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد حضرت حسن دائم جشن بلخی خلیفہ ہوئے۔ آپ اپنے والد کی طرح فارسی میں صاحب تصنیف تھے۔ آپ کا وصال ۲۹ شعبان ۸۵۵ / ۱۴۵۲ء کو ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت مخدوم شیخ احمد لنگر دریا بلخی فردوسی مسند خلافت فردوسیہ پر متمکن ہوئے۔ آپ کی ولادت ۸۲۶ / ۱۴۲۳ء کی ہے، آپ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا دیوان فارسی مطبع حنفیہ پٹنہ سے طبع شدہ ہے۔ تخلص احمد تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے آپ پر ڈاکٹر احسن امام صاحب نے .Ph.D کی ڈگری لی ہے۔ حضرت لنگر دریا کا وصال ۱۹ ر رمضان ۸۹۱ / ۱۴۸۶ء کو ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت مخدوم ابراہیم سلطان بلخی فردوسی خلیفہ و مجاز ہوئے۔ آپ کا وصال بھی بقول دردائی مرحوم ۱۹ ر رمضان ہی کو ۹۱۴ ہجری بمطابق ۱۱ جنوری ۱۵۰۹ (۱۴) میں ہوا۔ آپ کے بعد شجرہ عالیہ فردوسیہ کی کئی شاخیں نکلیں ہیں۔ آپ کے وصال کے بعد ۱۵۰۹ء میں آپ کے صاحبزادے حضرت مخدوم حافظ درویش بلخی خلیفہ ہوئے مگر آپ از راہ احترام و محبت حضرت مخدوم الملک کے خاندان کے ایک فرد حضرت مخدوم شاہ محمد بھیکن کو خانقاہ مخدوم الملک کی سجادگی پر بجائے خود بٹھا کر علیحدہ ہو گئے۔ اب بجائے بلخی حضرات کے سجادگی خانقاہ معظم مخدوم الملک کے خاندان میں تا دم تحریر چلی آتی ہے۔ (۱۵) بلخی حضرات نے سلسلہ فردوسیہ کی ایک شاخ بھی قائم رکھی جو سلسلہ بلخیہ کہلاتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت درویش بلخی (۱۶) کے خلیفہ حضرت شاہ رکن الدین بلخی منیری ہوئے جن کے صاحب زادے ملک العلما مخدوم شاہ بڑن در عہد شیر شاہ (۱۵۴۰-۱۵۴۵) تھے انھیں سے شیر شاہ مرید بھی ہوا اور اسی نے اپنے مرشد کو قتل بھی کر دیا کہ

مرشد کی پیشین گوئی کہ اسے دلی کا تخت ملے گا کچھ عرصہ تک پوری نہ ہوسکی لہٰذا غصہ میں آکر شیر شاہ نے انھیں قتل کر دیا مگر بعد میں جب وہ سلطنت دلی پر متمکن ہوا تو سخت پشیمان ہوا۔

حضرت مخدوم حافظ درویش بلخی کے بعد تقریباً آٹھ پشتوں (مخدوم ابراہیم بلخی (۱)، مخدوم جنیدی، (۲) مخدوم دیوان (۳) سید معین الدین بلخی، مخدوم دیوان شاہ محمود شاہ بلخی (۴)، مخدوم فخر الاسلام بلخی (۵)، مخدوم سید شاہ فہیم الدین بلخی (۶)، مخدوم قاضی سید طہارت التوحید بلخی (۷)، سید محمد واجد بلخی (۸) تک شعری یا نثری تصنیف وتالیف کا سراغ نہیں ملتا۔ پھر نویں پشت میں ڈاکٹر سید غیاث الدین بلخی کے چاروں صاحب زادوں، سید فصیح الدین بلخی، سید حفیظ الدین بلخی، سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی اور نظام الدین بلخی سے سلسلہ شعر وسخن اور نثری تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید غیاث الدین بلخی ابن سید محمد واجد بلخی منصف کے بڑے صاحب زادے سید حفیظ الدین بلخی تھے۔ آپ کی ولادت تقریباً ۱۸۷۶ء کی تھی۔ آپ کو شعر وسخن میں ایسا ملکہ تھا کہ غزلیں کہہ کہہ کر خوب تقسیم کیا کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "تحفہ بہار" اپنی اور اپنے مخلص دوست فہیم الدین احمد فہیم کی ادارت میں نکالا تھا جس میں داغ کی غزلیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ وفات ۱۹۳۶ء میں بہ عمر ساٹھ برس برما میں ہوئی اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔ آپ کا ایک اردو شعر ملاحظہ ہو:

پھر عالم خیال ہے جولان گہہ امید
ناکامیوں سے تنگ دل منتشر نہ ہو

حفیظ بلخی سے چھوٹے سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی تھے۔ آپ شاعر، ادیب، ناقد اور محقق تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ خاص زمین نکالنے میں طاق تھے۔ ۱۹۰۴-۱۹۰۵ میں ایک ادبی رسالہ موسوم بہ "رفتار زمانہ" پٹنہ سے جاری کیا تھا جس کو نواب محسن الملک سکریٹری علی گڑھ کالج کی حمایت حاصل تھی۔ تذکرہ شعرائے بہار ۱۳۵۰/۱۹۳۱ء میں تالیف کیا تھا جس میں ۱۱۵۰/۱۷۳۸ء سے ۱۳۰۰/۱۸۸۳ء (ایک سو پینتالیس برس) تک بہار کے تقریباً تین سو اردو شعرا کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہیں۔ آپ کا وصال ۱۹۳۵ء میں

ہوا۔ نمونۂ کلام اردو ملاحظہ ہو:

بادۂ نو کا ابھی ذکر ہی کیا ہے ساقی
آخری جام بھی تلچھٹ کا تو چل لے پہلے
آتے آتے مرے گھر تک وہ بھٹک جاتے ہیں
ملتے ہیں راہ میں غیروں کے محلے پہلے

اور اب ایک غزل ملاحظہ کیجئے:

آنکھیں لڑا کے دل سے بڑھاتی ہے میل تو
کیا ہی نگاہ یار ہے دیدہ دلیل تو
سایہ کی طرح ناقۂ لیلیٰ بھی ساتھ ہو
اے جذب شوق قیس جو کھینچے نکیل تو
اے دل ان کی آنکھ سے کبھی چشم وفا نہ دکھ (کذا)
نادان! ان تلوں نہیں پائے گا تیل تو
اے قیس راہ عشق کی تکمیل ہم نے کی
جادہ پہ رکھ گیا تھا فقط داغ بیل تو
صبح شب وصال پہ کہتا گیا وہ شوخ
گر عیش اٹھائے ہیں تو مصیبت بھی جھیل تو
منڈھتا ہے راز عشق کو اپنے گلے عبث
ناداں! منڈھے چڑھا نہ سکے گا یہ بیل تو

قوافی کی ندرت، ردیف کی جدت اور مشکل زمین کی ناہمواری کے باوجود رازؔ صاحب کی غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔

رازؔ عظیم آبادی سے چھوٹے سید نظام الدین بلخی تھے۔ ۲۲ / مارچ ۱۸۸۲ء کو پٹنہ کے بخشی محلہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم پائی۔ حکیم صوفی کے مدرسہ میں داخل ہوئے جہاں سے اردو اور فارسی کی تعلیم پا کر پادری کی حویلی پٹنہ کی Sister Nakido

Biniv سے انگریزی زبان سیکھی اور محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۰۰ عیسوی میں اول درجہ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ تاریخ اور جغرافیہ میں سب سے زیادہ نمبر لانے کے صلہ میں کلکتہ یونیورٹی نے سونے کا تمغہ دیا۔ انٹرنس کے بعد پٹنہ کالج میں .F.A میں داخلہ لیا مگر والد کی وفات کے سبب کالج چھوڑ کر ۱۹۰۷ میں مولانا شجاعت علی خاں کی وساطت سے پٹنہ سٹی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ۱۹۳۸ میں گردنی باغ ہائی اسکول پٹنہ میں تبادلہ ہو گیا اور وہیں سے ۱۹۴۲ میں بہ عمر ساٹھ سال سبک دوش ہوئے۔ شعر و سخن کا شوق مدرسہ کی تعلیم کے وقت سے ہی تھا۔ بذریعہ خط و کتابت داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے خود فرماتے ہیں:

جناب داغؔ کا یہ فیض کم نہیں بلخیؔ
سخن زباں کے لیے ہے زباں سخن کے لیے

بلخیؔ اور نظامؔ دونوں تخلص میں غزلیں نظر آتی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

فسردہ دل ہے نہ خلوت نہ انجمن کے لیے
یہ پھول بھی ہو تو کانٹا ہے ہر چمن کے لیے

پہن لیا تھا کسی وقت جامۂ ہستی
اجل کھڑی ہے اسی جامۂ کہن کے لیے

اجل پلٹ گئی منھ پھیر کے جو یہ دیکھا
کہ ایک تار بھی باقی نہیں کفن کے لیے

نمودِ صبح پہ کیا حال شمع کا ہوگا
تمام رات جو روئے گی انجمن کے لیے

کچھ اور دیکھتا نہیں اس وصل ہجر میں
ان کی بہار اپنی خزاں دیکھتا ہوں میں

صدقے میں ماہ نو کے یہ آنکھیں تو مل گئیں
ان کی نظر جہاں ہے وہاں دیکھتا ہوں میں

بھلا ہو پیر مغاں کا کوئی سبو نکلے

کبھی تو دل سے فقیروں کی آرزو نکلے
یہ حوصلہ ہے رہیں دل کے حوصلے دل میں
یہ آرزو ہے کہ کوئی نہ آرزو نکلے
ہجوم عرصۂ محشر کی قید ہی کیسی؟
کہیں بھی بھیڑ، ابھی ہو، ابھی جو تو نکلے
مکاں کی قید نہیں لا مکاں کی شرط نہیں
وہی بہشت ہے اپنی جہاں پہ تو نکلے
چلا ہے شوق شہادت میں آج پھر بلخی
الٰہی کوچۂ قاتل سے سرخ رو نکلے
قیامت ہے شفاعت ڈھونڈتی پھرتی ہے بلخیؔ کو
کوئی اتنا تو ہو کمبخت کو اسکی خبر کردے
سراپا عشق ہے بلخیؔ سراپا دل نہ بن جائے
بھرا گھر لوٹ میں اجڑی ہوئی منزل نہ بن جائے
الٰہی الاماں رازِ دل افسانہ ہوتا ہے
قیامت ہے قیامت آشنا بیگانہ ہوتا ہے
تڑپنا، لوٹنا، اٹھنا، سنبھلنا، جان سے جانا
پریشانی میں جو ہوتا ہے بے تابانہ ہوتا ہے
کوئی ہے بوالہوس دل سے کسی کو عشق صادق ہے
کوئی دیوانہ بنتا ہے کوئی دیوانہ ہوتا ہے
تغزل اب کہاں فیض جناب داغؔ ہے بلخیؔ
تمہارا شعر جو ہوتا ہے استادانہ ہوتا ہے
اسی کو وہ بھری محفل میں فرزانہ سمجھتے ہیں

جو ہستی کو عدم، عالم کو افسانہ سمجھتے ہیں
کچھ ایسی خودنمائی ہے کچھ ایسے آپ بے خود ہیں
نہ آبادی سمجھتے ہیں نہ ویرانہ سمجھتے
بس اتنا دیکھ لیتے ہیں پیالہ اب چھلکتا
صراحی جانتے ہیں ہم نہ پیمانہ سمجھتے
یہ داغ معصیت وہ ہے جو چمکے گا قیامت میں
ہم اپنے داغ کو جنت کا پروانہ سمجھتے ہیں
سمجھنے والے وہ ہیں جانتے ہیں عاشقی کیا ہے
نظام الدین بلخی کو جو دیوانہ سمجھتے ہیں

سید نظام الدین بلخی کو چار فرزند، سید شفیع الدین بلخی مرحوم، سید قیام الدین بلخی، سید اکرام الدین بلخی، اور حسام الدین بلخی ہوئے۔ شفیع الدین بلخی مرحوم کے فرزندوں میں شمس الدین بلخی، محی الدین بلخی، اور معز الدین بلخی المتخلص بہ خادم بلخی آروی ہیں۔ قیام الدین بلخی ہجرت کر کے کراچی چلے گئے۔

ڈاکٹر سید غیاث الدین بلخی کے سب سے چھوٹے فرزند سید فصیح الدین بلخی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۵ کی تھی۔ وفات ۱۲؍ مارچ ۱۹۶۲ کو ہوئی۔ تاریخ نگاری، تذکرہ نویسی اور تحقیق میں یکتائے روزگار تھے۔ تاریخ مگدھ (۶۴۲ قبل مسیح سے ۱۹۴۳ تک) 'تذکرہ نسوان ہند' اور 'پٹنہ کے کتبے' آپ کی تحقیقی تخلیق ہیں۔ شعر و سخن سے بھی متعلق رہے ہیں۔ تنقیدی رسالہ ''انشاد شاذ'' بھی آپ ہی کی تصنیف ہے۔ وارثوں میں پروفیسر الحاج نادم بلخی آپ ہی کے صاحب زادے ہیں جن کے صاحب زادے پروفیسر مظفر بلخی نے اپنے دادا جان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے جو ۱۹۸۸ میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ حضرت فصیح الدین بلخی کی اردو شاعری کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

یوں دل کی آرزو دل مضطر میں رہ گئی
آندھی سی اٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ ناز
پابند وہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی
دل امتحان بوئے وفا میں تو جل گیا
خوشبو کسی کی زلف معنبر میں رہ گئی
راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی

دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی
یوں خاک میں جو چاند سی ملتی ہیں صورتیں
اک دفعہ آسماں سے زمیں مل ہی جائے گی
کس کس طرح سے ہم نے چھپایا ہے راز عشق
داد اس کی تجھ سے پردہ نشیں مل ہی جائیگی

☆

دل پر اثر جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے
تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے
کیا کم یہ فائدہ تھا کہ دشمن نہ تھا کوئی
نقصان عیب سے بھی ہنر میں زیادہ ہے
انسان اس جہاں میں برابر ہیں سب فصیح
کم ہے نہ کوئی اپنی نظر میں زیادہ ہے

اب ایک مکمل غزل دیکھئے جو ۱۹/اپریل ۱۹۶۱ کو ''حلقہ شعر و سخن'' ڈالٹین گنج کی ۲۵ ویں طرحی نشست میں پڑھی گئی:

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو
پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو
جب تک نگاہ شوق کو لپکا ہے دید کا
ممکن نہیں کہ دل کی کوئی روک تھام ہو

دنیا ہے رہ گذر پہ ٹھہرنے کی جا نہیں
گھر کی طرح کسی کا یہاں کیا قیام ہو

اس عالم خراب کو جنت بنایئے
دنیا میں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کام ہو

آشفتہ سر ہوں مجھ کو غرض بوئے گل سے کیا
ہو زلف مشک بو تو معطر مشام ہو

میں انجمن میں شمع کا پروانہ کیا بنوں
کیوں اس سے لو لگاؤں جو صورت حرام ہو

موقوف حشر ہی پہ نہیں کچھ ہجوم خلق
تو جلوہ گر جہاں ہو وہیں ازدحام ہو

خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے
آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

دل پرشش نگاہ سے گھبرائے کس لیے
اس کی رضا سے عفو ہو یا انتقام ہو

کیا فاقہ مستیوں میں ملے لطف زندگی
یکساں ہے روز عید کہ ماہ صیام ہو

اپنی زبان پہ حرف نہ آئے کبھی فصیح
روح القدس بھی ہم سے اگر ہم کلام ہو

حمید الدین بلخی ابن سید خواجہ فخر الدین بلخی، ڈاکٹر غیاث الدین بلخی ابن سید محمد واجد بلخی بھی منصف تھے۔ حمید صاحب بہ زمانہ غدر ۱۸۵۷ سہسرام میں منصف تھے اور آپ کے بھائی واجد بلخی اسی عہد میں بتیا کے وسگولی میں منصف ہی کی عہدہ پر فائز تھے، آپ کی وفات ۱۸۷۸ میں ہوئی۔ حمید الدین بلخی کی وفات ۱۸۶۷ میں سہسرام میں ہی ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ شاعری سے بھی آپ کو شغف تھا۔ ۱۹۲۲ میں گیا کے آل انڈیا کانگریس کے مشاعرہ میں جس کی

صدارت حضرت سیمابؔ نے کی تھی شریک بزم تھے۔ کلام تاج کے گلدستہ میں مطبوعہ ہے۔ لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ کے وارثوں میں خواجہ فیاض بلخی ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کے بڑے بھائی سید شرف الدین بلخی تھے۔ آپ بھی اردو کے باکمال شاعروں میں تھے۔ قمر تخلص فرماتے تھے۔

ڈاکٹر سید غیاث الدین بلخی کی صاحب زادی کے فرزند سید غلام بدر الدین اسحاق بلخی بھی اردو شعر وادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ کے بعد کراچی ہجرت کر گئے۔ ولادت ۲۵/دسمبر ۱۹۱۲ء کی تھی، وفات ۳/جنوری ۱۹۶۵ کو کراچی میں ہوئی۔ واقف تخلص تھا۔ مجموعہ کلام ''برگ خزاں رسیدہ'' کراچی سے مئی ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے، آپ سے بڑے بھائی جمال الدین بلخی تھے اور جناب جمال کے بعد یوسف الدین بلخی تھے۔ اس طرح جناب اسحاق بلخی بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، یوسف الدین بلخی، واقفؔ سے بڑے تھے۔ آپ کو بھی اردو شعر وادب سے خاصا تعلق تھا۔ چنانچہ باطن تخلص فرماتے تھے۔

اکرام، قیام الدین اور شجاع الدین بلخی تینوں بھائی حضرت نظام الدین بلخی کے صاحب زادے تھے۔ تینوں بھائی شاعر تھے۔

سید شرف الدین بلخی ابن سید محمد واجد بلخی منصف (متوفی ۱۸۷۸) کے دوسرے صاحب زادے تھے۔ آپ سے بڑے سید ڈاکٹر غیاث الدین بلخی تھے۔ سید شرف الدین بلخی کا تخلص قمر تھا۔

مولوی غازی الدین بلخی کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ کا دیباچہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی (۱۹) کی تصنیف ''شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز لکھنوی (۲۰)'' میں مرقوم ہے۔ کچھ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''... جس میں عزیز لکھنوی کی مصنوعی شاعری کی قلعی کھول کر محققانہ
> انداز سے داد تنقید دی گئی ہے۔''

دیباچہ ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے جسے انیس اشفاق صاحب (پ ۱۹۵۲) ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنی تصنیف ''احب کی باتیں'' (۲۱) میں یگانہ چنگیزی کا ہی لکھا ہوا تسلیم کیا ہے۔ (۲۲)

جمال الدین بلخی برادر یوسف بلخی باطنؔ، مولانا سید شاہ صدر الحق بلخی اور رفیع الدین بلخی جن کی تصنیف ''تجزیۂ کلام غالبؔ'' کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔ پھر حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوحہ حال مقام محلہ عالم گنج پٹنہ بھی صاحب علم و فن ہیں۔ آپ نے ندوہ سے تحصیل علم کیا۔ طبیہ کالج پٹنہ سے بہ عہدہ پرنسپل سبک دوش ہوئے۔

موجودہ دور میں سید ابراہیم بلخی بن سید فصیح الدین مرحوم بھی صاحب علم اور شاعر ہیں۔ نادمؔ تخلص فرماتے ہیں۔ اردو شاعری کے تقریباً تمام اصناف اور ہیئت میں داد سخن دی ہے۔ ولادت ۱۹۲۸ کی ہے۔ ۱۹۵۳ میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ڈالٹین گنج کے محلہ کنڈ میں بسیرا ہے۔ ۱۹۹۵ میں حج بیت اللہ سے بھی فارغ ہوئے۔ علم العروض پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ فن شعر میں صنائع و بدائع، زبان و محاورات پر دسترس ہے۔ چھریرے جسم پر صبیح صورت اور میانہ قد پر بے تکلفی اور سادگی پسندی زیب دیتی ہے۔ اخلاق حمیدہ سے متصف ہیں۔ غزل، نظم، نعت، منقبت، رباعی، دوہے، پہیلیاں، ہائیکو وغیرہ کے مجموعے طبع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ آغاز سحر، مطبوعہ ۱۹۶۱

۲۔ ذوق سفر (غزلوں، نظموں کا مجموعہ) مرتبہ احمد یوسف مطبوعہ ۱۹۷۹

۳۔ دوپہر کا دائرہ (غزلوں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۴

۴۔ تحفے (بچوں کے لیے) مطبوعہ ۱۹۸۵

۵۔ دھوپ میں صحرا نوردی (غزلوں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۷

۶۔ لفظوں کا حصار (رباعیوں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۸

۷۔ جیون درشن (دوہوں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۹

۸۔ شعاع نقد (تنقیدی مضامین) مطبوعہ اگست ۱۹۹۳

۹۔ میٹھی میٹھی بولیاں (دوہے) مطبوعہ اپریل ۱۹۹۴

۱۰۔ ضیائے عرفاں (نعت و منقبت) مرتبہ مصطفےٰ بلخی گویا مطبوعہ ۱۹۹۵

۱۱۔ باطنی ارتعاش مطبوعہ اگست ۱۹۹۶

۱۲۔ بچوں آؤ پہلی بوجھیں (پہیلیوں کا مجموعہ) مطبوعہ دسمبر ۱۹۹۷

۱۳۔ ترلوک (ہائیکو) مطبوعہ ستمبر ۱۹۹۸

جناب نادم بلخی کے وارثوں میں تین فرزند ہیں۔ بڑے ڈاکٹر پروفیسر مظفر بلخی ڈالٹین گنج کالج میں درس وتدریس میں مشغول ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۴۹ کی ہے۔ تحقیق سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ نادم بلخی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مری گردن جھکی تھی مصلحت سے
وہ یہ سمجھے کہ سر خم ہو گیا ہے

تڑپ اٹھا تو سمجھانے سے پھر کب دل ٹھہرتا ہے
محبت میں یہی اک کام تو مشکل ٹھہرتا ہے

گرہ میں دام رکھتے ہوتو سودامل ہی جائے گا
تلاش حق میں ورنہ حق نہیں باطل خریدو گے (۲۳)

کبھی لیٹے کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی ٹہلے
یہی حالت رہی شب بھر یہی چاہا کہ دل بہلے (۲۴)

موت سے پہلے مار کے ہم کو اتنا کیوں اتراتے ہو
گیلی مٹی نرم بہت تھی ہاتھ لگایا کوڑ دیا (۲۵)

بات کیا بنتی اکہری بات سے
تالیاں بجتی ہیں دونوں ہاتھ سے (۲۶)

آندھیوں کی یورش میں گل نہ ہو تو کافی ہے
روشنی دکھانے کو شمع رہ گزر تنہا (۲۷)

اگر سر منڈاتے ہی اولے پڑیں
تو سمجھو مقدر کے گھاؤ میاں (۲۸)

خیمہ اگر حسین کا شعلوں کی زد میں آ گیا
پھیلا ہے نور دشت میں جلتی ہوئی قنات سے (۲۹)

حادثوں سے گریز کر لیکن
حادثے تو ڈگر ڈگر ہوں گے (۳۰)

نیند غائب ، آس ، فرقت ، انتظار
شب قیامت لمحہ لمحہ اک صدی

حمد الف سے ی تک ''تحفے'' کے صفحہ ۱۱ سے ۱۳ تک قابل داد ہے۔ اسی کے صفحہ ۸۰ سے ۹۳ تک ۵۱ پہیلیاں بھی درج ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں:

ایک معمہ جس کے اندر جنگل کا سردار
ریش الٹ کر اس کو دیکھو بوجھو میرے یار (شیر)

اجلا بھورا سبز چباؤ
منہ میں اپنے لالی پاؤ (پان)

ان پہیلیوں کے بعد ''آؤ بچو پہیلیاں بوجھیں'' الگ سے ایک مجموعہ پہیلیوں کا بھی شائع کیا ہے۔ جہاں تک ''لوری'' کا تعلق ہے پہلے پہل حضرت نادم بلخی نے ''تحفے'' میں چار لوریاں شائع کر کے اولیت کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔ صرف ایک لوری پیش کرتا ہوں:

آجا رے تو آجا رے تو آجا نیند یا
منا کو مرے جلد سلا جا نیند یا
جس سے مرے بچے کا ہو جیون جگ مگ
سپنا وہ حسین اس کو دکھا جا نیند یا

حمد، نعت، منقبت، کو رباعی کے پیراہن میں ''نقطوں کے حصار'' میں پیش کر کے قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک ایک نمونے حاضر ہے:

حمد: آئینہ ایام میں تو ہی تو ہے
حسن سحر و شام میں تو ہی تو ہے
اس گلشن عالم کو جدھر سے دیکھوں
ہر منظر گلفام میں تو ہی تو ہے

نعت: ہاں شاہ امم شاہ مدینہ تم ہو
کچھ بھی ہے وسیلہ تو وسیلہ تم ہو

میں کیوں نہ رکھوں آس، محمد تم سے
محشر میں شفاعت کا ذریعہ تم ہو

منقبت: سب کہتے ہیں تم قطب زماں ہو خواجہ
یعنی کہ نگہبان جہاں ہو خواجہ
یہ دور ہے مردہ اسے زندہ کردو
تم زندہ کن مردہ دلاں ہو خواجہ

رباعی میں ہی نانک، گرو گوبند سنگھ، اور گرو تیغ بہادر کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ''چودہ طبق'' میں ایقانی شاعری کو سانیٹ میں پیش کیا۔ طوالت کے پیش نظر نمونہ کلام پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ دوہے کے باب میں یہ عرض کرنا ہے کہ جناب نادم بلخی نے ۱۹۸۹ میں ''جیون درشن'' پھر ۱۹۹۴ میں ''میٹھی میٹھی بولیاں'' شائع کر کے نصیحت و عبرت کے مضامین کو صرف دو مصرعوں میں قید کر دیا ہے۔ صرف دو نمونے حاضر ہیں:

رکھنے والا شیشے کا گھر اتنا رکھ احساس
کوئی پاگل پتھر لیکر آئے نہ تیرے پاس

شکتی، بھکتی، شانتی، ایسے تینوں گیان
جن کے گیانی کو ملے مکتی کا استھان

حضرت نادم بلخی کو قطعہ تاریخ کہنے میں ملکہ حاصل ہے۔ حضرت مہجور شمسی کے وصال پر عیسوی اور ہجری دونوں میں تاریخ نکالی ہے۔ دونوں کا مصرعہ تاریخ (۳۲) ملاحظہ ہوں:

ع واصل حق حضرت مہجور ہیں آباداب ۱۹۷۴ء

ع محمد سے ملا جب خلد میں وہ نیر الاعظم

۹۲ + ۱۳۹۴=۱۳۰۲ھ

''ذوق سفر'' میں چند آزاد نظموں کے نمونے بھی نظر آتے ہیں جیسے چٹان، آپریشن واڈ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ نادم صاحب نے تنہا جتنی خدمت اردو کی کی ہے کم ہی لوگوں کو میسر ہوئی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد چہارم، ص ۷۵۷ خدا بخش نمبر Acc۱۸۳۲۵

۲۔ مولانا مودودی نے خورس کو ذوالقرنین کے قرین قیاس لکھا ہے (تفہیم القرآن جلد سوم درباب تفسیر سورۂ کہف)

۳۔ خالد کا عباسی وزیر فضل بن یحییٰ کا دادا تھا۔

۴۔ خالد کا باپ تورکش بیگی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گیا اور راسے کشمیر پہنچا دیا گیا جہاں اس نے بدھ مت کے وہاروں میں تعلیم پائی۔ اس کی شادی صغانیہ کے ترک فرماں روا کی بیٹی سے ہوئی جس کے بطن سے خالد پیدا ہوا۔

۵۔ حاکم بخارا اسمٰعیل نے خاندان سامانیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی وفات ۲۹۵ ہجری مطابق ۹۰۹ عیسوی میں ہوئی۔ اس کے بعد یہ خاندان ۱۳۰ برس حکمراں رہا، اسمٰعیل بن عبدالمالک اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ ۳۹۵ ہجری مطابق ۱۰۰۶عیسوی میں خاندان سامانیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی عہد سامانیہ میں شہید بلخی اور ابوشکور بلخی شعرائے فارسی گذرے ہیں۔ دونوں کا نمونۂ کلام علامہ شبلی نے شعر العجم ص ۴۸-۴۷ پر درج کیا ہے۔

۶۔ آب کوثر از شیخ اکرام ص ۶۲

۷۔ ابن بطوطہ

۸۔ حضرت ابراہیم ادھم بلخی بلخ کے بادشاہ تھے۔ آپ ہی بلخی حضرات کے مورث اعلیٰ ہیں۔ آپ حضرت علی کی پندرہویں پشت میں تھے۔ اپنے وقت کے بزرگ ترین اولیا کرام میں تھے۔ آثار بلخیہ از فصیح الدین بلخی اور تاریخ سلسلہ فردوسیہ از معین الدین دردائی میں آپ کا تفصیلی ذکر ہے۔ مخدوم شعیب کی کتاب ''مناقب الاصفیاء'' میں حضرت ادھم بلخی کا تذکرہ ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: حضرت ابراہیم ادھم بلخی بن حضرت امیر سلیمان بن سید ناصر بن محمد امیر سید یعقوب بن امیر سید حد بن امیر سید احمد بن سید اسحاق بن امیر سید زید بن سید محمد بن حضرت امام قاسم بن حضرت علی اصغر بن حضرت سیدنا امام زین العابدین بن حضرت سیدنا امام حسین بن امیر المومنین حضرت علی۔

۹۔ ملک بیو غزنی کے رہنے والے تھے۔ترک سکونت کر کے فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸) کے عہد میں ہندوستان آگئے اور سپہ سالار مقرر ہوئے۔راجہ ہنس سے رہتاس میں جنگ ہوئی اور فاتح ہونے کے باوجود ۱۳/ذی الحجہ ۷۵۳ ہجری مطابق ۱۳۵۳ عیسوی کو راجہ ہنس کے آدمیوں نے آپ کو مارڈالا۔آپ کا جسم خاکی بہار شریف لایا گیا جہاں ایک پہاڑی پر دفن ہوئے۔

۱۰۔ سلسلہ فردوسیہ کے ہندوستان تشریف لانے والے پہلے بزرگ حضرت خواجہ بدرالدین سمرقندی فردوسی تھے۔آپکے خلیفہ آپ کے وصال (۷۱۶/۱۳۱۷) کے بعد خواجہ رکن الدین فردوسی بن شیخ عماد الدین فردوسی ہوئے۔خواجہ رکن الدین فردوسی کا وصال (۷۲۴/۱۳۲۶) میں ہوا۔آپ کے بعد آپ کے برادر علاقی شیخ نجیب الدین فردوسی (متوفی ۷۳۳/۱۳۳۳) خلیفہ ہوئے۔آپ ہی کے خلیفہ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (پ ۱۳۲۳ء ف ۶/شوال ۷۸۲ ہجری مطابق ۱۳۸۱ عیسوی) ہیں جن سے سلسلہ فردوسیہ کو بہار میں فروغ حاصل ہوا۔

۱۱۔ مونس القلوب (قلمی) ص ۹۵-۲۹۴۔

۱۲۔ بہ حوالہ تاریخ سلسلہ فردوسیہ از سید معین الدین دردائی ص ۳۰۵۔

۱۳۔ سید خاندان کا بانی خضر خاں تھا۔اس نے آخری تغلق سلطان نصیرالدین محمود سے دلی کی سلطنت مئی ۱۴۱۴ء میں ہتھیالی۔اس کے بعد معزالدین مبارک شاہ پھر محمد شاہ اور آخری سلطان علاءالدین عالم شاہ ہوئے۔اس سے بہلول لودی نے سلطنت حاصل کر کے لودی خاندان کی حکومت قائم کی۔

۱۴۔ ذریعہ دولت

۱۵۔ تفصیل خلافت خانقاہ معظم بہار شریف از شاہ محمد بھیکن مضمون کے آخیر میں درج ہے۔

۱۶۔ حضرت درویش بلخی بن مخدوم ابراہیم سلطان بلخی فردوسی بقول احمد غزالی شرف اکاڈمی بہار شریف (مضمون مطبوعہ روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ ۱۶/اگست ۱۹۹۷) کے دو بڑے بھائی: حضرت حافظ بلخی اور محمود بلخی تھے نیز دوان سے چھوٹے بھائی۔شاہین بلخی اور دولت بلخی بھی تھے۔

۱۷۔ مقدمہ از پروفیسر الحاج نادم بلخی بر کتاب ''آغاز سحر'' مصنفہ عبدالقیوم مہجور شمسی سہسرامی مطبوعہ ۱۹۶۱۔
۱۸۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار حصہ اول مولفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی مطبوعہ ۲۷ ستمبر ۱۹۶۶ ص ۱۵۳۔
۱۹۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی 1913ء میں ایک معزز متوسط گھرانے میں لکھنؤ میں شادی کر کے وہیں رہ بس گئے۔ ان کی ولادت پٹنہ کے محلہ مغل پورہ میں ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۱ ہجری مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ کو ہوئی تھی۔ عظیم آباد کے سید علی خاں بیتاب عظیم آبادی اور پھر علی محمد شاد عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں صحت کی خرابی سے پٹنہ آ گئے۔ بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں لکھنؤ میں ان سے ادبی معرکہ آرائی ہوئی۔ لکھنؤ میں ہی وفات پائی اور وہیں منشی فضل حسین خاں کی کربلا میں مدفون ہوئے۔
۲۰۔ مطبوعہ ۱۹۲۵
۲۱۔ مطبوعہ ۱۹۹۶
۲۲۔ صفحہ ۶۵
۲۳۔ ذوق سفر، ص ۲۲
۲۴۔ ذوق سفر، ص ۳۷
۲۵۔ ذوق سفر، ص ۶۸
۲۶۔ دوپہر کا دائرہ، ص ۳۲
۲۷۔ دوپہر کا دائرہ، ص ۵۱
۲۸۔ دوپہر کا دائرہ، ص ۹۰
۲۹۔ دوپہر کا دائرہ، ص ۹۹
۳۰۔ دھوپ میں صحرانوردی، ص ۳۵
۳۱۔ دھوپ میں صحرانوردی، ص ۶۸
۳۲۔ ذوق سفر، ص ۱۰۱-۹۹

نظام الدین بلخی

فصیح الدین بلخی مرحوم کا بچپن

بچپن کا زمانہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے اور لوگوں کی طرح ہمارا اور ہمارے بھائیوں کا بچپن اسی طرح ایک دل دلچسپ اور پر فضا میدان میں گزرا۔ چار بھائیوں میں ہم منجھلے بھائی تھے اور اب تک ہمارے بڑے بھائی مولوی حفیظ الدین بلخی تھے جنھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں برما میں انتقال کیا اور ۱۹۳۶ء سے اب تک ان کا مزار مرجع خاصِ عام ہے۔ وہ فلسفی اور شاعر بھی تھے اور ان کا کلام غالب کے رنگ کا ہوتا تھا اور اسی کو وہ پسند بھی کرتے تھے۔ ہمارے منجھلے بھائی مولوی عزیز الدین بلخی نے ۵۴ کی عمر میں ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء بخشی محلہ میں انتقال کیا اور ان کا مزار کچی بازار میں ہے۔ وہ بھی شاعر تھے اور استاد ذوق کا کلام ان کو بہت پسند تھا۔ ان کی دو تصنیفیں بھی ہیں۔ ایک کا نام ''انسان کی پرواز'' ہے اور اس میں انھوں نے ہوائی جہاز کی تاریخی حالت کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ ان کی دوسری تصنیف ''تذکرۂ شعرائے بہار'' ہے جو آج بھی پٹنہ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے لڑکوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ شعرائے بہار کے متعلق یہ پہلی تصنیف ہے جس کو بہار گورنمنٹ نے اپنے خرچ سے شائع کیا تھا۔

مرحوم فصیح الدین بلخی ہمارے چھوٹے بھائی تھے اور ہم سے ۳ برس چھوٹے تھے۔ ان کے بچپن کے زمانے کی باتوں میں چند باتیں یاد ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کو ورزش کا شوق تھا اور حکیم فہیم الدین صاحب مرحوم کے مکان میں وہ کجھوت پہلو ان سے ورزش کرنا سیکھتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کو کشتی یا دنگل کا مطلق شوق نہ تھا اور انھوں نے نہ تو کبھی کشتی لڑے۔ اس زمانے میں خاں بہادر خاں نامی رامپور کے ایک روہیل کھنڈی پٹھان ہمارے

یہاں آکر مقیم ہوئے۔ فن شناوری میں یکتا تھے اور شیر کی تیراکی، بطخ کی تیراکی، ملاحی، کھڑی لگاتا اور چارزانو بیٹھ کر تیرنا اور اس قسم کے سارے کرتب وہ اس خوبصورتی اور حسن سے انجام دیتے تھے کہ ہم نے آج تک ویسا تیراک نہیں دیکھا۔ ہم نے خود اور فصیح الدین بلخی نے ان سے تیراکی سیکھی۔ ہم تو کچھ نہ ہوئے مگر فصیح الدین بلخی مرحوم کھڑی لگانے اور ملاحی میں یکتا ہوگئے۔ اسی زمانے میں سائیکل کا رواج بھی پٹنہ میں ہوگیا اور فصیح مرحوم نے اس میں ایسا نام پیدا کیا کہ اس وقت کے بیسوں جوان اور کمسن لڑکے ان کے شاگرد ہوگئے اور ان کو گھیرے رہتے تھے۔ حکیم صوفی صاحب کے مدرسہ میں بھی انھوں نے ابتدا میں چند روز تعلیم پائی تھی مگر اس کے بعد ہی وہ محمڈن اسکول میں داخل ہوگئے۔ محمڈن اسکول میں بھی وہ سبھوں سے ملتے جلتے نہ تھے۔ ان کے دوستوں میں ہم کو صرف خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل مرحوم کا نام یاد ہے جو آخر میں مسلم لیگ کے نامی لیڈر ہوئے ہیں۔ دونوں ہم مکتب بھی تھے اور دوست بھی تھے۔ والد مرحوم کا انتقال ۱۹۰۰ میں ہوا اور ان کے انتقال کے بعد بہت دنوں تک خاندان پریشان حال رہا۔ آخر میں فصیح مرحوم نے ریجی منٹل منشی کا امتحان دانا پور میں دیا اور پاس کرنے کے بعد ہندوستان کے فوجی محکمہ میں ان کو شر یونہ فوجی چھاؤنی کرکی میں ریجی منٹل منشی مقرر کیا گیا اور انھوں نے وہاں اپنی فوجی خدمت اس عمدگی سے انجام دیا کہ ان کا ٹرانسفر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہوگیا۔ فصیح مرحوم بچپن سے ایک متحمل، جفاکش اور ضابطہ تھے۔ فضول گوئی اور لفاظی ان میں مطلق نہ تھی مگر محنت اور جفاکشی کا وہ پتلا تھے۔ اس زمانے میں کبوتر پالنے اور اڑانے کا ہم کو بے حد شوق تھا۔ مگر میری محبت میں ہمارا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ کبوتر کا دڑبا اچھے سے اچھا بنانے میں جان لڑاتے رہتے تھے۔ ان کی محنت اور جفاکشی کو یاد کر کے ہم کو آٹھ آٹھ آنسو رونا پڑتا ہے اور ہمارے دل کی جو حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ نہ ہم خود کر سکتے ہیں اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔

بلغی صاحب

دنیا کے مشہور دولت مند ہنری فورڈ کا ایک قصہ مشہور ہے۔ ایک اخبار نویس نے فورڈ کے کارخانے میں جا کر ان سے ملاقات کی۔ ہنری فورڈ عام مزدوروں کی طرح معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی قمیص میں ایک پیوند لگا ہوا تھا۔ یہ حال دیکھ کر اخبار نویس کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اس نے سوال کر ہی دیا۔

''آپ اور اتنے معمولی لباس میں؟''

ہنری فورڈ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں چاہے جیسے کپڑے پہنوں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں ہنری فورڈ ہوں۔''

بات سچی تھی۔ اخبار نویس چپ ہو گیا۔

چند سال بعد ہنری فورڈ فرانس گئے۔ اتفاق کی بات کہ وہ اخبار نویس بھی وہاں موجود تھا۔ وہ جا کر ہنری فورڈ سے ملا۔ اور انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ہنری فورڈ وہاں بھی معمولی اور پیوند لگے کپڑے پہنے تھے۔ اخبار نویس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور وہ بولا۔

''آپ یہاں بھی اتنے معمولی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ فرانس کے نفاست پسند لوگ امریکہ کے سب سے دولت مند انسان کو بہت اچھے لباس میں دیکھنے کی امید رکھتے ہوں گے۔''

ہنری فورڈ پھر مسکرائے اور بولے۔

''لیکن یہاں مجھے پہچانتا کون ہے۔ اور جو مجھے جانتا ہے۔ اس کے نزدیک لباس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ جانتا ہے! میں ہنری فورڈ ہوں۔ خواہ کیسا ہی لباس پہنوں۔ اور جو مجھے نہیں

فصیح الدین بلخی کی کتابیں

(دائیں سے بائیں) پروفیسر نادم بلخی اور ڈاکٹر سید حسن عباس (مدیر ادراک)
نومبر ۱۹۹۹ء ڈالٹن گنج

جانتا اور پہچانتا، اس کے لئے بھی میرا لباس بے معنی ہے۔''

اخبار نویس چپ ہو گیا۔

انسان کی عظمت ظاہری چیزوں سے نہیں، بلکہ اس کی صفتوں سے ہے۔ بڑائی انسان کو ظاہر داریوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انگریزی زبان کا ایک معنی یہی ہیں۔

Simple Living high thinking۔ اور اس کے معنی یہی ہیں۔

سید فصیح الدین بلخیؔ مرحوم اس کی بڑی اچھی مثال تھے۔ دنیا کی ہر چیز کی طرف سے بے پروا۔ انہیں صرف اپنی کتابوں سے کام تھا۔ پڑھنے سے اور لکھنے سے۔ اور انہیں شاید اس کی فکر بھی نہیں ہوتی تھی کہ دنیا میں تو ایک طرف، خود ان کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔

بہارؔ میں بلخیوں کا گھرانہ علم اور ذہانت کے لئے مشہور ہے۔ حضرت شاہ مظفر بلخی، بلخ کی سلطنت چھوڑ کر بہار آئے۔ اور حضرت مخدوم الملک کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ انہیں حضرت مظفر بلخیؔ سے بہار کے بلخیوں کا سلسلہ نسب شروع ہوتا ہے۔ اس خاندان کے علمی ادبی کارناموں پر ایک علاحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے اور بہار کی زمین میں آسودہ ہوئے۔

میں سید فصیح الدین بلخیؔ صاحب مرحوم کے نام سے اس وقت آشنا ہوا جب ''ندیم'' کا پہلا بہار نمبر شائع ہوا۔ ندیمؔ کا یہ بہار نمبر بہت سے بہاری باکمالوں کو متعارف کرنے کا سبب بنا۔ یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ مرحوم نے کتبوں اور سکوں کے حوالے سے ایک قیمتی مضمون لکھا تھا۔ مجھے یہ مضمون بے حد پسند آیا تھا۔ یہی زمانہ میری ادبی زندگی کے آغاز کا بھی تھا۔ اور میں نے انجم صاحب مرحوم کو خط لکھا تو اس مضمون کا سب سے پہلے ذکر کیا تھا۔ اسی وقت سے میں نے مرحوم کے بارے میں بعض ضروری باتیں معلوم کر لیں۔ ان دنوں وہ سرائے کیلا کی ایک چھوٹی سی ریاست میں ریونیو آفیسر تھے۔ ملاقات کا کوئی موقع نہیں نکل سکا۔ دو چار اور چھوٹے مضامین دیکھے۔ مگر ان کے بارے میں آج کی طرح اس وقت بھی کوئی زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں۔

شاید ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اردو (دلی) نے ان کی کتاب ''تاریخ مگدھ'' شائع

کی (۱)۔ ان دنوں میں انجمن ترقی اردو سے منسلک تھا۔ اور خاص قسم کی خدمت میرے سپرد تھی۔ اور بابائے اردو مرحوم کی خدمت میں اکثر باریابی کا موقع ملتا تھا۔ بابائے اردو نے بار باراس کتاب کی تعریف کی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ بلخی صاحب انجمن کے لئے اور کتابیں بھی لکھیں۔ مگر اپنی دلچسپیوں کی وجہ سے وہ اس کا موقع نہیں نکال سکے۔

اسی زمانے میں ایک دن ان سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی۔ ان کے بھتیجے سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان کا مکان قانون، سیاست اور علم وادب کا اکھاڑا تھا۔ شام کے وقت ان کے یہاں طرح طرح کے لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ میں رانچی سے آیا اور ان سے ملنے گیا تھا۔ فصیح الدین بلخی صاحب بھی اپنے بھتیجے سے ملنے آئے۔

جب رفیع صاحب مرحوم نے تعارف کرایا۔ تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ بے حد دبلے پتلے، اور کھوئے کھوئے سے آدمی، معمولی کپڑے اور بہت ہی معمولی طور طریقے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ کچھ مقبروں کے کتبے کی نقلیں۔ اور کچھ کی نقلیں جو انھوں نے بڑی کاوش سے حاصل کی تھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مل کر بڑی مایوسی ہوئی۔ بڑے آدمیوں کے خیال کے ساتھ جتنی باتیں ذہن میں عام طور پر آتی ہیں ان میں سے کوئی بات ان میں نہیں تھی۔ اگر تعارف نہ ہوتا تو شاید ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن تعارف ہو چکا تھا۔ پھر جو انھوں نے ان کتبوں اور فرامین کے بارے میں باتیں شروع کیں تو جیسے علم کے سمندر میں طوفان آگیا۔ بات ختم ہوتی ہی نہ تھی۔ ایک کے بعد دوسری اور اس کے بعد تیسری۔ وہ ان دنوں پٹنہ کے مقبروں کے کتبے اور فرامین جمع کر رہے تھے۔ اور بے حد مصروف تھے۔

جب میں ۱۹۴۹ء میں رانچی سے پٹنہ واپس آگیا تو بلخی صاحب مرحوم ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقلاً آچکے تھے۔ اور ملازمت بھی چھوٹی سی ریاست کی۔ یعنی انکے پاس کوئی بڑا اندوختہ نہیں تھا۔ مگر انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی اس سلسلے میں بات کرتے ہی نہیں تھے۔ جس حال میں تھے خوش تھے۔ جب بھی باتیں ہوتیں تو وہ اپنی نئی تحقیق کی باتیں سناتے۔ اور میں سنتا رہتا۔ ان دنوں میں نے ایک روزانہ اخبار جاری کیا تھا۔ مالک بھی تھا اور ایڈیٹر بھی۔ دوہری مصیبت میں مبتلا تھا۔ لیکن ان کے عزم واستقلال اور لگن کو دیکھ کر

بڑی ہمت بندھی تھی۔ وہ بزرگ تھے اور میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا۔ میں بڑی نیازمندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور وہ بالکل دوستانہ برتاو کرتے۔ ایک دن میں نے پٹنہ کے جوان مرگ شاعر ضیاؔ عظیم آبادی کا ذکر کیا تو اس کی ساری داستان سنا گئے۔

پھر پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سنہا نے انھیں پٹنہ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر مقرر کر دیا اور وہ یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ مشرقی میں دن بھر کام کرنے لگے۔ کتابیں پڑھتے اور کتابوں کی ترتیب درست کرتے رہتے۔ انھیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ان کے پاس ایک بڑی لائبریری تھی اور وہ ان کتابوں سے کام لے سکتے تھے۔ اتنی عمر میں وہ ناشتہ کرنے کے بعد لائبریری آجاتے اور شام تک وہاں پڑھتے رہتے۔ انھوں نے اس شعبے کو بڑی ترقی دی اور بہت سے قلمی نسخے اس لائبریری کے لیے جمع کئے۔ پٹنہ یونیورسٹی کا شعبۂ السنہ مشرقی ان کی انتھک محنت کا امین ہے۔

میں نے جب ماہنامہ تہذیب، جاری کیا تو ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا۔ لیکن ان کی ایک عادت تھی۔ جب کوئی کام شروع کر دیتے تو درمیان میں اسے کبھی نہیں چھوڑتے تھے اور ایک چیز شروع کرنے کے بعد ختم کرنے سے پہلے دوسرا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جب میں نے ان سے مضمون کی درخواست کی تو انھوں نے فوراً وعدہ فرمایا۔ پہلے ضیاؔ عظیم آبادی مرحوم پر ایک مفصل مضمون لکھا۔ پھر ایک بے حد قیمتی مضمون ماہ وسال کی تاریخ پر۔ اور ایک مضمون عروض وموسیقی کے تعلق پر۔ یہ سارے مضامین نہایت عالمانہ تھے۔ افسوس کہ آخری مضمون کی اشاعت کی نوبت ہی نہ آئی اور تہذیب، بند ہو گیا۔ اور یہ مضمون کسی دوسرے رسالے کی زینت بنا۔ اس مضمون میں انھوں نے بتایا تھا کہ شاعری کی بحروں کا فن موسیقی اور اس کے مختلف راگوں سے گہرا تعلق ہے۔ اگر شاعری سے موسیقی کو الگ کر دیا جائے تو شاعری زندہ نہیں رہ سکتی یا پھر بے روح تو ضرور ہو جاے گی۔

فصیح الدین بلخی صاحب مرحوم علم کا سمندر تھے۔ انھیں صرف ادب اور تاریخ ہی سے دلچسپی نہ تھی، فنون لطیفہ کے ہر شعبے سے انھیں گہری دل چسپی تھی اور اس کے بارے میں ان کی معلومات بہت اچھی تھی۔ شاعری اور انشاپردازی سے لے کر موسیقی، مصوری اور رقص تک پر

ان کی گہری نظر تھی۔ اور وہ ان کی باریکیاں بیان کر سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار علم نجوم کی بات چلی تو وہ علم نجوم کی بہت سی باتیں بتا گئے۔ پٹنہ اور بہار کے بہت سے نامی نجومیوں کی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن یہ بھی فرمایا کہ یہ فن بہت مشکل ہے اور مسلسل ریاضت چاہتا ہے۔ اس فن پر عبور خلق اللہ کے لیے مفید بھی ہو سکتا ہے اور اس کی خامی تباہ کن بھی۔ اس لیے اس پر عبور حاصل کرنے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھے۔ کثرت مطالعہ اور شب بیداری نے ان کی صحت کو اور بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی اور انھیں زیادہ رنج تھا اور وہ بھی اس لیے کہ مطالعہ میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔

جب میں کئی برسوں کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۶۰ء میں پٹنہ واپس آیا اور ان سے جا کر ملا تو بہت خوش ہوئے۔ اپنی کتاب 'تذکرہ نسوان ہند' کی ایک جلد عنایت فرمائی۔ یہ کتاب میرے غائبانہ میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار ان سے استدعا کی کہ ریڈیو کے لیے بھی کچھ وقت نکالیں لیکن انھوں نے معذوری ظاہر کی۔ موتیابند کے اثر کی وجہ سے لکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا اور کسی چیز کو پڑھنا بھی۔ پھر بھی میرے اصرار پر انھوں نے نواب امداد امام اثرؔ پر ایک تقریر نشر کی۔ واقعی تقریر نشر کرا کے مجھے رنج ہوا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے تقریر رکارڈ کرائی تھی۔ لکھے ہوئے حروف پڑھنے میں انھیں دقت ہو رہی تھی اور آواز میں بھی کمزوری تھی۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس تقریر کے لکھنے میں انھیں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن میرے اصرار پر انھوں نے تقریر لکھی بھی اور براڈکاسٹ بھی کی۔

ان کی موت سے بہار ایک مایۂ ناز محقق اور عالم سے محروم ہو گیا جس کی جگہ بہت دنوں تک خالی ہی رہے گی۔

☆☆☆

مولوی فصیح الدین بلخی مرحوم

مولوی فصیح الدین بلخی ۱۸۸۵ء میں پٹنہ سٹی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان آج بھی پٹنہ میں ممتاز شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان میں مشاہیر علما بھی، مقتدر شعرا بھی اور بلند پایہ صوفیہ بھی گزرے ہیں۔ اس خاندان کا براہ راست واسطہ حضرت معزالدین بلخی سے جاملتا ہے جو حضرت مخدوم الملک شرف الدین بہاری علیہ الرحمہ کے جانشین اور خلیفہ حضرت مظفر بلخی کے بڑے بھائی تھے۔ چونکہ حضرت مظفر بلخی کو اپنی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے حضرت معزالدین بلخی کی اولاد انھیں کے نام سے منسوب ہوئی۔ مولوی فصیح الدین بلخی کی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے، تو مولانا صوفی کے مدرسہ میں علوم مشرقیہ کا یہ درس لینے لگے۔ چونکہ انگریزی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ چکی تھی اس لیے چند سال کے بعد ان کو مدرسہ سے نکال کر محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل کردیا گیا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے اپنے گھر سے ایک پرچہ نکالنے لگے جس کا نام 'رفتار زمانہ' تھا۔ اس سے ان کے علمی ذوق کا پتا چلتا ہے۔ اسی درمیان میں انھوں نے منشی کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا۔ ذہن رسا ان کو ودیعت ہوا تھا۔ اس لیے اپنی نا مکمل تعلیم کو گھر پر مطالعے سے پورا کرتے رہے۔ یہ ان کا SELF EDUCATION ہی تھا جس نے ان کو آخر میں محققین کی صف میں کھڑا کردیا۔ کچھ دنوں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بھی لکچرر رہے۔ پھر کچھ عرصہ تک جزیرۂ فیجی، اسکندریہ، دمشق اور بیروت میں حکومت ہند کی طرف سے سرکاری کام کے سلسلے میں مقیم رہے۔ وہاں انھوں نے نمایاں کام بھی کئے اور اس کے صلے میں حکومت ہند نے ان کو ہندوستان میں زمینیں بھی دیں اور جون پور میں ریونیو مجسٹریٹ کا عہدہ بھی تفویض کیا۔ آدمی حریت پسند تھے اس لیے انھوں نے حکومت کے اس عہدے کو ترک موالات

کے دور میں حکومت ہند کے سرپڑکا اور ۱۹۲۶ء میں سرائے کیلا اسٹیٹ میں ریونیو مجسٹریٹ کا عہدہ قبول کر کے وہاں چلے گئے۔ جب ۱۹۴۸ء میں وہاں سے پنشن لے کر واپس آئے تو پٹنہ یونیورسٹی میں ان کی تقرری بہ حیثیت ریسرچ اسکالر ہوئی۔ اپنی گونا گوں مصروفیتوں میں بھی بلخی صاحب تاریخ کے تحقیقاتی کاموں کے لیے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ جہاں سن لیتے کہ پرانی یادگاریں کسی جگہ موجود ہیں تو ان کے لیے بے چین ہو جاتے اور اس وقت تک چین نہ لیتے جب تک ان کو جا کر دیکھ نہ آتے۔ تاریخی کتبے، پرانے اسناد اور دوسرے تاریخی نوادر تک پہنچنے کا اور ان پر تحقیقات کرنے کا ذوق وشوق آخر دم تک باقی رہا۔ اس کے لیے یکسوئی ضروری چیز تھی جو بالآخر ان کو پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت میں حاصل ہوئی۔ تاریخ نویسی اور تاریخی نوادر کی تحقیقات اب ایک مستقل فن بن چکا ہے۔ عہد ماضی کی داستان اب کسی لکھنے والے کے صرف جنبش قلم کی مرہون نہیں رہ سکتی۔ اس کے لیے ماضی کے واقعات کو کھنگالنا، روایت کو حقیقت سے الگ کرنا، حدیث کے اسماء الرجال کے قاعدے پر واقعات کو پرکھنا، ساتھ ہی ساتھ تیز قوت مشاہدہ، بے لاگ تنقید، ماحول اور اس سے منسلک واقعات کا منطقی اور نفسیاتی تجزیہ اور صحیح Premises کو ترتیب دے کر ان سے نتائج اخذ کرنا، یہی تاریخ نویسی اور صحیح تحقیقات کے راستے ہیں۔ اب تاریخ نویسی کو اس کے صحیح معیار پر لانے کے لیے تحقیقات کی کسوٹی پر کس کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور سارا مواد اس طرح تاریخ نویسی کے لیے فراہم کر دیتے ہیں۔ اسی صورت سے لکھی ہوئی تاریخیں اب مستند مانی جاتی ہیں اور یہی طریقہ تاریخ نویسی کا سائنٹفک طریقہ کہلاتا ہے۔ اس لیے علم الصنادید کا ماہر، آثار قدیمہ کا محقق، علم الموجودات سے دل چسپی رکھنے والا، نفسیات کا جاننے والا اور سیاسی مفکر یہ سب تاریخ کی تدوین میں یکساں طور پر شریک ہیں کیونکہ انھیں کے اخذ کیے ہوئے نتائج کے مواد سے صحیح تاریخ کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

مولوی فصیح الدین بلخی کا مقام صنادید کے ماہرین اور آثار قدیمہ کے محققین کے گروہ میں ملتا ہے۔ جیسوال انسٹی ٹیوٹ ہو یا بہار کے آثار قدیمہ کا شعبہ، ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت ہوں یا پروفیسر سید حسن عسکری، تحقیقات کے سلسلہ میں ہر ایک سے ان کا تال میل رہتا تھا۔ حال میں

جو بہار کی تاریخ مرتب ہوئی اس میں بھی بلخی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت اور پروفیسر سید حسن عسکری سے ان کے روحانی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ تحقیقات کے کام میں یہ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے اور اس طرح تحقیقات کے کاموں میں آسانیاں ہو جاتیں۔

ان کی لکھی ہوئی 'تاریخ مگدھ نے، مورخین کی فہرست میں ان کا درجہ بہت اونچا کر دیا ہے۔ اگر 'صنادید بہار، جو بلخی صاحب مرحوم نے بڑی کاوش سے لکھی تھی اور جس میں نو سو کتبوں کے فوٹو ہیں، چھپ کر منظر عام پر آجائے تو ان کا مقام اور بھی اونچا ہو جائے گا۔ ضرورت ہے کہ ایک تاریخ دان اور محقق کی حیثیت میں ان کا صحیح مقام لوگوں کو بتلایا جائے اور یہ اسی وقت ہوگا جب متعدد آثار قدیمہ سے متعلق ان کے تحقیقاتی کارنامے لوگوں کے سامنے لائے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے صاحبزادے پروفیسر نادم بلخی اس کام میں عجلت کریں گے۔

مولوی فصیح الدین بلخی مرحوم کو میں اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھے عزیز رکھتے تھے۔ اگر پرانی باتوں کی مجھے تحقیق کرنی ہوتی یا اپنے تحقیقات کے نتائج کو مصدق کرانا ہوتا تو میں ان سے استصواب کرتا اور شافی جواب پاتا۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو اپنی تحقیقات کو خواہ وہ کسی چیز کے متعلق ہو دوسروں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے ہیں۔ مگر بلخی صاحب مرحوم اس معاملے میں بڑے کشادہ دل تھے۔ جہاں بیٹھتے وہاں بالا علان اپنی تحقیقات کے نتائج خود لوگوں کو بتلاتے اور اگر کوئی ان کے گھر جا کر ان سے تحقیقات کے کام میں مدد مانگتا تو بڑی خوشی کے ساتھ اس کی مدد کرتے۔ ان کو تاریخ کے ریسرچ کے معاملہ میں ایسی شیفتگی تھی کہ اگر جنون کا لفظ جو گراں ہے، لکھ جاوں تو غلط بھی نہ ہوگا۔ صحت ان کی خراب تھی مگر کام کے مقابلے میں اس کی انھوں نے کبھی پرواہ نہ کی۔ اگر کام ہوتا تو اپنی بیماری یا خرابیٔ صحت کو بالکل نظر انداز کر کے کام میں لگ جاتے۔ تحقیقات کے کام کے سلسلے میں ان کے قدم نوجوانوں سے آگے پڑتے۔ ۷۵ ر سال سے اوپر عمر ہو چکی تھی، صحت بھی خراب تھی، مگر شہروں، شہروں اور دیہاتوں دیہاتوں، تحقیقات کے شوق میں دوڑے چلے جاتے۔ ان کی ان ہی کدو کاوش کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پرانے نوادر جن میں کتبے بھی تھے، قلمی دستاویزیں بھی تھیں اور تاریخی اور دوسرے علمی مسودات بھی تھے، زمانہ کے دست برد سے بچ گئے۔ ان کے مالکوں کو ان کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتے اور کوشش کرتے کہ پورے مسودات کسی طرح محفوظ

کردیے جائیں۔ مجھ کو بھی پرانی یادگاروں اور قدیم نوادر سے دل چسپی کا ورثہ والد مرحوم سے ملا ہے۔اس لیےان کے لیے کس طرح دل بے چین ہوجاتا ہے، میں بھی اس جذبے سے تھوڑا بہت آگاہ ہوں، اور یہی وجہ تھی کہ بلخی صاحب مرحوم کی دل کی دھڑکن اور ان کی وارفتگی کی میں قدر کرتا تھا۔

صرف تاریخ سے ان کو دل چسپی نہ تھی۔ ہر پرانی چیز سے ان کو لگاؤ تھا۔ اگلے زمانے کے شادیات کے جشن، تہواروں اور میلوں کے تذکرے، پٹنہ کی گزری ہوئی محفلوں کی داستانیں اور یہاں کے اگلے بزرگوں کے قصے بڑے مزے میں بیان کرتے اور ان میں تحقیقی صداقت بھی ہوتی۔ ایسے دور میں جبکہ ہر طرح کے انقلاب نے اچانک ہم کو آلیا ہے اور ان کے جو اثرات یہاں کی سوسائٹی اور کلچر پر برسوں میں مرتب ہونے چاہیے تھے، یہاں روز بروز رونما ہورہے ہیں، مولوی فصیح الدین بلخی کا گزرجانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ماضی اور حال کی درمیانی کڑی ٹوٹ گئی ہو۔اب ہم اپنے بزرگوں کا حال جاننا بھی چاہیں اور گنگا جمنی دور کا قصہ سننا بھی چاہیں تو اب کس سے سنیں اور کس سے معلوم کریں۔ وہی تھے جو ہنس ہنس کر اگلے زمانے کے واقعات بیان کرتے تھے اور اپنے زور بیان سے اس زمانے کے ماحول کی اصلی تصویر نظر کے سامنے کھڑی کردیتے تھے۔ مجھے بھی اس گزرے ہوئے عہد کی داستانوں سے دل چسپی ہے۔ وہ اگلے زمانے اور میری یاد سے قبل کی باتیں دہراتے تو میں بڑے اشتیاق کے ساتھ سنتا اور اگر میں دوسروں سے سنی ہوئی باتوں کی ان سے تصدیق چاہتا تو کبھی تو ان کی تصدیق کردیتے کبھی ان کی تردید اور کبھی انھیں ترمیم کر کے مجھ سے ان باتوں کی اصل حقیقت بیان کرتے۔

بلخی صاحب مرحوم کو شعر و ادب سے صرف ذوق ہی نہیں تھا بلکہ وہ سخن فہم، سخن شناس اور شعر و ادب کے نکات کو جاننے والے بھی اور اچھے ناقد بھی تھے۔ اساتذہ کے اشعار خوب یاد تھے۔ پٹنہ کے نامی اور معرکہ کے مشاعروں کے قصے یاد تھے۔ شاعروں کی آپس کی چشمکیں یاد تھیں اور حضرت شادؔ اور 'الپنچ' کے جھگڑے یاد تھے۔ ان سب کی طویل داستانیں ان سے سن کر مزہ آجاتا۔ شعر و ادب کے ساتھ ان کی وابستگی اور لاتعداد فارسی اور اردو کے منتخب اشعار کا ان کے ذہن میں محفوظ رہنا اس بات کی دلیل تھی کہ بلخی صاحب مرحوم سخن فہم ہونے کے ساتھ سخن سنج بھی تھے۔ میں نے ان کی زبانی ان کے اشعار کبھی نہیں سنے۔ جب شعر و شاعری کی باتیں نکلتیں

تو وہ دوسروں کے اشعار سناتے، تنقید کرتے اور شاعرانہ نکات پر روشنی ڈالتے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بلخی صاحب اگرچہ اچھے اچھے شعر کہتے تھے مگر دوسرے شعرا کی طرح اپنے شعر کہنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ فن عروض میں بھی انھوں نے کتابیں لکھیں، نسوان ہند، کے نام سے شاعر عورتوں کا تذکرہ بھی لکھا مگر اپنی شاعری کا کبھی ڈھول نہیں پیٹا۔

کام سے باہر نکلتے تو اکثر سوٹ پہن کر نکلتے۔ گھر سے باہر ہوں یا گھر میں تہذیب و اطوار میں پکے ہندوستانی تھے۔ غرور نام کو نہیں تھا۔ چھوٹوں سے بھی ملتے تو ان کو برابر کا درجہ دیتے۔ ان کے ہر فعل میں شائستگی ہوتی اور دوسروں سے بھی یہی شائستگی وہ چاہتے تھے۔ آج ان کے اٹھ جانے سے تاریخ کا ایک محقق، شعر و ادب کا ایک ناقد اور پٹنہ کے گزرے ہوئے زرنگار اور رنگین دور کا ایک افسانہ گو اٹھ گیا۔

اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں ان کو جگہ عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

پروفیسر اختر اورینوی

فصیح الدین بلخی مرحوم کے متعلق میرے تاثرات

میں نے جب سے حضرت فصیح بلخی کو قریب ہو کر دیکھا، مجھے ان کے جسمانی سے زیادہ ان کے روحانی وجود کا احساس ہوا اور جب وہ وفات پا گئے تو مجھے کوئی اچانک دھکا سا نہیں لگا۔ ان کے جسم کے فنا ہو جانے کا المناک اثر اس لئے گہرا نہ پڑا کہ ان کی توانا، متحرک، کارفرما وکارساز روح آج بھی میرے لئے زندہ حقیقت ہے۔ بہت ہی ناتواں، بے حد فانی جسم کے اندر ایک برقی، مقناطیسی روح انہیں ہر لحہ بے قرار، متجسس اور متحرک رکھتی تھی۔ اس روح جلیل کے سامنے ہمیشہ ایک مقصد رہتا تھا۔ لیکن اس روح کی منزل لامتناہی تھی۔ چینی باسن کی طرح سفید و شفاف جسم میں کدورت نام کو بھی نہیں اور اس شیشہ کے اندر ایک مجلیٰ و مصفیٰ آئینہ دل جو محبت سے برق تاب تھا۔ جھری سے بھرے ہوئے تابناک چہرے پر بروقت فطری تبسم کی ضیاباریاں جنھوں نے شکن شکن کو نورانی تحریر بنا دیا تھا اور اس تحریر میں ان کے دل کی کتاب کی تفسیریں تھیں۔ ہروقت ایک لگن اور اس لگن کا سرور ان کے نورانی متبسم چہرے پر کھیلتا رہتا تھا۔ وہ جسم کی خوف پیدا کر دینے والی نزاکت وشیشہ ناکی کے باوجود بے حد زندہ تھے۔ چونچال، دھن کے پکے، سفر میں جری، قلم کے مضبوط، بلند فکر، جستجو میں محو، انکشاف میں کامیاب، بھری بزم میں سربلند۔ انکی وفات ایک رحلت، ایک سفر، ایک محویت معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسرار و رموز، بصائر وحقائق کی تلاش میں عالم آخرت کو چلے گئے ہیں۔ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہے۔

ڈاکٹر کالی کنکر دت، پروفیسر حسن عسکری اور حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کی ارواح تحقیق میں شامل ہیں۔ یہ روحیں ابدی ہیں۔ دار العلوم کی ان مقدس روحوں کے فیض سے ہماری مادر علمی زندہ ہے۔ ان ارواح مقدسہ کی ترکیب وجود میں حق آگاہی کے ساتھ محبت شعاری بھی ہے۔ میں نے ان

ارواح کو بار بار ہم جلیس دیکھا ہے۔ ان کے جسمانی آشیانے جدا جدا ہیں مگر روحانی نشیمن ایک۔

حضرت بلخی پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ آفیسر تھے۔ انہوں نے مخطوطات کا انبار لگا دیا ہے۔ اس خرمن کے خوشہ چیں کم ہیں مگر بلخی نے دولت بے پایاں جمع کر دی ہے۔ نیپال، دکن، بہار اور اتر پردیش کے گوشے گوشے سے بوریوں میں بھر بھر کر دولتیں سمیٹی ہیں۔ کتب خانۂ خدا بخش اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے مخزنوں کی وجہ سے عظیم آباد آج مدینۃ العلم ہے۔

حضرت بلخی مورخ، محقق اور جامع الحقایق تھے۔ وہ صرف پیر تحقیق نہیں تھے بلکہ شیخ دستگیر بھی تھے۔ نہ جانے، کتنوں نے ان سے فیض پایا۔ ''بہار میں اردو زبان وادب کے ارتقا'' کے سلسلے میں حضرت بلخی سے مجھے بھی ارادت حاصل رہی ہے۔ پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر کلیم الدین احمد اور حضرت بلخی نے ہمیشہ بڑی کشادہ دلی سے میری مدد کی۔ میں نے حضرت بلخی کی کتاب 'تاریخ مگدھ' کے علاوہ ان سے براہ راست بھی استفادہ کیا ہے۔ حضرت آیت اللہ جوہری پھلواروی کی مثنوی، گوہر جوہری، کا نادر قلمی نسخہ پروفیسر عسکری کی تلاش و جستجو کا حاصل ہے، تو جوہری کی تصویر حضرت بلخی کے انکشاف کی دلیل ہے۔ مجھے یہ تصویر انھیں سے ملی تھی۔ میں نے اس کا بلاک بنوایا جو میرے کام بھی آیا اور ڈاکٹر سید محمد صدرالدین صاحب کے بھی۔ مرحوم نے میرے کئی ریسرچ کرنے والے اسکالروں کی مدد فرمائی اور اس طرح کہ امداد سے وہ خود احسان مند ہوئے جا رہے ہیں۔ نام و نمود کی خواہش، بے جا فخر و مباہات اور کبر و پندار کی ضد اگر دیکھنی ہو تو کوئی بلخی کو دیکھتا۔

نادم بلخی سلمہ شعبۂ اردو میں میرے شاگرد تھے۔ حضرت بلخی اور میرے درمیان مراسم قائم ہو چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے لڑکے لئے کبھی کسی قسم کی سفارش نہیں کی۔ وہ توان باتوں سے بلند تھے۔ یہ پندار نہیں وضع داری اور اعتبار تھا۔ جب آپ 'نسوان ہند' لکھ رہے تھے تو ارول ضلع گیا کی شاعرات کے کلام حاصل اور ان کے حالات دریافت کرنے وہ کئی بار میرے پاس تشریف لائے اور اپنے کام کی باتیں کیں۔ آنکھوں میں حلم و انکساری اور اخلاص و وفا کی روشنی چمکتی تھی۔

ایک بار میں ان کے گھر گیا۔ وہ تشریف نہیں رکھتے تھے۔ دو ریسرچ اسکالر بھی میرے ساتھ تھے۔ میں حضرت بلخی سے انہیں تحقیقی مواد دلوانے گیا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا تو بہت

متاسف ہوئے اور مجھ سے مل کر مدد کا وعدہ فرمایا۔ نہایت سادگی اور قناعت سے رہتے تھے۔ بڑی صاف ستھری رہائش، متین اور مہذب طرز زندگی، شریفوں کا سا انداز اور رکھ رکھاو تھا۔

وہ بیمار تو بہت دنوں سے چلے آتے تھے لیکن دم خم اتنا تھا کہ وہ مرض کو خاطر میں کب لاتے تھے۔ بڑے حوصلے اور ہمت سے تحقیق کے کاموں میں مشغول رہے۔ بہت سے کاموں کے پروجکٹ بنا رکھے تھے اور کارسازی میں ہمہ تن لگے ہوئے تھے۔

ایک روز کلیم الدین عاجزؔ سلمہ اور کوئی اور صاحب مجھ سے ملنے آئے اور یہ تشویش ناک خبر سنائی کہ حضرت بلخی خطرناک طور پر علیل ہیں اور انہیں اسپتال میں داخل کرنا ہے۔ اس سلسلے میں میرے تعاون کی ضرورت تھی۔ شکر کہ داخلہ بخیر وخوبی ہو گیا۔ لیکن کچھ دنوں تک مجھے حضرت بلخی کی عیادت کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی۔ دل پر بوجھ محسوس کرتا رہا کہ مجھے ملنے اور دو گھڑی ان کا دل خوش کرنے جانا چاہیے۔ آخر گیا۔ سرجکل وارڈ راجندر بلاک میں تھے۔ نادمؔ سلمہ ان کی تیمار داری میں جی جان سے لگے ہوئے تھے۔ حضرت بلخی مجھے دیکھ کر متبسم ہوئے۔ چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ بولی میں بڑی نقاہت تھی۔ بستر علالت پر روح ہی روح تھی۔ لیکن وہ مجھ سے گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے پوچھا: کیا حال ہے؟ فرمایا: آپ لوگوں سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہی میری غذا ہے۔ ویسے بھوک بالکل نہیں لگتی۔'' نادم سلمہ نے بھی بتلایا کہ غذا تو برائے نام ہے۔ کھانے کی چیزوں سے جلد دل پھر جاتا ہے۔ بسکٹ، پھل، ٹوسٹ، بورن ویٹا بدل بدل کر اشیائے خوردنی دی جاتی ہیں۔ مگر ذرا منھ میں لیا اور پھر انکار۔ ہفتوں سے یہ حال ہے۔ میں نے برسبیل گفتگو انہیں کچھ نہ کچھ، تھوڑی تھوڑی دیر پر کھاتے رہنے کی رغبت دلائی۔ وعدہ فرمایا: کوشش کروں گا۔'' حضرت بلخی پر انقطاع کی کیفیت طاری تھی۔ نادمؔ سلمہ نے ہر چند خدمت کا حق ادا کیا اور ڈاکٹروں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ بستر مرگ پر بھی وہ صابر وشاکر، متبسم اور مطمئن نظر آتے تھے۔ چند دنوں کے بعد ہی خبر ملی کہ انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ زمانے تک انکی خالی جگہ پُر نہ ہوگی۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

علیم الدین بلخی ندوی

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

۱۴ر مارچ کا ذکر ہے جبکہ میں چار دنوں گھر سے باہر رہنے اور ایک مختصر سے سفر کے بعد ۱۰ ر بجے صبح میں مکان واپس آیا۔ آنے کے ساتھ ہی گھر والوں سے معلوم ہوا کہ رات ہی فصیح الدین بلخی مرحوم (جنھیں میں دادا کہا کرتا تھا) کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور آج بعد نماز ظہر ان کی تجہیز وتدفین ہوگی۔ یہ خبر ہمارے لیے کوئی غیر متوقع نہیں تھی۔ مرحوم ایک عرصہ سے ذی فراش تھے اور پٹنہ کے سرکاری اسپتال میں داخل تھے۔ میں مرحوم کو جب بھی اسپتال میں دیکھنے گیا انتہائی کرب واذیت کے عالم میں بھی ہوش وحواس بجاہی پایا۔ نبض کی رفتار اور قلب کی حرکت میں کوئی کھٹکا نظر نہیں آیا۔ کئی ماہ مسلسل علالت نے ان کے ظاہری قویٰ کو اب مضمحل وناتواں بنادیا تھا۔ موت کے ایک ہفتہ قبل سے کچھ نمایاں تغیرات بھی سامنے آگئے تھے۔ کبھی کبھی غفلت وبے ہوشی کی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی مگر ہوش بجا ہوتے ہی ناامیدی اور یاس بھرے کلمات استعمال کرتے اور اپنا مرض لاعلاج بتاتے ہوئے گھر لے جانے کے لیے کہتے۔ نیز اپنے کو چند دنوں کا مہمان بتاتے۔ اکثر لب متحرک نظر آتے جس سے معلوم ہوتا کہ آپ تسبیح وتہلیل میں مشغول ہیں۔ آپ کے مایوس کن الفاظ نے اب ہم سب لوگوں کو بھی آپ کی زندگی سے مایوس بنادیا تھا۔

ہاں! اس یاس انگیز پس منظر کے ساتھ آج چار دنوں پر میں گھر واپس آیا اور آتے ہی وہ خبر بھی سن لی جسے سننے کے لیے دل تو آمادہ نہ تھا مگر اب اس سے مفر بھی نہ تھا۔ جس خطرہ کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوا تھا وہ اب حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا پھر کیوں نہیں یقین کرتا۔

ایھاالنفس اجملی جزعاً ان ما تحذرین قد وقعاً

ترجمہ: اے دل صبر وضبط سے کام لے جس کا تجھے خطرہ تھا وہ اب ہو کے رہا۔

یہ خبر سنتے ہی دل غم والم میں ڈوب گیا۔ مرحوم گو کہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے تاہم ان کی ضعیفی وپیری پورے خاندان والوں کے لیے سایۂ شفقت ورحمت تھی۔ ان کی ذات سارے اقربا واعزہ کے لیے سامان تسکین وتقویت تھی۔ انکی ہستی ان کے تمام مخلصین واحباب کے لیے باعث بہجت وراحت تھی اور ان کی حیثیت بلاشبہ قابل فخر تھی ہم سب لوگوں کے لیے، ملک کے لیے اور قوم کے لیے بلکہ ساری علمی دنیا کے لیے:

وما کان هلك قيس هلك واحد   ولكن بنيان قوم تهدّما

ترجمہ: قیس کا مرنا اس کا مرنا نہیں یہ حادثہ پوری قوم کے لیے خسارۂ عظیم ہے۔

میں کھڑا ہوا دیر تک اس خسارہ ونقصان عظیم کو سوچتا رہا۔ افسردگی وپژمردگی کے بادل کچھ اس طرح دل ودماغ پر چھا گئے کہ میں اس وقت یہ بھی نہیں سوچ سکا کہ مجھے اس گھڑی فوراً ہی تجہیز وتکفین میں جانا ہے۔ میں کھڑا رہا اور دیر تک میرے پردۂ دماغ پر جانے والے مرحوم کے کارناموں کی تصویر آتی رہی۔ آنکھیں گو اشکبار نہ تھیں مگر دل یقیناً انتہائی ملول ورنجیدہ تھا۔

ورب كئيب ليس تندى جفونه

ورب كثير الدمع غير كئيب

(ترجمہ: بہت سے غمگین ایسے ہیں جن کی پلکیں بھی بھیگتی ہیں، اور بہت سے آنسوؤں کا دریا بہانے والے ایسے ہیں جن کو کوئی اندوہ وغم نہیں بھی ہوتا)

چوں کہ میں فوراً ہی باہر سے آرہا تھا اور چھٹی نہ ہونے کی وجہ کالج کی حاضری بھی ضروری تھی اس لیے صرف حاضری دینے کالج گیا اور وہاں کوئی لکچر دیے بغیر مرحوم کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے چلا گیا۔ دو بجے نماز ظہر کے بعد مرحوم کی صلوٰت جنازہ ہوئی اور تین بجے انھیں پٹنہ کے محلہ دوندی بازار میں مولانا سید امین اللہ صاحب علیہ الرحمہ جو پٹنہ کے ایک ممتاز اور جید عالم تھے اور مرحوم کے خسر تھے، کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم کا چہرہ اس خاکدان میں کھولے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا ہی نظر آرہا تھا کہ زندگی میں نظر آیا کرتا تھا۔ چہرہ پر اس وقت بھی وقار وتمکنت پوری طرح نمایاں تھی۔ لبوں پر وہ مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی جو ایک مرد مومن کے لبوں پر ایسے وقت کھیلا کرتی ہے۔

نشان مرد مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب او

یوں تو یہ دنیا ہی سرائے فانی ہے اور اپنی ہستی، حباب وسراب، جیسی ہے بلکہ اس عالم آب وگل کی ہر شئے 'امر ربی، میں بندھی ہوئی ہے۔ ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے۔ اس لیے مرحوم کو بھی اس دار فنا سے دار بقا کی طرف کبھی نہ کبھی تو جانا ہی تھا مگر ان کا جانا اس وقت ہم سب لوگوں کے لیے انتہائی قلق انگیز بنا ہوا تھا۔ ہر وہ شخص جو مرحوم کے تن خاکی کو سپرد خاک کرنے کے لیے آیا ہوا تھا، تصویر حزن وملال بنا ہوا تھا۔ مرحوم کو اس ابدی خواب گاہ میں لٹانے کے بعد ہر خرد وکلاں نے اپنے ہاتھ سے اس میں مٹی دی۔ وہ مٹی جس سے (قرآن پاک کے الفاظ میں) ہم بنائے گئے اور اسی میں ہم لوٹائے جائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ باہر بھی نکالے جائیں گے۔

ہاں! انسان کی اسی مانوس مٹی میں آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرحوم کو بھی دفن کر دیا گیا

فانا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کا مرثیہ، تنہا ان کا مرثیہ نہیں، خاندان کا مرثیہ ہے۔ شہر عظیم آباد کا مرثیہ ہے۔ علم وفن کا مرثیہ ہے۔ تاریخ وسیر نویسی کا مرثیہ ہے۔ ادب و تنقید نگاری کا مرثیہ ہے۔ انسانیت وشرافت کا مرثیہ ہے۔ اخلاق وبلندئ کردار کا مرثیہ ہے۔ ذہانت وفطانت کا مرثیہ ہے اور خدا بخشے مرنے والے کی بہت سی خوبیوں کا مرثیہ ہے۔

آج پٹنہ کی سرزمین روتی ہے کہ اس کے بطن کی ایک مایۂ ناز ہستی اٹھ گئی۔ علمی دنیا سوگوار ہے کہ ایک اچھا محقق وبلند پایہ مورخ رخصت ہو گیا۔ احباب ورفقا غمگین ہیں کہ ایک صاحب علم اور استاد فن جاتا رہا۔ اقربا اور رشتہ دار محزون ہیں کہ ایک قابل فخر ذات ان سے جدا ہو گئی۔ بلکہ اس ملک کا ہر وہ سنجیدہ طبقہ جو ان سے متعارف تھا، افسردہ ہے کہ میدان تاریخ وسیر نگاری کا ایک اچھا شہسوار ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا:

مضی ابن سعید حین لم یبق مشرق
ولا مغرب الاالہ فیہ مادح

ترجمہ: ابن سعید رخصت ہو گیا درآں حالیکہ مشرق ومغرب کا کوئی متنفس ایسا

نہیں جو اس کے اوصاف کے گن نہ گاتا ہو۔

یوں تو علمی وفنی حیثیت سے مرحوم کو جو مقام حاصل تھا وہ تھا ہی، پر اس سے بھی ماورا ایک اور وصف ان میں تھا جو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے تمام اوصاف پر غالب تھا یعنی بہ حیثیت انسان کے، انسانیت وشرافت کا جو جوہر مرحوم میں بھرا ہوا تھا وہ دیگر تمام حیثیتوں سے یقینا بڑھا ہوا تھا۔ مرحوم انتہائی متواضع، خلیق، نیک دل اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والے انسان واقع ہوئے تھے۔ اپنے تمام عزیزوں اور چھوٹوں پر خاص شفقت وعنایت کی نظر رکھتے تھے اور اپنے تمام دوستوں اور احباب کے لیے خلوص وکرم گستری کا دسترخوان ہمیشہ کشادہ رکھتے تھے۔ مرحوم سے جب بھی اور جس گھڑی بھی ضرورت سے یا بلاضرورت میں ملنے گیا وہ ہمیشہ گرم جوشی کے ساتھ سراپا محبت وشفقت کا مجسمہ بن کر سامنے آئے۔ اور تاریخ وسیر سے متعلق جب بھی کوئی سوال ان سے کیا، اس کا جواب پوری شرح وبسط کے ساتھ انھوں نے دیا۔ بلکہ اس موضوع سے متعلق اپنی تمام معلومات کو مالہ وماعلیہ کے ساتھ پیش فرمادیا اور اس سلسلہ کی جن ہدایات کی بھی ضرورت ہوئی ان کی بھی رہبری فرمادی۔

مرحوم کی عنایتوں اور نوازشوں کی بارش صرف اپنے اعزہ اور احباب ہی کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ ان کا علمی دسترخوان ہر شخص کے لیے کشادہ رہتا تھا۔ اس طرح کی علمی بے تعصبی، کشادگی اور وسعت قلبی میں نے بہت ہی کم لوگوں میں پائی۔ آپ کی معلومات ہر نکتہ داں کے لیے صلائے عام کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جو بھی چاہتا بلاتکلف اس 'خوان یغما' سے ریزہ چین ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شہر پٹنہ کا کوئی بھی صاحب علم، ادیب، مورخ ومحقق ایسا نہیں جس نے مرحوم سے استفادہ نہ کیا ہو۔ بہت سے ایسے مورخ ومحقق، ادیب ونقاد جو آج شہرت ونا موری کے آسمان پر چاند اور تارے بن کر چمکے وہ سب کے سب مرحوم ہی کے خرمن تحقیق وتفتیش کے خوشہ چین تھے۔ بلکہ مرحوم کا علمی فیضان صرف اس شہر والوں ہی کے لیے مخصوص نہ تھا، صوبہ اور بیرون صوبہ کے لوگ بھی بالواسطہ آپ سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

مرحوم انتہائی محنتی اور جفاکش واقع ہوئے تھے۔ ضعیفی اور پیری میں بھی ان کے اندر جوان ہمتی بھری ہوئی تھی۔ بستر علالت پر جبکہ شدت بخار سے سارا بدن تپتار ہتا تھا اس وقت

بھی پلنگ پر لیٹے لیٹے کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں یا کچھ نہ کچھ لکھنے میں مرحوم کو مستغرق دیکھتا تھا۔ اطبا اور ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ محنت شاقہ چھوڑ دیں مگر آخر آخر تک جب تک ان کے ہاتھوں میں جنبش اور آنکھوں میں دم رہا، دوات اور قلم مرحوم کے آگے رہا۔

آج مرحوم ہم سے رخصت ہو گئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرحوم کے کارنامے زندہ ہیں۔ انکی تصنیفات ورشحات پایندہ ہیں۔ ان کے علمی فیوض و برکات کے چشمے جاری ہیں۔ ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی ہے اور باقی رہے گا۔ دنیا میں بہت سے مرنے والے مرجاتے ہیں مگر مستقبل سے تعلق رکھنے والے کبھی بھی نہیں مرتے

العمرک ماواری التراب فعاله

ولکنما واری ثیاباً واعظماً

ترجمہ: تمہاری جان کی قسم مٹی نے مرنے والے کے کارناموں کو نہیں چھپایا اس نے توصرف اس کی ہڈیوں اور کپڑوں کو چھپادیا ہے۔

☆☆☆

تقی حسن بلخی

عقیدت فصیح الدین بہ مخدوم شرف الدین

آہ! کس دل وجگر سے عم محترم سید فصیح الدین بلخی مرحوم ومغفور کے متعلق اظہار خیال کیا جائے اوران کی کن کن خوبیوں پر قلم اٹھایا جائے جبکہ:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

وہ جو سراپا اخلاص وخلوص تھا، وہ جو صاحب فضل وجود تھا، جس کا ہر بول علمی، علمی میدان کے اصناف وفنون میں سند تھا۔ جس کی ساری زندگی دوسروں کو سہارا دینے کے لیے وقف تھی، جس کی حیات مستعار کا ہر لمحہ اطروحہ (تھیسس) لکھنے والوں کو تاریخ وتذکرہ کے تاریک سے تاریک گوشہ وپہلو کو اجاگر بنانے میں مشعل راہ تھا، جس کا وجود خود میرے لیے بھی علمی ومعلوماتی آسودگی کا سب سے بڑا سرچشمہ تھا۔ جس کا ایک ایک لفظ تاریخی وواقعاتی، شخصی وعمومی گم شدہ کڑی کے لیے سبب اتصال تھا۔ الغرض جس کی عظیم شخصیت نہ معلوم کتنے اصناف ونوع بہ نوع خوبیوں اور محاسن کی حامل تھی:

لیس علی اللہ بمستنکران
یجمع العالم فی واحد

آہ وہ ہم سے بچھڑ گیا جس کو قدرت نے تمام خوبیوں سے آراستہ کر کے مجھ تک بھیجا تھا۔ وہ علم وفضل کا سوتا ہی خشک ہو گیا جس سے ہم لوگ سیراب ہوتے تھے۔

آنے والے اور بھی آئیں گے مگر:

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

چوں کہ ان کے ملنے والوں میں ایسے صاحب علم اور صاحب قلم دوستوں اور رفیقوں کی کمی نہیں ہے جو ان کی زندگی کے مختلف ادوار پر نظر رکھتے ہوں اس لیے میرے لیے ناگزیر تھا کہ ایسا پہلو اور زاویہ تلاش کروں جہاں کم ہی لوگوں کی نظر پڑ سکتی ہو۔ خیال آیا کہ کیوں نہیں موصوف مرحوم کی اس عقیدت پر روشنی ڈالی جائے جو مذہب و روحانیت کے ساتھ عموماً اور حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰی منیری کے ساتھ خصوصاً اس مادی دور میں وہ رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ مشکل ہی سے ادراک و احساس کیا جا سکتا ہے کہ ایک مغربی لباس میں رہنے والا نحیف و ناتواں جسم کبھی ایسا حساس و بیقراری دل بھی رکھ سکتا ہے جو ایک ہلکی سی ٹھیس پر تڑپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کو اشکبار بنا دے۔ نہ صرف خود ہی مضطرب ہو بلکہ دوسروں کو بھی تڑپا دے۔ میں نے بار ہا حضرت مخدوم الملک کے ذکر پر ان کی اشکبار آنکھیں دیکھی ہیں۔ میں نے اکثر ان کی زبانی حضرت مخدوم کا تذکرہ جس عقیدت و والہانہ انداز پر سنا ہے، اس کا کیف، اس کی لذت اب تک فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ آخر کس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ مولانا مظفر بلخی، مخدوم حسین بلخی، احمد لنگر دریا بلخی جو انھی کے آبا و اجداد تھے۔ جن کا سارا دیوان منقبت مخدوم الملک سے بھرا پڑا ہے۔ جس نے بلخ کی امارت و سلطنت کو مخدوم کے قدموں پر لا کر نچھاور کر دی۔ جس نے حکومت کی آن سلطنت کی شان کو ٹھکرا کر مخدوم کی دربانی و غلامی کو اپنے لیے مجد و شرف کا باعث سمجھا:

یعلم اللہ بہ طفیل شرف الحق امروز
خیمہ برطارم گردون معلیٰ زدہ ام (حسین بلخی)

بات دور کی ہے مگر مولانا سید حمید الدین بلخی المتخلص بہ اوجؔ تو قریب ہی کے بزرگ ان کے جد امجد تھے جن کے یہ اشعار بھی اسی جذبہ کی ترجمانی کر رہے ہیں اور جسے بڑی عقیدت کے ساتھ عم محترم مرحوم (فصیح الدین بلخی) مجھ سے لکھوا کر لے بھی گئے تھے اور آج اسی عقیدت کے ساتھ پھر مرحوم و مغفور سید فصیح الدین بلخی کے نام پر عرض کر رہا ہوں شاید کہ مرحوم کی روح پاک کو حضرت مخدوم کے طفیل میں سکون و سرور نصیب ہو۔

مرا دعرش کہ باشد مقام شرف الدین | فلک بچرخ کہ گردد بکام شرف الدین
فلک زنظم فتد فتنہ از زمین خیزد | گرش ظہیر نباشد نظام شرف الدین

حدیث ثابت و قال صحیح و کلمۂ حق	ہمہ بیان لب لعل فام شرف الدین
نظر کند نہ بہ جنت بہ گوشۂ چشمی	گدائے درگہ عالی مقام شرف الدین
مرا کہ نسبت فرزندی مظفر کرد	قبول فیض امام ہمام شرف الدین
چہ غم زکشمکش دہر و ہول رستاخیز	زدیم خیمہ بہ دور خیام شرف الدین
غلط چہ لاف زفرزندی وزخیمہ زدن	منم غلام غلام غلام شرف الدین

شہا چہ بیہودہ لافد جز این نمی داند

کمینہ اوجؔ حزین مستہام شرف الدین

حضرت مولانا سید حمید الدین بلخی اوجؔ اپنے وقت کے بہترین عالم اور بے مثل شاعر تھے۔ کچھ کلام ان کا طبع بھی ہو چکا ہے۔ ان کے انتقال کی تاریخ جو مولوی یحیٰی صاحب ابوالعلائی نے لکھی ہے، اس سے ان کی شاعری پر ہلکی سی نظر پڑ جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

اوجؔ سخنداں چوں ازیں خارزار	سوئے گلستان ارم کرد راہ
شور فغاں رفت بہ اوج سپہر	حال احبا شدہ از غم تباہ
خامہ بتاریخ وفاتش نوشت	طوطی شکر شکن فارس آہ

۱۲۷۱ھ

صاحب کیفیت العارفین ص ۲۷۳ پر لکھتے ہیں (جو اس وقت بقید حیات تھے) بسیار خلیق و شفیق صمیمی راقم اند وصیتِ علمیہ دارند بعہدۂ منصفی ماموراند۔

اس تمہید کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مخدوم کے ساتھ یہ عقیدت و وابستگی انھیں وراثتاً ملی تھی اور اسی عقیدت کا یہ اثر تھا جو ایک مقالہ حضرت مخدوم الملک کے عرس پر پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ونشر کیا گیا۔ لوگ انھیں ایک تاریخی دستاویز کہہ لیں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ عقیدت کے وہ چند پھول تھے جو آستانہ مخدوم پر چڑھائے گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے اور حضرت مخدوم ہی کے ساتھ انھیں اٹھائے۔ المرء مع من احب (الحدیث) جو جس سے محبت رکھتا ہے وہ اسی کے ساتھ رہے گا۔

☆☆☆

میں اُنہیں فراموش نہیں کرسکتا

محترم فصیح الدین بلخی صاحب میرے بزرگوں میں تھے۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں مجھ پر ان کی شفقت رہی ہے۔ ایم۔ اے کا طالب علم تھا اور اقبال ہوسٹل میں رہتا تھا۔ نادمؔ بلخی مجھ سے بہت قریب تھے۔ ان کے ساتھ محترم بلخی صاحب کے گھر جاتا رہا ہوں۔ اکثر احمد یوسف اور انیس امام بھی ساتھ ہوئے۔

محترم فصیح الدین بلخی صاحب سے مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ ایسے بزرگوں میں تھے جو ''پڑھا کو نوجوانوں'' کو صرف پسند ہی نہیں کرتے بلکہ جھٹ سے ان کے دوست بن جاتے تھے۔ مجھے بھی اپنا دوست بنالیا تھا۔ مجھے بہت عزیز رکھا اس حد تک کہ محسوس ہوا کہ وہ شکیل الرحمن کو اپنے عالم فاضل بیٹے نادمؔ سے کم نہیں سمجھتے (نادمؔ ہم پر ''علم عروض'' کا رعب قائم کئے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ میں انھیں عالم فاضل سمجھتا رہا ہوں) مجھے دیکھتے ہی محترم فصیح الدین بلخی صاحب کے ہونٹوں پر جو دلکش مسکراہٹ آجاتی تھی اور جس طرح پورا چہرہ چمکنے لگتا تھا اس کا اثر اب بھی قائم ہے۔ ان کا چہرہ جب بھی یاد آتا ہے، اسی دِلکش مسکراہٹ کے ساتھ یاد آتا ہے۔

ہم لوگ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور عجیب دیوانگی طاری تھی ہم سب پر۔ کیونسٹ پارٹی اور کامریڈ لوگوں سے بھی تعلق تھا۔ حد درجہ ''سرخ'' بنے ہوئے تھے۔ آئے دن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ احمد یوسف سکریٹری تھے۔ کرشن چندر، فیضؔ، مجازؔ۔ سب موضوع بنتے۔ رسالوں میں کوئی اہم نظم شائع ہوتی یا کوئی اہم افسانہ چھپتا تو اسے موضوع بنا کر بحث کرتے۔ محترم بلخی صاحب ہم نوجوان ترقی پسندوں کی باتیں غور سے سنتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی کوئی تنقید کی ہو۔ یا یہ کہا ہو کہ یہ غلط ہے۔ ہر بات غور سے سنتے۔ کبھی سوال کر لیتے تو جواب سن کر ظاہر کر دیتے کہ وہ مطمئن ہیں۔ معلوم نہیں وہ مطمئن ہوتے تھے

بھی یا نہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں کسی کی بھی کوئی اچھی نظم نادم، احمد یوسف یا انیس امام سناتے تو تعریف کرتے۔ میں نے ان کا مطالعہ بہت قریب سے تو نہیں کیا اور مجھ میں اتنی صلاحیت کب تھی جو ایسے عالم کی شخصیت کا مطالعہ کرسکتا۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا کہ بلخی صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ ہندوستان سماجی زندگی میں جلد انقلاب آئے۔ بائیں بازو والے معاشرے خوشگوار تبدیلی لے آئیں۔ آزادی تو حاصل کرلی۔ اس سے آگے بڑھنے کے امکانات روشن ہورہے ہیں یا نہیں۔ اپنے کامریڈ لوگوں کی باتیں انھیں سناتے تو بہت غور سے سنتے پھر بولتے تو لگتا وہ اپنے کامریڈوں سے بہت آگے سوچ رہے ہیں۔

درویش صفت، انتہائی نیک، حددرجہ معصوم تھے۔ ہلکی آواز میں گفتگو کرنے والے لیکن اندر سے بہت طاقتور۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر میں نے ہمیشہ علم ہی حاصل کیا ہے۔ صوفیوں اور بزرگوں کے کارناموں سے واقف تھے۔ اکثر ان کی باتیں سناتے۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان وادب کے تعلق سے جو کام ہوا، اس کی تفصیل زبان پر ہوتی۔ سبحان اللہ! کیسی یادداشت تھی۔ پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ کے شعبے سے وابستگی تھی۔ ایک بار میں نے خواہش ظاہر کی تو مجھے اپنے ساتھ ریسرچ کے شعبے میں لے گئے۔ وہاں الماریوں میں اردو کی پرانی کتابیں اور پرانے مخطوطات اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے کوئی ان کا دیکھنے والا ہی نہ ہو۔ پھر الماریوں کے گرد ہر طرف اردو مخطوطات اور پرانی مطبوعہ کتابیں اور ان کے اوراق بکھرے ہوئے تھے۔ گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ جانے کتنے برسوں سے اس طرف صفائی نہیں ہوئی تھی۔ جانے کتنی کتابوں کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ اردو مخطوطات اور پرانی کتابوں کو اس حال میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے پٹنہ یونیورسٹی نے اردو کو اپنی لائبریری سے باہر چھینک دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آج بھی وہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ٹھنڈی سانس نکلنے لگی۔ یونیورسٹی کے ریسرچ کے شعبے میں ایسے منظر کا کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔ میں مرنہ اٹھا تھا۔ محترم فصیح الدین بلخی صاحب نے مجھے ایک پرانی بوسیدہ الماری کے سامنے کھڑا کردیا۔ کہا آپ کتابیں دیکھتے رہیے، میں بھی آتا ہوں۔ کتابیں گرد سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ لیجیے مرا رومال، اسی سے جھاڑ کر دیکھئے۔ میں نے کہا میرے پاس رومال ہے اس سے جھاڑتا رہوں گا۔ وہ مجھے اس الماری کے پاس چھوڑ

کر گم ہو گئے۔ میں الٹ پلٹ کر کتابیں دیکھتا رہا۔ فارسی اور اردو کی پرانی مطبوعہ کتابیں تھیں۔ بعض کتابیں مختلف علوم پر تھیں۔ بلخی صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ الماری بند کی اور آہستہ آہستہ اس جانب آیا کہ جہاں زمین پر سیکڑوں پرانی کتابیں، ان کے پھٹے ہوئے اوراق اور مخطوطات کوڑے کرکٹ کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں ان کے درمیان ایک اسٹول پر بلخی صاحب بیٹھے کسی بوسیدہ کتاب کے اوراق الٹ رہے ہیں۔ عجیب منظر تھا۔ ہر جانب اردو کی پھٹی پرانی کتابیں، ان کے ڈھیر، کوڑے کرکٹ کی طرح، گرد اگرد ماحول اور ان کے درمیان اسٹول پر بیٹھے ہوئے ایک بوسیدہ کتاب میں گم جناب فصیح الدین بلخی صاحب۔ کاش! میرے پاس کیمرہ ہوتا اور میں اس منظر کو اتار لیتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گم ہوتی اس زبان کو درمیان میں بیٹھے ایک بزرگ، خضر کی طرح آب حیات پلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے بلخی صاحب کی جانب دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو کھڑے ہو گئے۔ وہ بوسیدہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ کہنے لگے ''کچھ کتابیں دیکھیں۔'' میں نے کہا حضور! یہ کیا حال ہے۔ اردو کا یہ حشر ہو رہا ہے۔ کیا واقعی یہ زبان مرنے والی ہے؟ خون کھول رہا تھا اور وہ تھے کہ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کا مسکرانا اچھا نہیں لگا مجھے۔ آپ لوگ تو کچھ کیجیے۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ ذرا ادھر دیکھیے۔ میں گھوم کر دیکھتا ہوں، بڑی چھوٹی بوریوں میں اردو فارسی کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ انہیں اس طرح رکھ چھوڑا گیا ہے کہ کباڑیئے اٹھا لے جائیں گے۔ مجھے یاد ہے یہ سب کچھ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ معلوم ہوا یہ سب کتابیں، یہ سب مخطوطات، یہ سب پھٹے پرانے اوراق بس ضائع ہی ہونے والے تھے کہ محترم فصیح الدین بلخی صاحب نے انھیں بچا لیا۔ ان سب کو اس گوشے میں رکھوا دیا اور تنہا ان کی جانچ کرنے لگے۔ جھاڑ جھاڑ کر کتابیں ایک جانب رکھنے لگے۔ ایک ایک کتاب کو سجانا شروع کیا۔ ان تمام کتابوں کو ایک نئی زندگی عطا کرنے کی انھوں نے مسلسل کوشش کی۔ جب تک زندہ رہے یہ کام کرتے رہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ یہ کام کب تک کرتے رہے۔ کتنا کام کر سکے۔ اس لئے کہ ۱۹۵۳ء میں میں نے پٹنہ چھوڑ دیا تھا اور اس کے بعد ان کا نیاز حاصل نہ ہوا۔ مجھے یقین ہے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں فارسی اردو کی پرانی کتابوں، فارسی اردو مخطوطات وغیرہ کا جو ذخیرہ اس وقت موجود ہے، اس کی زندگی قائم رکھنے میں محترم فصیح الدین بلخی صاحب کا بہت بڑا

ہاتھ ہے۔ ان کی وجہ سے بھی ان کتابوں کو آب حیات نصیب ہوا ہے۔

ایک بار جب وہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری آئے تو نادم کو ہوسٹل بھیجا اور مجھے بلوایا۔ میں نادم کے ساتھ وہاں پہنچا تو انہیں اسی اسٹول پر بیٹھا پایا۔ کھڑے ہو گئے۔ مجھے ایک الماری کی جانب لے گئے کہ جہاں کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آیا یہ الماری بہت بری حالت میں تھی۔ ان کی جانب حیرت سے دیکھا۔ پوچھا ''ان کی اتنی اچھی حالت کیسے ہوگئی، پچھلے ماہ تو حالت غیر تھی۔'' نادم فوراً بولے۔ یہ ابا نے خود کیا ہے۔ محترم فصیح الدین بلخی صاحب مسکرا رہے تھے۔ جی چاہا ان کے دست مبارک کو چوم لوں۔ انھوں نے الماری کھولی۔ کہا، آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ یہ الماری سیٹ ہوگئی ہے۔ اس میں صرف وہی کتابیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی ہیں۔ میں نے اور نادم دونوں نے کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ کئی کتابیں ایسی تھیں کہ جن کی خبر بھی نہیں تھی۔ انگریزوں کے لئے کئی ایسی کتابوں کے ترجمے تھے جن کا ذکر فہرستوں میں نہیں ملتا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ فورٹ ولیم کالج کی کتابیں بلخی صاحب کی وجہ سے ایک جگہ ہوگئی ہیں۔ ایک بات بتاؤں۔ انہیں بڑی فکر تھی کہ آنے والے اسکالرز کس قسم کا کام کریں گے۔ ایک بار میں نے گزارش کی تھی کہ وہ موضوعات کا تعین کردیں تاکہ نئے اسکالرز کی نظر پڑے اور وہ اپنی پسند کا موضوع منتخب کرلیں۔ وہ راضی ہو گئے تھے۔ نادم نے لکھنے کی ذمہ داری لے لی تھی۔ شاید وہ یہ کام نہ کرسکے۔ میری یہ خواہش اس لئے تھی کہ کتابوں اور مخطوطوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے اردو اور فارسی کے بہت سے موضوعات سامنے آتے رہتے ہوں گے۔ آنے والے اسکالرز کو فائدہ ہوگا۔

محترم فصیح الدین بلخی صاحب بڑی خوشی سے خدمت کرتے ہوئے گزر گئے۔ انھوں نے اپنے لئے کسی سے کچھ نہیں چاہا۔ اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ الگ تھلگ رہنے والے۔ درویش صفت بزرگ۔ میں انہیں فراموش نہیں کرسکتا۔

فنون لطیفہ اور لٹریچر سے میرے عشق کا یہ ابتدائی دور تھا۔ یہ سمجھیے فنون لطیفہ اور ادب سے عشق کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ محترم فصیح الدین بلخی کے کام اور عمل کو دیکھ کر میں نے یہ جانا، سمجھا کہ فن و ادب سے عشق کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ عمر بھر کا رتجگا ہے۔

☆☆☆

رفعت بلخی

سگریٹ اور راکھ

(ایک تاثر)

کچھ بھولنا اور کچھ یاد رکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اور کچھ ناہموار بھی۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے اب تک بہت سے غیر معمولی واقعات نذر نسیاں ہو گئے اور بعض ایسی چیزیں ابھی تک نقش ذہن ہیں جو بے کار سی ہیں۔ ان یادوں میں بچپن کی ضد، جوانی کے رنگین خواب اور دلکش ارمانوں کا ایک لامتناہی کارواں بھی شامل ہے جو زندگی کا سرور بھی ہے اور سرمایہ بھی۔

بہت دن پہلے (شاید میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا) میں پہلی بار اپنے گاوں سے پٹنہ سٹی آیا تھا۔ پٹنہ سٹی اور پٹنہ میں وہی نسبت ہے جو نئی دلّی کو پرانی دلّی سے ہے۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ آیا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ میں اپنے گاوں کی تمام بہاریں اور ہریالی اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں شروع سے ہی جذباتی واقع ہوا ہوں لہذا جذباتی ہونے کے ناتے اپنے ساتھ کھیت کی وہ مٹی بھی لایا تھا جہاں دھان اور گیہوں کی سنہری بالیاں کنوار کی کٹیلی ہواوں میں ہولے ہولے سردھنتی ہیں۔ اس مٹی نے کبھی شہر نہیں دیکھا تھا۔ میرے گاوں کی مٹی کس قدر ملائم اور سوندھی تھی اور شہر کے راستے، اس کی گلیاں اور بازار کتنے سخت تھے۔ کتنے بے جان۔ یہ میں ساتھ لائی ہوئی معصوم مٹی کو بھی محسوس کرانا چاہتا تھا۔ کس قدر جذباتی تھا میں یا دیوانہ کہہ لیجئے۔ مگر سچ جانیے ہوا کچھ ایسا ہی۔

پچھّم دروازہ میں میری اپنی پھوپھی رہتی تھیں کیونکہ پھوپھا جان مرحوم وہیں محمڈن اینگلوعربک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ امی نے ان سے ملایا۔ ان کے ہاں میرا ہم عمر کوئی بچہ نہ تھا۔ مجھے فضا بڑی اداس معلوم ہوئی اور ماحول بھی بڑا خشک نظر آیا۔ جب شام ہوئی تو میں امی جان کے ساتھ بخشی محلہ گیا۔ ان دنوں ہاتھ رکشا کا رواج تھا۔ یہ جگہ اور بھی غیر مانوس سی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارا خیر مقدم ایک ایسی عورت نے کیا تھا جس کی بینائی بہت کمزور تھی اور جو کمر سے جھک

گئی تھی۔ یہ میں نہ جان سکا کہ وہ ضعیفہ کون تھیں، کہاں کی تھیں اور کہاں گئیں۔ (ہوسکتا ہے اب تک راہی ملک بقا ہوگئی ہوں) ہم دو ایک کمروں سے ہوکر ایک کشادہ دالان میں آئے۔ وہاں بوسیدہ الماریاں تھیں اور الماریوں میں کرم خوردہ کتابیں جن کی چرمی جلدیں جگہ جگہ سے اپنا رنگ کھوچکی تھیں۔ دالان کی صفائی پر دھیان تو دیا گیا تھا مگر یہ خوب آراستہ و پیراستہ نہ تھا۔ ہاں گوشہ دانوں میں کانچ کے گملے اداس کھڑے تھے جن میں نہ کوئی تازہ پھول تھا اور نہ کوئی باسی۔ ایک چوکی تھی جس پر مخمل کی جانماز بچھی تھی اور قریب ہی صندل کی تسبیح رکھی تھی جو کثرت استعمال سے سیاہ ہوگئی تھی۔ میں نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ دیوار پر ایک تصویر بھی آویزاں تھی۔ اس کا فریم بہت پرانا ہوچلا تھا۔ امی نے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بتاو رفعت یہ کون ہیں؟ میں عالم تحیر میں تھا۔ خاموش رہا۔ پھر امی نے پان کی گلوری ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔'یہ تمہاری خالہ ہیں اور وہ سامنے دیوار کی تصویر تمہارے خالو کی ہے۔ فصیح الدین خالو کی۔'

یہ تھے حضرت فصیح الدین بلخی مرحوم جن کی تصویر کی خاموشی میں بھی خفتہ جلال تھا اور میں سبھوں سے الگ انھیں دیکھنے لگا کہ دستک ہوئی۔ کچھ آہٹوں کے بعد رات کے تقریباً آٹھ بجے خود فصیح الدین صاف تشریف لے آئے جنھیں امی نے بڑے احترام سے سلام کیا۔ چھریرہ جسم، میانہ قد، صاف رنگ، گھنی مونچھ اور کشادہ پیشانی والے فصیح الدین بلخی نے مجھے قریب بلاکر مجھ سے میری تعلیم، میرے نصاب اور میرے پسندیدہ مشاغل سے متعلق سوال کرنا شروع کیا۔ میں گھبرایا گھبرایا سا صرف امی کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ میں نے شہر نہیں دیکھا تھا۔ اتنے بڑے آدمیوں کو نہیں دیکھا تھا جو اتنی ساری کتابیں پڑھ کر بھی پڑھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں اور پڑھائی پر بہت سے غیر مانوس اور انوکھے سوالات کرتے ہیں۔ انھوں نے میری خاموشی میں بھی جواب پایا اور تسلی دیتے ہوئے چند ہدایتیں کیں جو بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ہم خالہ جان کے ہاں کوئی پندرہ روز رہے اور اسی اثنا میں پٹنہ سٹی کی سیر بھی کی۔ کیونکہ میری ملاقات اسی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی سے بھی ہوئی جو مجھ سے عمر میں بس دو چار سال ہی بڑے تھے۔ ان کی یاد بھی کچھ کم قیمتی نہیں۔ خیر ہم نے پٹنہ سٹی دیکھا۔ سنگی دالان، شیش محل، خواجہ کلاں، منگل تالاب، دیوان محلہ، بارہ دری - یہ سب نام تاریخی ہیں۔ وہاں کی گلیاں، وہاں کی عمارتیں اور وہاں

کے تمام آثار قدیمہ، تاریخی اقدار کے حامل ہیں۔ ایک دور جب ختم ہوتا ہے تو اپنے پیچھے جانے کون سی اداسی چھوڑ جاتا ہے کہ گلیاں اور بازار سبھی خاموش ہو رہتے ہیں۔ در و دیوار سے فنا کے آنسو ٹپکتے ہیں اور اینٹوں اور شہتیروں کے رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔ پٹنہ سٹی! گہوارۂ علم وادب، مرکز تاریخ وتمدن اور مخزن صنعت وحرفت اب اس قدر اداس ہے کہ کسی سوال کا جواب نہیں ملتا۔ مجھے ان چیزوں کے لیے دل چسپی سی پیدا ہوگئی۔ اور کچھ سال بعد جب میں نے میٹرک کرلیا تو پھر انھی گلیوں کا رخ کیا جو میری دل چسپی اور توجہ کا باعث ہوئی تھیں۔ میں نے حضرت فصیح الدین بلخی سے ملاقات کی کیونکہ بعدہ جب مجھ میں قوت فیصلہ اور فہم وادراک کا سرچی سوتا پھوٹا تو جانا کہ حضرت فصیح الدین بلخی ایک مورخ ہیں۔ ایک ادیب اور ایک شاعر ہیں مگر اس طرح کہ

بہتر ہے صباحی سے قناعت کی زندگی
گوشے میں رہ کے عمر ہم اپنی بسر کریں (فصیح)

بی این کالج (پٹنہ) میں داخلہ لے کر میں زیادہ متحرک ہوگیا۔ دل میں علم وادب اور تاریخ وتمدن کا ذوق مطالعہ چٹکیاں لینے لگا۔ لہذا اسی شوق کے تحت میں نے تاریخ کو آئی۔ اے سے بی اے تک اپنا خصوصی مضمون رکھا اور ساتھ میں اردو ادب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ کچھ فرصت ملی تو میں کسی طور خالو جان کے ہاں ہو آتا۔ وہ بھی میرے اس اشتیاق دید وملاقات کے قائل تھے لہذا پوری توجہ برتتے تھے۔ میں ہر قدم پر ان کی عظمت کا قائل ہوتا گیا۔ ایک دن میں نے کہا 'خالو جان — میں یہاں کی انیٹوں، پتھروں اور گلیوں کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔ مگر یہ گرے ہوئے در و دیوار اور یہ کھنڈرات جو اداسیوں اور خاموشیوں کی جائے پناہ ہیں، میں ان کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔' جواب میں مرحوم نے اپنی گراں قدر تصنیف 'تاریخ مگدھ' بڑھا دی اور کہا۔ 'بہت احتیاط سے مطالعہ کروگے اور کتاب کا خاص خیال رکھوگے، کم یاب ہے۔' میں نے اس کتاب کا شب وروز مطالعہ کیا۔ جس میں مرحوم نے عیسیٰ کی پیدائش کے کئی سو سال قبل سے دور جدید تک مگدھ کے تمام تاریخی واقعات ٹھوس تحقیق کی بنیاد پر قلم بند کیا ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، پراثر اور لطیف تھی۔ ان کی تحریر کبھی طبیعت پر بوجھ نہیں بنی۔ وہ خود بھی زندگی بھر سادگی برتتے رہے۔ رک رک کر بولتے اور کسی موضوع کو چھیڑیے پھر دیکھئے کیا

ہوتا ہے۔ میں ان کی معلومات کی سرحد آج بھی متعین نہ کر سکا ہوں۔ ادھر کسی موضوع پر بات نکلی اور ادھر انھوں نے انتہائی سادگی اور سنجیدگی سے ایک سگریٹ سلگائی اور نہایت مطمئن ہو کر کش لیتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر اس موضوع پر روشنی ڈالنے لگے۔ پاسنگ شو کا ہلکا دھواں ان کا احاطہ کرتا اور خود ہی ناپید ہو جاتا۔ سگریٹ سلگ سلگ کر راکھ کی شکل اختیار کرتی جاتی اور خود بوجھل ہو کر گر جاتی مگر وہ اسے کبھی نہیں جھاڑتے۔ ان کی دو انگلیاں سگریٹ کو سہارا دیتیں اور سگریٹ ان کے حافظے کو۔ حافظہ بلا کا تیز تھا۔ انھیں زندگی کے سارے واقعات سورۂ فاتحہ کی طرح یاد تھے۔ کبھی اپنے عہد طفلی کے عالم خواب وخیال سے گزرتے، گاہے عالم شباب کے رنگ و بو کی شاداب وادیاں طے کرتے۔ بچپن میں کھو گئے تو کیسے ملے؟ زندگی خود ایک میلہ ہے۔ کھو کر آپ ہی منزل پر پہنچنا زیادہ مفید ہے بہ نسبت انگلی پکڑ کر گھر لوٹ آنے کے۔ فن شناوری میں وہ اپنے دیرینہ استاد خان بہادر خاں روہیل کھنڈ کو برابر یاد کرتے تھے اور فن کشتی کے نکات کو جو استاد سے سیکھا تو انھیں بھی کبھی نہ بھولے۔ الغرض وہ زندگی کے اس ڈرامے میں ان کردار و واقعات کو بھی اچھا خاصا مقام دیتے تھے جو بہ ظاہر گرد کارواں تھے۔ انھوں نے خود اپنے متعلق بھی یہی کیا ہے:

حکمت میں گرچہ ہم بھی فلاطوں سے کم نہیں

کیا کیجیے کمی جو مقدر میں رہ گئی

(فصیح) ۱۹۵۷ء

میری زندگی کا اہم باب ختم ہوا اور میں تکمیل تعلیم کے بعد ملازمت میں داخل ہو گیا۔ مرحوم اس وقت تک 'تذکرہ نسوان ہند' مکمل کر چکے تھے۔ ایک موقع پر مجھ سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی کیا۔ ملازمت کی پابندیاں ہر کسی کے لیے قابل احترام نہیں ہوتیں مگر بندگی بے چارگی کے ناطے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں رانچی میں سوا دو سال رہ کر چائی باسا چلا گیا۔ وہاں میرا تبادلہ ترقی کے بعد ہوا تھا جہاں میں کم و بیش سوا برس رہا۔ اور اس طرح مجھے چھوٹا ناگپور کے گھنے جنگلوں، خوش نما پہاڑیوں اور خنک ہواوں کے جادو بھرے اثرات قبول کرنے کا اچھا موقع ملا۔ ۱۹۶۰ء کے نومبر میں میں ڈالٹن گنج آیا۔ یہاں مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے حضرت ابراہیم بلخی المتخلص بہ نادم مقیم تھے۔ وہ مقامی کالج میں شعبۂ اردو کے صدر رہیں۔ بڑے خلوص

سے ملے اور ملتے بھی کیوں نہیں جبکہ ہم ایک ہی ٹہنی کے دو پھول تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں شگفتگی وشایستگی زیادہ ہے اور میں ذرا ناہموار سا ہوں۔ یہاں کی محفل میں بہتوں سے قربت حاصل ہوئی۔ حضرت مہجور شمسی، حضرت مولانا ایوب شمیم ندوی، جناب شعیب راہی، حضرت قتیل کریمی اور جناب رہرو جمالی کے جمال بے مثال نے مجھ میں شمع آرزو فروزاں کی اور میں جو ایک عرصہ سے خاموش تھا پھر سے فسانوں کی طرف لوٹا۔ ۱۹۶۱ء کی ابتدا تھی۔ ڈالٹین گنج کی سرد ہوائیں مشہور ہیں۔ جاڑے کی رات، صاف آسمان، ستاروں کی ضوفشانیاں اور میں اکیلا یوں ہی دور دور تک ویران راہوں میں بھٹکتا رہا۔ یہاں کے درخت زیادہ لامبے تو ہیں مگر گھنے ضرور ہوتے ہیں اور میں فرصت کے اوقات انھی سایوں گزارا آتا۔ کہ نادم بھائی نے یہ خبر سنائی کہ ان کے والد محترم کل بھور کی ٹرین سے آرہے ہیں۔ ہم لوگوں نے بڑی مسرت محسوس کی۔ پھر صبح ہو یا شام حضرت فصیح کے پاس علم وادب کے پروانوں کا مجمع سا لگا رہتا۔ ادھر سورج ڈوبا، چراغ جلے اور اُدھر یاران نکتہ داں نے بزم سخن روشن کی اور ایک شمع کی لو نے سبھوں کے دلوں کو روشنی بخشی۔

دن بھر کا سفر طے کر کے آفتاب جب منزل کے قریب پہنچتا ہے تو اپنی گرمی بھی کھونے لگتا ہے اور اپنی روشنی بھی۔ مرحوم کو گردہ کی شکایت تھی۔ وہ اپنی عمر کی آخری سیڑھی پر پہنچ گئے تھے۔ پیشاب کی تکلیف کبھی کبھی بہت ستاتی تھی۔ جاڑوں کا موسم ان کے لیے اور بھی سخت ہوتا۔ میں خود اپنے والد محترم کی سخت علالت میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ ادھر دو تین سال سے نڈھال نظر آرہے تھے کہ اچانک ایک تار نے مجھے چونکا دیا۔ میں پٹنہ گیا۔ ابا جان مرحوم کو Blood Urea ہو گیا تھا۔ ان کو بچانے کی حتی المقدور کوشش کی گئی تھی مگر وہ جانبر نہ ہو سکے اور مئی کا مہینہ میرے لیے بڑا سخت ثابت ہوا۔ ہم کڑی دھوپ میں آگئے۔ ابا جان مرحوم نے اپنا سفر بہت جلد طے کر لیا اور جب میں انھیں ابدی نیند سلا کر ڈالٹین گنج لوٹا تو خالو جان نے بڑی تسلی دی اور ان کی شفقت نے بڑا کام کیا۔ مگر یہ مسافر بھی بڑا تیز گام تھا۔ سورج چڑھتا اترتا رہا۔ اندھیرے پھیلتے سمٹتے رہے۔ مگر محفلیں کبھی اداس نہ ہوئیں۔ لوگ آتے اور گھڑی بھر کے لیے وہ ضرور شریک بزم ہوتے۔ کس قدر مخلص تھے وہ۔

اتوار کی صبح تھی۔ میں برآمدے میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ جس کرسی پر دراز تھے اوپر سے ٹوٹ چلی تھی۔ میں جب زندگی کی دوڑ میں تھوڑا تھکن محسوس کرتا تو وہ اپنے حالات

بیان کرتے۔ پھر میں سوچتا کہ ایک فوجی افسر جو اپنی ذمہ داریوں کے تقاضوں سے واقف تھا کیوں کر کامیاب شاعر ہوا۔ پونا ملیٹری اسکول کا معلم و مترجم کس طرح ایک مورخ ہوا۔ جزیرۂ فیجی کی عدالت عالیہ کا ترجمان کس طرح ایک صاحب طرز انشا پرداز ہوا۔ یہ سب معما ہی رہا۔ زندگی خود ایک معما ہے۔ بات جزیرۂ فیجی کی نکلی تو وہ پہروں گہرے سمندر کی بے چین لہروں کا تذکرہ کرتے۔ اس جزیرہ کا تذکرہ کرتے جس کے ساحلی علاقوں میں پام اور ناریل کے لامبے لامبے لچکیلے درخت ہوتے ہیں اور جن کی بلندیوں پر بدلیاں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ شرد پورنیما کا شوخ چاند ہو یا اماوس کی اندھیری رات، سمندر کی یہ لہریں بڑی بیباک ہوتی ہیں۔ بڑی ظالم ہوتی ہیں کہ کنارے ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ اور ان سے زیادہ خوفناک جزیرۂ فیجی کے وہ باشندے ہیں جن کے مندروں اور گوفاؤں میں بڑی تاریکی ہوتی ہے۔ اور جن کے سر کے بال سرکنڈے کی طرح کھڑے رہتے ہیں اور جن کی حیران آنکھوں، خوفناک دانتوں اور وحشت ناک چہروں پر انسانی خون کی لیپ چڑھی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے دانت خون میں بھیگے ہوئے ہیں اور ان کے موٹے بھدّے لبوں پر خون کی تازگی کا نشان موجود ہے۔ یہ ضرور مردم خور ہوں گے۔ اور یہی سوچ کر میں فیجی سے جلد ہی واپس آ گیا۔ انھوں نے قصہ ختم کیا۔ یہ زمانہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کا تھا۔ دنیا کی پہلی جنگ عظیم اپنا پنجہ کھولے کھڑی تھی۔

شام ڈھلی اور میں نے روشنی جلاتے ہوئے خود کو ان سے زیادہ قریب کر لیا تاکہ ان کی آنکھوں میں ماضی کا بھیانک پن جھانک سکوں۔

'زندگی اسی نشیب و فراز کا نام ہے رفعت۔ کام ختم نہیں ہوتا۔ ایک کو دوسرے سے ربط ہے۔ تم غور کرو۔ کہاں فورٹ ولیم کالج کی معلمی اور کہاں مشرق وسطیٰ میں اپنے فرائض کی انجام دہی۔' سگریٹ اب بھی سلگ رہی تھی اور دھوئیں اب بھی ان کا احاطہ کر رہے تھے۔ راکھ اب کے زیادہ لامبی ہو کر جھک گئی تھی۔ وہ کھانسنے لگے۔ سامنے ٹیبل پر کچھ اہم مخطوطات رکھے ہوئے تھے اور ان پر محدب شیشہ پیپر ویٹ کا کام کر رہا تھا۔ مشرق وسطیٰ کا جو ذکر آیا تو وہ کچھ بے چین ہو گئے۔ وہاں ان کی ملازمت خالص فوجی نوعیت کی تھی۔ اسکندریہ، دمشق، فلسطین، بیت المقدس اور مصر کے واقعات ہنوز ان کے ذہن میں تازہ تھے۔ قاہرہ کے گرینڈ رائل کا تذکرہ چھڑا تو ساتھ میں اپنے

ملازم پتھر میاں کو بھی بڑے خلوص کے ساتھ یاد کیا۔ یہ پتھر میاں مرحوم کے پرانے نمک خواروں میں تھے۔ جو دراصل طبیعت کے اعتبار سے موم میاں تھے جب ہی تو اپنی دنیا چھوڑ کر صرف مرحوم کی ذات کا بھروسا کر کے سات سمندر پار پریوں کے دیس سے ہو آئے۔ اب نہ ایسے لوگ ملتے ہیں اور نہ ایسے ملازم۔ عرصہ ہوا کہ پتھر میاں کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں اور خیال کے سارے بت تاریکی میں تحلیل ہو گئے۔ ''شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی'' میرؔ کے اس تجربے میں بڑی صداقت ہے۔

۱۹۶۲ء جنوری کا مہینہ۔ پھر وہی ٹھنڈک اور پھر وہی ہوا۔ اب کے تو شاید آسمان بھی برف کی طرح سکڑ کر جم جاتا۔ بعض گرم مقامات کا بھی درجۂ حرارت نقطۂ انجماد تک پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف کہر آلود بھاپ اڑ رہی تھی۔ مرحوم کا درد گردہ بڑھ گیا تھا۔ پیشاب کی تکلیف کے ساتھ دیگر شکایتوں نے بھی فروغ پایا۔ اب کے وہ کچھ زیادہ بے چین نظر آ رہے تھے۔ درد اور تکلیف کے اتار چڑھاو میں بھی شیشے کے ذریعے مطالعہ جاری رہا۔ کس قدر مطالعے کی پیاس تھی ان میں۔

فروری کا مہینہ تھا۔ دھوپ میں نرمی تھی۔ میں ان کے قریب تھا اور وہ خاموشی کے ساتھ انگلینڈ سے آئے ہوئے ایک آفسٹ کا مطالعہ کر رہے تھے جو راجا نند کمار کی پھانسی کے سلسلے کی ایک دل چسپ کڑی تھی۔ یہ آفسٹ پرانی فارسی میں تھا۔ مرحوم اس کا ترجمہ نہ صرف جدید فارسی بلکہ انگریزی میں بھی بڑے انہماک سے کرتے جا رہے تھے۔ پروفیسر بی۔ کے۔ رائے نے اپنی پی ایچ ڈی تھیسیس کے سلسلے میں یہ اہم معلوماتی حصہ اوپر کیا تھا جس کو مرحوم بڑے خلوص کے ساتھ کارآمد ثابت کر رہے تھے۔ مگر حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے ان کو وطن کی طرف کھینچا اور وہ پٹنہ چلے گئے۔ کافی دنوں تک زیر علاج رہے۔ آخر

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

آسمان ادب کا ایک اور تارا ٹوٹا۔ اور شہر خموشاں کے اس تاریک گوشے میں جہاں راسخؔ سے شادؔ اور شادؔ سے عظیمؔ عظیم آبادی تک ایک خاموش قطار ہے۔ ایک اور جا کھڑا ہوا۔ ادوار کی تاریخ کو تحقیق کے سہارے زندہ کرنے والا آج خود ابدی نیند سو گیا۔ اب وہ سگریٹ بھی نہیں جلی جس کا دھواں کبھی ان کی شخصیت کا احاطہ نہ کر سکا۔ اب صرف راکھ ہی راکھ تھی جو خزاں کی آندھیوں کے ذریعہ بہت دور تک پھیل گئی تھی اور جس کے ذرات ہنوز میری یادوں کی تاریک سطح پر کہکشاں کی طرح روشن ہیں۔

☆☆☆

سید عبدالرؤف اورنگ آبادی

فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت

آہ! علم وادب، تاریخ وتحقیق میں یگانۂ روزگار، ادبی اوراثری تحقیقات میں ممتاز اور باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوئی اور پس رواں کے لیے تحقیقات علمیہ اور ادبیہ کے نقش ونگار چھوڑ گئی:

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگارِ رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

خاک عظیم آباد اور مضافات عظیم آباد عجیب مردم خیز ہے کہ ہر دور میں اس خاک پاک سے علم وفضل کی باکمال ہستیاں اٹھیں اور نقش پائدار چھوڑ کر رخصت ہوگئیں۔ مگر مرحوم جیسی نوعیت کی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس دور انحطاط میں مغتنم ذات تھی جو ۶۲ء کے ماہ مارچ میں ہماری علمی وادبی مجلس سے اٹھ گئی:

خدایا برآن تربتِ نامدار   بہ فضلت کہ باران رحمت ببار

تقریب ملاقات: اڑیسہ کی خود مختار ریاست سرائے کیلا میں آپ جب ریونیو آفیسر اور مجسٹریٹ تھے تو سوء اتفاق کہ ریاست مذکور کے نام آور داماد بابو جگن ناتھ سنگھ مہاراجہ ریاست دیو متعلقہ اورنگ آباد کا انتقال ہوگیا اور ان کی چھوٹی بڑی رانیوں میں ریاست مذکور کی وراثت ومالکیت کا تنازعہ پیدا ہوا تو تنازعہ کے فرو کرنے اور بصورتِ مقدمہ پیروی کرنے کو مہاراجہ سرائے کیلا نے آپ کو دیو اور اورنگ آباد میں تا انفصال مقدمہ متعین کر دیا تھا۔ غالباً ۱۹۳۳ء کی یہ افتاد تھی۔ اس سلسلے سے آپ کا قیام اورنگ آباد میں ہوا اور غریب خانہ کے متصل ہی ایک مکان میں مقیم ہوئے۔

موصوف کو ریاست دیو اور راجگانِ دیو کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ضرورت

تھی۔ بندہ اور بندہ کے عم محترم سے دریافت حال کرنے لگے۔ بندہ کے جدِّ محترم حضرت قاضی سید شاہ رجب علی، مہاراجہ برج پرکاش سنگھ بہادر کے سی۔ایس۔آئی ریاست دیواور دیوانِ ریاست بابو مہتا گنیش دت کی اولاد کی تعلیم وتربیت پر متعین تھے۔لہٰذا ریاست مذکورہ کی روایات وحکایات سے پوری واقفیت حاصل تھی اور مزید معلومات بہم پہنچانے کے ذرائع بھی تھے۔مرحوم سے ملاقات اول کی یہ تقریب تھی۔ پھر تو روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔موصوف اس وقت 'تاریخ مگدھ اور بہار' کی تالیف وترتیب میں مشغول تھے۔تواریخ کے نادر مخطوطات اور مطبوعات ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور امپریل لائبریری کلکتہ سے آتی جاتی رہتی تھیں۔اس سلسلے سے بندہ کے متعلق بھی کچھ کام سپرد کردیا تھا۔تاریخ مذکور کی تسوید وترتیب کے بعد اس کی تبییض اور کتابت بھی اورنگ آباد ہی میں ایک عزیز کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔راقم عاجز نواب داؤد خاں قریشی علوی،صوبہ دار بہار اور فاتح پلاموں کے متعلق مخطوطات عربی وفارسی اور فرامین شاہی اور عاملین کے ذریعہ تاریخی مقالہ ترتیب دے رہا تھا۔لہٰذا اس کی درآمدہ تواریخ اور مرتبہ مسودہ سے مزید معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔

مہاراجہ ممدوح جگن ناتھ سنگھ متوفی مہاراج کے داماد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تقریباً دس بارہ برس تک جدِّ محترم کا وہاں قیام رہا ہوگا اور مہاراجہ اور دیوانِ مذکور کی اولاد اور اقربا آپ کی تعلیم میں رہے۔غیر مسلم شاگردوں میں سے اکثر نے آپ کی تعلیمات اور باطنی اثر سے اسلام قبول کرلیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ دیوان صاحب مذکور کے خاندان کے چالیس افراد نے اظہار اسلام کیا۔ان میں کچھ تو ایسے مخلص اور پاک طینت تھے کہ گنج مرادآباد جاکر شیخ وقت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب سے بیعت حاصل کی تھی۔ان بزرگوں کی صحبت میں نے اٹھائی ہے اور بعض سے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔

آپ اصلاً بلخی اور زیدی حسینی ہیں۔آپ کے اجداد میں ایک نام آور بزرگ حضرت سلطان شمس بلخی، ولایت بلخ کی ریاست وحکومت ترک کرکے اہل وعیال کے ہمراہ شاہانِ تُرک کے عہدِ حکومت میں ہندوستان پہنچے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔

اخلاق: آپ کے محاسن اخلاق سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں-تواضع وانکساری، حلم وغمخواری، سیرچشمی وبے نیازی، دریادلی وفیاضی، ریاونمایش سے احتراز، حلاوت لسانی اور

اظہار قابلیت سے پرہیز، طالبانِ علم وفن کے ساتھ شفقت و ہمدردی۔ جس موضوع اور عنوان پر جس نے سوال کیا، اس کو تشفی بخش جواب دیا اور املا کرادیا، کبھی اغماض نہیں کیا۔ علم وفن کا کاروبار اور بیوپار کرنا کبھی نہیں چاہا۔ علم وفن کی فیاضی کے ساتھ مالی فیاضی سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا۔ شکوہ وشکایت کبھی زبان پر نہیں لائے۔ حقد وحسد کا وہم تک پیدا نہیں ہوا۔ ذاتی ضروریات کے لیے بھی کبھی ارباب جاہ واقتدار کی بارگاہ میں باوجود شناسائی اور مراسم دیرینہ کے حاضری نہ دی۔

ہمارے علم و واقفیت میں آپ پر ایسے صبر آزما دور بھی گذرے ہیں کہ پیالہ صبر لبریز ہوجانا چاہیے تھا مگر باہمہ مصائب وآفات صابروشاکر رہے۔ صباریت وشکوریت ان کی طبیعت تھی۔ آپ فرماتے تھے کہ صبر وشکر کی خوبیوں جیسی انسان میں پیدا ہوجائے تو انسان انسان ہوجائے، مگر:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فضائل اور صفات کے چند اطوار ایسے ہیں کہ بلخیوں میں موروثی اور مشترک ہیں: ذکاوت وذہانت، طباعی وجودت، بے نیازی وفیاضی، صبر وشکر، ہمدردی وشفقت۔ یہ خوبیاں ان میں بدرجۂ کمال تھیں:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز دامان گلہ دارد

ادبی خدمات: کتاب حیات کا یہ باب وسیع اور روشن ہے۔ آپ کی علمی وادبی خدمت گزاریوں میں اول درجہ 'تاریخ مگدھ و بہار' ہے۔ بے شبہ بہار کی تاریخ اور بزرگوں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اور لکھی بھی ہے مگر جس ژرف نگاہی اور تحقیق وتعدیل سے آپ نے لکھا ہے، مؤرخین محققین داد دیتے ہیں اور وہ فن کے صحیح معیار پر بھی اترتی ہے۔ جس دور اور عہد کے جو واقعات درج کتاب ہیں، مستند ہیں۔

مرحوم کا اہم اور نمایاں کارنامہ اثری انکشافات وتحقیقات ہے۔ صوبہ بہار کے بیشتر تاریخی مقامات کے آثار قدیمہ کے کتبات انھوں نے نقل کیے اور بڑی کاوش و دیدہ ریزی سے نقل کیے ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت دریافت کر کے ان پر نوٹ بھی لکھا ہے۔ اثری تحقیقات کا ذخیرہ ضخیم جلد میں مرتب ہے مگر مخطوطہ ہے۔ یہی مخطوطہ 'تاریخ مگدھ و بہار' کی دوسری جلد ہوگی۔

ان شاء اللہ۔ اثری تحقیقات کے معلومات پر عبور حاصل کرنے کے لیے ان کو عربی فارسی انگریزی [کے علاوہ] پالی زبان بھی ہارج ہوئی تھی۔ مضافات اورنگ آباد میں مدن پورتھانہ کے پہاڑ کی ایک شاخ اومگا نامی ہے جس پر بودھ کا مندر اور تالاب وحوض وغیرہ بھی ہے۔ مندر کے اندر پالی زبان بس ایک کتبہ پتھر پر کندہ ہے جس میں ریاست دیو کی کچھ تاریخی معلومات ہیں۔ انھوں نے اس کا معائنہ کیا تو فوراً اس کا چربہ لے لیا اور کسی ماہر زبان پالی کی مدد سے اس کے معلومات حاصل کر کے ریاست دیو کے ایک مقدمہ مندائرہ ہائی کورٹ پٹنا اور پریوی کونسل میں اس کو پیش کرادیا جس کے سبب انھوں نے موافقت میں ڈگری حاصل کی تھی۔

شعر گوئی: ان کو شعر گوئی سے بھی مذاق تھا اور پاکیزہ مذاق تھا۔ مگر اصناف شاعری میں قطعات اور تاریخی قطعات پر طبع آزمائی کرتے میں نے پایا ہے۔ راقم کے پاس ان کے دو تاریخی قطعات ہیں جو ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں:

قطعات:

اول قطعہ تاریخ برائے جامع مسجد اورنگ آباد ضلع گیا

سرنامۂ قطعہ: ان المسجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احد

در زمانِ سعید، حامی دین — شاہِ اورنگ زیبِ عالم گیر
خانِ والا گہر، فدائی خان — از برائے رضای ربِّ قدیر
بر سرِ راہِ مسجدِ جامع — ساخت بہرِ نمازیانِ کثیر
دل عبادت گہِ خدا گفتا — پی سال بنای این تعمیر

۱۱۵۷ھ

دوم قطعہ تاریخ برائے لوح مزار سید حفیظ الدین بلخی مرحوم، برادر مکرم فصیح الدین بلخی مرحوم:

سرنامہ: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

جان بہ جان آفرین سپرد آخر — آن کریمی کہ بود مرد سخی
رونق خاندان، حفیظ الدین — صاحب فضل، بلخیِ نامی
زانکہ از نسل ابنِ ادہم بود — ہست ظاہر شرافتِ لبنی

کانِ احسان و معدن اخلاص　　منبع فیض و منبع خوبی
ذی مروت، حنیق، دریا دل　　صاحبِ جود و ہمتِ عالی
نکتہ دان و ادیب و دانشمند　　ماہر علم و فن، فہیم و ذکی
قائلِ لا الہ الا اللہ　　پیروِ دینِ حق، محبِّ نبیؐ
مسجد کہنہ در وطن نو کرد　　از برای رضای ربِّ کریم

شاہراہِ شیر شاہی پر چوک بازار میں یہ کہنہ مسجد جامع کے نام سے زبان زد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد عہد عالم گیری کی یادگار ہے۔ مگر کوئی کتبہ کندہ نہیں ہے۔ راقم نے تعمیر نو کے لیے ان سے تاریخی قطعہ کی فرمائش کی کہ سنگ مرمر پر کندہ کرا کے نصب کرادوں تا کہ اس کی تاریخی حیثیت عوام کو معلوم ہو جائے:

رفت از مرگِ او سرورِ دلم　　گم شد از دل نشانِ زندہ دلی
زورِ بازوی من اجل بشکست　　دور ماندم ز بی پر و بالی
سالِ فوتش دلِ حزینِ فصیحؔ　　گفت: فردوس آشیان بلخی
=۱۳۵۴ھ

ان کے مذاق شاعری اور نقد شعر و سخن کا اندازہ آپ کے کتابچہ 'انشاد شاذ' سے ہو سکتا ہے کہ استاد الشعرا شاد عظیم آبادی کے ظاہری و باطنی، لفظی و معنوی معائب و محاسن کی جزوی گرفت کی گئی ہے۔ ان کے معیار پر اساتذۂ سخن کے کلام بھی نہیں اترتے۔

مرحوم کے عقائد اسلامی بہت صاف اور صحیح تھے۔ حضرت مخدوم جہاں اور ان کے خلفاے نامدار حضرت مولانا مظفر بلخی اور حضرت حسین نوشہ توحید سے عقیدت خاص تھی نیز حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندانِ ولی اللہی کے افراد سے عقیدت تھی۔ لہٰذا ان کے معتقدات سب کچھ وہی تھے جو ان حضرات کے متوسلین کے تھے۔ نماز کے پابند نہ تھے مگر تنہا اور جماعت سے پڑھا کرتے تھے۔ سفر و حضر میں رفیق رہ کر ان باتوں کا مجھے اندازہ ہوا ہے۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کے پابند تو نہ تھے مگر اس کی تلاوت ہی کو وظیفہ خیال کرتے تھے۔ ان کو آیات قرآنی کے ترجمے اور مطالب پر عبور تھا۔ گاہے گاہے سند کے طور پر پیش کیا کرتے تھے۔ ان کو بدعات

اور لایعنی رسوم سے نفرت اور پرہیز تھا۔ بدعات سے احتراز ان کو رواثت میں ملی تھی۔ آپ ارادتاً فردوسی سلسلہ سے ارادت رکھتے تھے اور مشرباً حنفی تھے۔

وضع: بے شبہ آپ کے حلیہ اور وضع میں اور باطن میں بہت تفاوت تھا۔ آپ کو انگریزی وضع ولباس کا پابند دیکھا مگر آپ کا باطن درویشانہ اور صوفیانہ تھا۔ بمصداق 'درویش صفت باش کلاہ تتری دار'۔ وضع میں آزاد تھے:

خدایا بر آن تربتِ نامدار   بہ فضلت کہ باران رحمت ببار

☆☆☆

عبدالمغنی

... سو وہ بھی خموش ہے

'بلخی صاحب' کا ذکر بچپن سے گھر مین سنتا آیا تھا۔ سمجھتا تھا والد صاحب کے کوئی بہت گہرے دوست ہیں جن کے چرچے کی وجہ ذاتی تعلقات ہیں۔ بس ایک قسم کی رشتہ داری، یگانگت اور خلوص۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ اُس زمانے میں میرے لیے، میر گھر کی حد تک بات ایسی ہی کچھ تھی۔ لیکن جیسے جیسے شعور بڑھتا گیا اور گھر سے باہر کی فضا میں علم و ادب کی ہوائیں لگنی شروع ہوئیں اس معصوم تخیل پر علم و فضل کے وقار اور احترام کی تہیں چڑھتی گئیں۔ اب بلخی صاحب کی تصویر میں جناب فصیح الدین بلخی کے نقوش ابھرنے لگے۔

یہاں تک کہ ۴۹ء کے وسط میں تعلیم کے لیے جب عظیم آباد پہنچا تو علم و ادب کی متعدد بساطوں کے ساتھ ایک تکیہ گذری پٹنہ سٹی میں قلندر کا بھی نظر آیا جسے اب میں نے فصیح الدین بلخی کی حیثیت سے جاننا اور پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ در اصل یہاں مجھے قلندروں کی جوڑی نظر آئی۔ دوسرے قلندر جناب حسن عسکری ہیں۔ تیسرا کوئی نہیں۔ بہار میں تاریخی تحقیق کی داستان دو ہی درویشوں پر مشتمل مشہور ہے۔ گرچہ ان دونوں درویشوں کو میں نے ایک تیسرے درویش، اپنے والد مولانا سید عبدالروف اورنگ آبادی کے ذریعہ جانا۔ لیکن اس عوامی احتمال کے پیش نظر کہ شاید میری یہ باوسیلہ معرفت محض انفرادی وذاتی ہو، میں قصے کو دو ہی درویشوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

ہاں تو عظیم آباد میں مجھے قلندروں کی جوڑی نظر آئی۔ ایک بلخی، دوسرا عسکری۔ ان صاحبوں کے متعلق لفظ قلندر پر اگر آپ کو یقین نہ آئے تو مرحوم وموجود کی صورت وسیرت کے متعلق آپ ان کے کسی واقفِ حال سے پوچھ لیجیے۔ اگر بدقسمتی سے آپ کو ان حضرات کی دید وشنید کا ذاتی موقع نہ ملا ہو۔ قلندری کے اوصاف اس تثنیے میں اتنے نمایاں کہ صرف ان کا بیان

سن کر آپ انھیں پورے شہر میں ڈھونڈ نکال سکتے تھے۔ بہر حال، یہ عجیب بات ہے کہ شغل میں یکساں ہونے کے باوجود وضع میں یہ قلندر ایک دوسرے سے قطبین کے فاصلے پر واقع ہوئے۔ بلخی صاحب کبھی شروانی اور پا جامے میں نہیں نظر آئے۔ عسکری صاحب کبھی کوٹ اور پتلون میں دکھائی نہ دیے۔ لباس کا یہ فرق داشت کے فرق تک پہنچ گیا۔ بلخی صاحب اپنی قطع میں سر سے پاوں تک سجل، عسکری صاحب بالکل آشفتہ مو۔ یہاں تک کہ رخ اور رفتار کا انداز تک جداگانہ۔ عسکری صاحب کے چہرے اور چال میں پارے کی تلملاہٹ۔ بلخی صاحب نہایت اطمینان اور متانت کے ساتھ نظر ڈالتے قدم اٹھاتے ہوئے۔ اسی طرح بلخی صاحب کی گفتگو میں شبنم کی پھوار اور عسکری صاحب کے مکالمے میں بارش کا سیلان۔ لیکن ایک بنیادی جوہر جو دونوں میں مشترک ہے اور شاید یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں سے باہمی اتفاق کے وہ تمام زاویے نکلتے ہیں جو دونوں کو ایک ہی دائرے میں متحد کر دیتے ہیں یعنی ایک انوکھی وضعداری:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

انوکھی وضع کے یہ عاشق تحقیق بڑی استواری کے ساتھ اپنی مخصوص قماش کے تاعمر وفادار رہے۔ اس معاملے میں فی الوقع انھیں 'اصل ایمان' کا تاج دار قرار دینا چاہیے۔ زمانے نے کتنی ہی کروٹیں لیں لیکن یہ قطب اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ استقلال کا یہ عالم کہ جس سے ایک بار خلوص ہو گیا اس سے بدگمانی کی پھر کوئی گنجایش نہیں رہ گئی۔ فیض عام کی تمکنت یہ کہ کس کے ساتھ ساتھ ناکس کی مدد بھی اپنے پر فرض کر لی، اگر وہ جستجو کی کشکول لیے ایک بار در پر حاضر ہو گیا۔

یہ سادہ طبعی بلخی صاحب کے یہاں زیادہ باضابطگی کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ یہ خصوصیت مرحوم کی اس رواداری، خلوص اور فیاضی کی دلیل ہے جن کے سبب وہ محاورے میں بے ہمہ و باہمہ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی پاور بلاک سے وابستہ نہیں ہوئے ہمیشہ غیر جانبدار رہے۔ لیکن مرنجان مرنج ہونے کی یہ نیکی بعض وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ معقول و نامعقول کی تمیز بھی عملاً نہیں رہ جاتی تھی۔ اور اس سادگی سے غلط قسم کے لوگ فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ قدرت جب بخشش کی طرف مائل ہوتی ہے تو بعض اوقات 'غلط بخشی' بھی کر

جاتی ہے۔ یہ بات قدرت کی شان کے جتنا بھی شایان ہو، عالم آب وگل میں بسنے والی مخلوق کے لیے ساز گار نہیں ہوتی۔

بہرحال اپنی اسی خانہ براندازی کے سبب بلخی صاحب کی ذات بہار خصوصاً عظیم آباد میں ہونے والے ہر علمی کام کا مرجع امید تھی۔ کسی قسم کا کوئی کام ہو وہ امکان بھر مدد کے لیے فوراً تیار ہو جاتے تھے اور اپنے کثیر مشاغل کے درمیان اس کے لیے باضابطہ وقت نکالتے تھے۔ اس معاملے میں کبھی ذاتی پسند وناپسند کو دخل نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ مخالف وموافق کا امتیاز بھی اٹھا دیتے تھے۔ اس عالی ظرفی کا ایک راست تجربہ تو خود مجھ کو ہوا۔ میں ۵۹ء میں پٹنہ یونیورسٹی کی 'بزم ادب' کے زیر اہتمام 'یوم شاد عظیم آبادی' منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بلخی صاحب ایک زمانے میں شادؔ کی علمی مخالفت کے سرابرہوں میں رہ چکے ہیں۔ چنانچہ فن شاعری میں شادؔ کے نقایص کو ایک رسالے 'انشاد شاد' میں بیان بھی کر چکے ہیں۔ اس پس منظر میں میرا گمان تھا کہ شاید وہ مجھ سے تعاون نہ کریں۔ لیکن اس دور کے عظیم آباد اور اس میں شادؔ کے معاملات کی واقفیت بلخی صاحب سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں تھی۔ وہ بیشتر معاصر معرکوں کے شاہد عینی اور بعض میں شریک کار تھے۔ لہٰذا ۵۹ء میں شادؔ کے 'رہ گذر' کا سراغ لگانے کے لیے بلخی صاحب کے در پر ہزار بار جانا ہی پڑا۔

میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں پہنچا تو ایک بزرگ بالکل خضر صورت کرم خوردہ وبوسیدہ نوادر کے انبار میں گم ان ہی کا ایک حصہ نظر آئے۔ لاغر اور نحیف بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ، چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا، سر سے ابرو تک سفید۔ بلخی صاحب گرد وپیش سے غافل چشمہ لگائے حروف ونقوش پارینہ پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کا جذب وانہماک کچھ ایسا تھا جیسے بین السطور میں صدیوں قبل کے اس مشرق کی جستجو کر رہے ہوں، بلکہ اس کی فضاؤں میں پہنچ گئے ہوں جو مغربی وضع قطع کے باوجود ان کے دل ودماغ پر کسی نیک روح کی طرح چھایا ہوا تھا۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

میں نے ان کے انہماک اور خود اپنے تصور میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کیا۔ قریب ہی

کھڑا کئی منٹ تک اس خیال انگیز مظہر معانی میں کھویا رہا۔ یہاں تک کہ بلخی صاحب خود مجھے آثار قدیمہ کا ایک عجوبہ محسوس ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی طلسم خانے میں کھڑا ہوں اور میرے سامنے جو ہیولا کرسی پر ساکت ہے وہ فقط روح ہے۔ معلوم نہیں کیوں تخیل کی رو اور کیا کیا گل کھلاتی کہ یکا یک ساکت ہیولے کو جنبش ہوئی۔ آہستہ آہستہ دو آنکھیں اوپر اٹھیں اور میرے چہرے پر بغیر کسی اظہار کے ٹک گئیں۔ غالب کا شعر بجلی کی طرح حافظے میں کوند گیا:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

دوسرے لمحے میں پہچان گئے۔ میرے سلام کرنے کے بعد۔ کرسی کی طرف بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ خیریت کے بعد مدعا پوچھا۔ اس کے بعد بغیر کسی تامل اور تکلف کے گھنٹے بھر اس ولولے سے باتیں کرتے رہے جیسے اس موقع کے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ جیسے 'یوم شاد' کا انعقاد ان ہی کی تجویز پر ہو رہا ہو۔

اس کے بعد اس سلسلے میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ دفتر میں بھی، گھر پر بھی۔ خوب باتیں بھی کیں، کھلایا پلایا بھی۔ اس کام میں توقع کے خلاف اتنی دل چسپی لی کہ نہ صرف پرانے کاغذات و دستاویزات کی گرد جھاڑی بلکہ اپنی جانب سے جلسے کی شانداری کے لیے بہتیری تجاویز بھی پیش کیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعمیل کے وسائل صرف بتائے نہیں، انھیں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ بعض ضروری مسائل کے متعلق کچھ یادداشتیں بھی قلم بند کر کے دیں۔

آپ سمجھتے ہوں گے، شاید شادؔ کے متعلق ان کے خیالات بدل گئے ہوں اور وہ، انھیں پسند کرنے لگے ہوں۔ لیکن آپ کو سن کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ یوم شادؔ کے متعلق مذکورہ تمام کرم فرمائیوں کے ساتھ ہی بلخی صاحب نے خاص اہتمام کے ساتھ مجھے اپنے کتابچے 'انشاد شاد' کا ایک نسخہ بھی دیا اور اس تمہید کے ساتھ دیا کہ شادؔ کی شاعرانہ عظمت مسلم، لیکن ان کے نقائص کو بھی پیش کرنا چاہیے تا کہ ان کی پوری شخصیت دیانت داری کے ساتھ سامنے آئے ورنہ علم و تحقیق کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بلخی صاحب کی یہ انسانیت وسیع المشربی تک پہنچ گئی تھی۔ عمر کے درمیانی حصے میں وہ 'اجزائے ایماں' کی جستجو میں لگے گئے تھے۔ یہاں تک کہ 'جویائے حق' اپنی گہری اسلامیت کے باوصف اشتراکیت تک کو گوارکرنے لگا تھا۔ بہرحال عقیدے کی یہ لچک داری کسی مصالحت اور مداہنت کے طور پر نہیں تھی۔ غرض مندی اور مفاد پسندی سے مرحوم بہت بالا تھے۔ یہ وسیع المشربی دراصل اس صوفیت کی ایک شکل تھی جو بلخی خاندان کا امتیازی ورثہ رہا ہے۔ یہ بس ایک طرح کی قلندری تھی۔ اس کی حقیقت ذیل کے واقعے سے واضح ہوجائے گی۔

ایک بار بلخی صاحب میرے گھر پر یا اپنے ہی گھر میں والد صاحب اور ہم لوگوں سے مصروف گفتگو تھے۔ موضوع اسلام کی تبلیغ تھا۔ بلخی صاحب پہلے تو اس کی ضرورت اور اہمیت پر بولتے رہے۔ اس کے بعد تبلیغ کی عملی تدبیر کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے ایک چونکا دینے والی بات کہی۔ کہتے ہیں 'کسی کو مسلمان بنانے کے لیے پہلے کلمہ پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی بجائے اس سب سے پہلے ان صالح اعمال کی تلقین کی جائے جنھیں وہ عام انسانی نیکی سمجھ کر قبول کرلے۔ عرصے تک اسی طرح اس کے ذہن کو تیار کیا جائے۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ خود کلمہ پڑھ لے گا۔ اس لیے کہ عملی سچائیاں ہر دھرم میں یکساں ہیں چنانچہ ابتدا اسی نقطۂ اتفاق سے کی جائے تاکہ دوسروں کو وحشت نہیں ہو اور وہ مانوس اور غیر محسوس طور پر' خالص انسانیت کے واسطے' بہ رضا ورغبت آپ کا رنگ اختیار کرلیں'

اس تدبیر کی عملی تفصیلات کی حکمت اور نتیجہ خیزی پر گفتگو کا موقع نہیں۔ اس سے جو حقیقت دریافت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بلخی صاحب کا دل اپنی طلب میں صادق تھا' اسلام سے ایک نظریے کے طور پر انھیں گہرا شغف تھا اور اس دین کی بہبودی کے لیے وہ دردمندی اور دانش مندی دونوں سے بہرہ ور تھے۔ چنانچہ یہ 'جستجوے صداقت' بالآخر' گھبرا کے سوے مطلوب گئی۔ رحلت سے ذرا قبل کا یہ واقعہ حقیقت کشا ہے۔

پچھم دروازے (پٹنہ سٹی) میں ایک صاحب جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ موصوف کی چھوٹی سی کپڑے کی ایک دوکان سڑک کے کنارے ہی واقع ہے۔ ایک بار اتفاقاً میں ایک دوست کی تلاش میں اُدھر جا نکلا تو بلخی صاحب کو وہاں بے تکلفی سے مصروف گفتگو پایا۔ بلخی صاحب

ہی نے صاحب دوکان سے میرا تعارف بھی کرایا۔ یہ واقعہ انتقال سے چند مہینے پیشتر کا ہے۔
بہر حال ان ہی صاحب کا بیان ایک معتبر دوست سے سننے میں آیا کہ موت سے چندروز قبل جب وہ بلخی صاحب کی عیادت کو گئے تو موصوف نے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ اب ان کی زندگی کا تو آخری لمحہ ہے' آپ لوگ اس دور میں اسلام کا کام جس طریق پر کررہے ہیں وہی نتیجہ خیز ہے، خدا آپ کے کاموں میں برکت دے اور آپ کو ثابت قدم رکھے۔ میرے حق میں دعائے خیر کیجئے۔' معلوم ہوا کہ ادھر کچھ عرصے سے جماعت اسلامی کا لٹریچر زیر مطالعہ تھا اور وہ اس سے بہت متاثر تھے۔

اس واقعہ سے بلخی صاحب کی شخصیت کے ایک اور اہم پہلو کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ یہ کہ پیرانہ سالی اور آثار قدیمہ سے دل چسپی نے ان کو جامد اور خشک نہیں بنادیا تھا۔ ان کا ذہن نہایت متحرک اور ارتقاپذیر تھا۔ زندگی سے ان کی دل چسپی جوانوں جیسی تھی اور علم ودانش کی طلب وجستجو میں ویسا ہی ولولہ تھا جیسا ایک نوجوان طالب علم کے سینے میں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موصوف نے عمر کے تفاوت کے باوجود کبھی ہمارے ساتھ بزرگ سالی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اپنے نوخیز نیازمندوں کو بھی دوستوں کی طرح برتا۔ مجھے یاد نہیں کہ بلخی صاحب نے کبھی ہمارے سامنے آج کل کے نوجوانوں کی بے تمیزی کا شکوہ یا ماضی کے آداب واطوار کا تذکرہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ کبھی ان اخلاقی قدروں کا بھی ذکر نہیں کیا جنھیں بجا طور پر صدیوں کی آزمودگی کا تقدس حاصل ہے۔ وہ خود بڑے وضعدار اور رکھ رکھاو کے آدمی تھے۔ لیکن اس خوبی کی تلقین کبھی ان سے سنی نہیں گئی۔ ممکن ہے اس معاملے میں کچھ طبعی حجاب کو بھی دخل ہو' جو مرحوم کی فطری حیاداری اور منکسر مزاجی کا مظہر ہوسکتا ہے۔ لیکن نمایاں بات ان کی طبیعت کی تازگی اور شگفتگی ہے۔ ضعیفی میں قویٰ کا وہ استقلال جو بلخی صاحب کی کارکردگی اور مستعدی کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا یقیناً اس کا راز یہی جوش طبعی ہے۔

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

یہی سب ہے کہ موصوف نہ 'آئین نو' سے ڈرے اور نہ 'طرز کہن' پہ اڑے۔

بلخی صاحب کے متعلق یہ ساری باتیں اب یاد آرہی ہیں تو بڑی حسرت ہورہی ہے۔ اتنی قربت کے باوجود موصوف سے میرا ربط بہت محدود تھا۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر محققوں کا

جو مُتقشفانہ انداز ہے اس سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ پھر تحقیق کو جو محض اعداد و شمار کی کھتونی بنا دیا گیا ہے اس سے سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور ان سب پر مستزاد بعض محققوں کی وہ کلبیانہ ذہنیت ہے جو ہر بات میں کیڑے نکالنے پر تلی رہتی ہے۔ بلخی صاحب کی ظاہری ہیئت سے میں ان کے بارے میں بھی کچھ اسی قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نہایت احترام کرنے اور ان کے متعلق قریبی ذرائع سے بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے ان سے قریب ہونے کا موقع بہت دیر سے ملا۔ راست اور پیہم روابط وہی 'یوم شاد' کے سلسلے میں قائم ہوئے حالاں کہ یونیورسٹی میں اور اس کے اردگرد ان سے ملاقات بات اکثر ہوتی رہی اور ان کی بہتیری نقل و حرکت کے مشاہدے کا بھی موقع ملا:

'افسوس تجھ کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی'

☆☆☆

ضیا عظیم آبادی

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

دراز قد، کھلتی ہوئی رنگت، چھریرا بدن اور عینک کے اندر سے جھانکتی ہوئیں پر اثر آنکھیں۔ یہ تھے ہمارے بزرگ بلکہ ہر رہروان علم وادب کے بزرگ سید فصیح الدین بلخی مرحوم۔ مرحوم کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی ہے اور کلیجہ منھ کو آ رہا ہے۔ بوڑھے ہو چکے تھے۔ کمر خم ہونے پر تلی ہوئی تھی مگر زندگی کی حرارت اپنے پورے شباب پر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان گنت نوجوانوں پر بھاری ہیں۔ دفتر کے وقت سے کچھ پہلے ہی انگریزی لباس زیب تن کئے سڑک پر بس کے انتظار میں آ کھڑے ہوتے۔ قیام سٹی میں تھا اور یونیورسٹی بانکی پور میں۔ خاصہ فاصلہ۔ چاہتے تھے کبھی یہ فاصلہ پہنچنے میں تاخیر نہ ہونے دے ورنہ وضعداری میں فرق آ جائے گا۔
وضعداری طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ انگریزی لباس سے جو یارانہ قائم کیا تو مرتے مرتے نبھا دیا۔ بھلا ایسے اصول کے پکے اب کہاں دکھائی دیں گے؟ خدمت علم وادب کا جذبہ کبھی سرد نہیں پڑا۔ سوچتا ہوں نحیف جسم میں کتنی جان تھی۔ کس بلا کا دل گردہ تھا۔ انقلاب کے ہاتھوں مجروح ہوئے۔ پٹنہ میں مستقل قیام کرنا پڑا۔ گھریلو ذمہ داریوں نے ہر وقت آنکھیں دکھائیں مگر کبھی اونچی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن بھی تو نمودار نہ ہوئی۔ وہی تحقیق کا جذبہ۔ اسی طرح تاریخ کی چھان بین۔ بدستور تذکرہ نویسی کی طرف مائل۔ عروس ادب وانشا کی زلفیں سنوارنے میں مشغول۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنے سارے اصناف میں جوہر دکھانے کے لیے وقت کیونکر نکال لیتے تھے وہ۔ پھر ہر چھوٹے بڑے سے ملنے میں بھی مشاق۔ مجال کیا جو کبھی کسی کا دل توڑ دیں۔ اور یہ سمجھ کر منھ نہ لگائیں 'بھلا اس کا میرا کیا مقابلہ'۔ احساس برتری تو نام کو بھی نہیں تھا۔ حسن اخلاق کی مکمل تصویر۔ انسانیت کا جیتا جاگتا مرقع۔ کاش ہمیں زیارت سے فیضیاب

ہونے کا ابھی اور موقع ملتا رہتا اور ہم کسب نور کرتے ہوئے منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہتے۔ مرحوم سچ مچ ایک نور تھے۔ علم وفن کا نور۔ مجھے خوب یاد ہے برسات کی پر کیف فضا میں ہم وہ ایک ہی بس میں سٹی سے بانکی پور جا رہے تھے۔ رم جھم کا سلسلہ جاری تھا۔ اودی اودی گھٹاؤں کا جال حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور میں نے ان سے فراعین مصر کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنا چاہی تھی۔ میرا ارادہ قدیم مصری پس منظر میں ایک طویل ناول لکھنے کا تھا اور مجھے صحیح حالات معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ کچھ لوگوں سے میں نے دریافت بھی کیا تھا مگر تشفی بخش جوابات نہ مل سکے تھے۔ مرحوم بزرگ نے شفقت آمیز لب ولہجے میں پوچھا۔ کون سے فرعون پر ناول لکھنے کا خیال ہے۔ فرعون تو بہت سے گزرے ہیں۔ اور پھر ایک بحر ذخار تھا جو ابل پڑا۔ واقفیت کا خزانہ تھا جو کھل گیا اور در علم تھا جو آواز دیتے ہی وا ہو گیا۔ میں یونیورسٹی لائبریری تک ان کے ساتھ گیا اور جو کچھ نوٹ اس سلسلے میں میرے پاس محفوظ ہیں وہ سب انھی کا عطیہ ہیں۔

مرحوم بہ ظاہر بڑے روکھے اور خشک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن بلا کے بذلہ سنج تھے۔ میں اسلامیہ ہائی اسکول کلکتہ کی معلمی کو خیر باد کہہ کر پٹنہ آیا تھا۔ تفکرات کا غلبہ تھا۔ ماں مرحومہ ٹی۔ بی میں مبتلا تھیں۔ دل ودماغ صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔ بے سروسامانی بڑھتی جا رہی تھی۔ رخش عمر اس طرح رو میں تھا کہ بقول غالب: نہ ہاتھ باگ پر نظر آ رہے تھے نہ پاؤں رکاب میں۔ آشیانہ اجڑ رہا تھا اور ہم ناتواں حسرت ویاس کے ہجوم میں دیکھ رہے تھے اور جب اس روح فرسا نظارے سے طبیعت گھبرا اٹھتی تھی تو دو گھڑی تازہ دم ہونے کے لیے بلخی صاحب کی بارگاہ میں حاضری ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ سارے کام چھوڑ کر متوجہ ہو جاتے تھے اور زخم دل پر پھاہا رکھنے کے لیے ایسی باتیں کرنے لگتے تھے جو حالات سے آخری وقت تک لڑتے رہنے کے لیے آمادہ کر دیتی تھیں۔ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی آشنا ہو کہ اگر بزرگ محترم مولانا فصیح الدین بلخی صاحب میری رہنمائی نہ کرتے تو جن حالات سے مجھے گزرنا پڑ رہا تھا وہ یقیناً مجھے خودکشی کی ترغیب دیتے اور میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ مگر وہ 'خود جیو اور دوسروں کو جینے دو' کے اصول پر کاربند تھے۔ بھلا یہ کہاں ممکن تھا کہ ان سے ملنے کے بعد کوئی ہمت ہار دے۔ وہ تو ہمت واستقلال کا ایک نمونہ تھے۔ پنجۂ وقت کی کلائی مروڑ کر رکھ دینے والوں میں تھے۔

حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والے تھے۔ ان کے سامنے قنوطیت کی باتیں کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ خیال پیدا ہوتا تھا۔ زبان حال سے فرمارہے ہیں 'جوانی میں مانجھا ڈھیلا'

انھیں دیکھ کر تو قنوطیت گردن ڈال دیتی تھی۔ حرکت و عمل کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا تھا۔ اور جینے کا حوصلہ پیدا ہوجاتا تھا۔ وہ سراپا زندگی تھے۔ تمام تر حرکت و عمل تھے۔ طوفان آئے، پتھر پڑیں، دنیا ادھر کی ادھر ہوجائے مگر مجال کیا جو دفتر جانا ناغہ کردیں۔ فرض کو ادا کرنے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھتا۔ مجھے تو تعجب ہو گیا تھا جب میں نے ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت یونیورسٹی کے کتب خانہ میں قلمی نسخے دیکھے تھے۔ نادر ملفوظات پائے تھے اور نادر کتابوں کی زیارت کی تھی۔

بلخی صاحب مرحوم کو علم کی لگن تھی۔ وہ جانتے تھے زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ خدا معلوم کب چراغ حیات گل ہوجائے۔ اس لیے ع ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت نام رہے۔ اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں چار چاند لگائے ہیں۔ 'تاریخ مگدھ' اور 'تذکرۂ نسوان ہند' جیسی انمول کتب لکھی ہیں اور دنیا کو بتادیا ہے کہ شاد و راسخ کا وطن گلہائے نوبہار پیدا کرنے میں کسی سے کم نہیں ہے۔

سید فصیح الدین بلخی صاحب سچ مچ گلہائے نوبہار میں سے تھے۔ ان کی مہک مشام جاں کو معطر کرتی تھی۔ چمنستان فن و ادب کی رونق بڑھاتی تھی اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ انھیں غم میں بھی مسکرانا آتا تھا۔ اسی لیے وہ ماضی کا ماتم کرنے کے قائل نہیں تھے۔ حال سے سمجھوتا کرنا جانتے تھے اور مستقبل پر بھروسا کرتے تھے۔ ان میں زمانے کا ساتھ دینے کی بڑی صلاحیت تھی۔ وہ گرد و پیش سے پوری طرح باخبر تھے اور زندگی کو باغ و بہار بنانے کا گر جانتے تھے۔ جمود سے ان کو نفرت تھی۔ تڑپ پر ان کا ایمان تھا اور شکست کھانا تو وہ جانتے نہ تھے۔ اکثر و بیشتر مجھے اپنی زندگی کے حالات سنایا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے گرم و سرد دیکھے تھے انھوں نے مگر اپنی جگہ سے رتی بھر بھی تو نہیں ہٹے تھے۔ سچ پوچھیے تو وہ ایک پہاڑ تھے۔ آہنی انسان تھے۔ اس لیے موت بھی ان پر آسانی سے فتح نہ حاصل کرسکی۔ اللہ میاں نے دو برس بیمار ڈال کر اچھا خاصا نیم جان کردیا تب کہیں فرشتہ اجل کو ہاتھ بڑھانے کی جرات ہوئی

اور ۱۳؍مارچ ۱۹۶۲ء کی منحوس رات میں وہ ہمیشہ کیلیے ہماری بزم سے اٹھ گئے۔ انتقال کر گئے۔ مر گئے۔ مگر نہیں۔ مولانا فصیح الدین بلخی کبھی نہیں مر سکتے۔ وہ محقق تھے۔ مورخ تھے۔ انشا پرداز تھے، تذکرہ نویس تھے، ادیب تھے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ انسان تھے۔ اور انسان کبھی نہیں مرا کرتا۔ وہ بظاہر روپوش ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس کی جلائی ہوئی شمع انسانیت فضا میں رنگ و نور بھرا کرتی، دوسروں کو راہ دکھایا کرتی ہے اور تاریکیوں میں اجالا پھیلایا کرتی ہے۔ بلخی صاحب بھی تاریکیوں میں اجالا پھیلاتے رہے ہیں۔ ان کا ایک پیغام دکھوں سے لڑتے رہنا، ہمت نہ ہارنا، غم میں مسکراتے رہنا۔ یہ زندۂ جاوید پیغام موت کی دسترس سے بالا ہے۔ یہ کبھی نہیں مر سکتا ہے۔ پھر بلخی صاحب کیسے مر سکتے ہیں۔ جب تک ان کا پیغام زندہ ہے وہ بھی زندہ ہیں اور بلاشبہ زندہ ہیں۔

مرحوم بلخی صاحب

یوں تو میں نے بلخی صاحب کا نام بہت دنوں سے سن رکھا تھا اور مجھے اپنے وطن مالوف گیا ہی میں ان کے بہت سارے مضامین پڑھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے ان کی شہرۂ آفاق کتاب 'تاریخ مگدھ' پڑھی تھی تو مجھ پر ان کے علم کا کافی رعب پڑا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں ان سے ملوں مگر اپنی تجارتی مصروفیتوں کی وجہ سے کبھی موقع نہیں ملا۔ کبھی کبھی گیا سے پٹنہ آتا بھی تو کاموں کے انبار سے لدا رہتا اور مہلت نہیں ملتی کی پٹنہ کی با کمال شخصیتوں سے مل سکوں۔

دسمبر ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ مجھے گیا کو خیر باد کہنا پڑا۔ افتاد زمانہ نے مجھے مجبور کیا کہ پٹنہ کی سکونت اختیار کروں۔ ان دنوں نواب سید محمد اسمٰعیل، گنذری کی کوٹھی کا باہری حصہ کرایہ پر لیا اور وہیں رہنے لگا۔ اسی کوٹھی کے ٹھیک سامنے والی گلی میں بلخی صاحب کا مکان تھا۔ ایک روز مغرب کے بعد ان سے ملنے گیا۔ آواز دی۔ دروازے پر ایک ماما آئی۔ اس کو میں نے اپنا نام بتایا۔ وہ چلی گئی۔ چند منٹوں کے بعد دیکھا کہ گندمی رنگ کے ایک دبلے پتلے سے انسان، داڑھی منڈی ہوئی مگر مونچھیں چھدری بھرپور مونچھیں، سلیپنگ سوٹ پہنے، آنکھوں پر چشمہ لگائے، انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ دبائے آئے۔ آتے ہی مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور بڑی گرم جوشی سے مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ کمرے کے بیچ میں ایک مسہری بچھی تھی جس پر بچھانے کا سامان کم اور کتابیں زیادہ بکھری پڑی تھیں۔ یہ مسہری ان کے لیے صوفہ بھی تھی اور مسہری بھی۔ جس پر وہ سوتے بھی تھے اور اسی پر بیٹھ کر ادبی حکا کی بھی کیا کرتے تھے۔ مسہری کے بغل میں ایک چوکی بچھی تھی جس کے ایک حصہ پر دری بچھی ہوئی اور دوسرے حصہ پر چٹائی کی جائے نماز پڑی تھی۔ چوکی کے ایک کونے پر پاندان بھی رکھا ہوا تھا۔

مسہری کی دائیں طرف ایک پلنگڑی بچھی تھی جس پر نادمؔ صاحب (بلخی صاحب کے اکلوتے لڑکے) کا ایک لڑکا پیشاب کرنے کے بعد رو رہا تھا۔ کمرے کی کھونٹیوں پر بلخی صاحب کا فلٹ ہیٹ اور فل پینٹ ٹنگا ہوا تھا اور انھی کھونٹیوں پر بچوں کے کپڑے بھی ٹنگے تھے۔ کمرے کی بائیں طرف والی دیوار سے دو الماریاں لگی تھیں۔ ان الماریوں میں کتابیں بڑی بے ترتیبی سے اٹی ہوئی تھیں۔ الماریوں کے اوپر والے حصے پر بندوق کا خول، اچار کے برتن اور اسی طرح کے دوسرے سامان پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سیلی ہوئی دیواریں دیکھیں اور پھر ایک ہی کمرے میں اتنے قسم کے سامان رکھے ہوئے دیکھ کر محسوس کیا کہ بلخی صاحب بھی میرؔ ہی کی طرح کے آدمی ہیں۔ حالات کی ان تلخیوں کے باوجود ان کے ہونٹوں پر تبسم کے پھول کھل رہے تھے۔ بلخی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ جس محبت سے وہ ملے وہ محبت مجھے اپنے گھر میں بھی نہیں ملی۔ اس کے بعد میں برابر ان سے ملتا رہا۔ بلخی صاحب نے دل ایسا غنی پایا تھا کہ ان کا بس چلتا تو گھر کا سارا سامان دوسروں کو دے دیتے۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر کسی سے اپنی غرض نہیں کہی بلکہ دوسروں کی غرض پوری کرنے میں ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے۔ خدا ترسی کا یہ حال تھا کہ کسی کا غم سنتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ خود انھیں کیفیات میں مبتلا ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ سونے چاندی کے ڈھیروں میں رہنے والا اب کنکروں کو بھی چننا چاہتا ہے تو دنیا چننے نہیں دیتی، تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ مجھے بڑی تسلی دی اور خدا پر بھروسا رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے بہلانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

دسمبر ۱۹۵۳ء کے دوسرے ہفتے میں جب میں نے دوبارہ 'اشارہ' نکالنے کا مشورہ طلب کیا تو خاموش کچھ سوچنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا ''خضر صاحب! میں کسی کو بھی بہار میں رسالہ نکالنے کا مشورہ نہیں دیتا ہوں۔ مگر آپ کہتے ہیں تو ضرور نکالیں۔ مجھے بڑی تقویت ملی اور میں نے اپنا ارادہ اور بھی پکا کرلیا۔ جب میں نے اپنی موجودہ اقتصادی بدحالی کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ 'خوش حالوں سے دنیا میں بڑے کام کم انجام پائے ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں، کام شروع کردو، پیسوں سے تو نہیں مگر مضامین سے میں مدد کرتا رہوں گا'۔ بلخی صاحب نے اپنا

یہ وعدہ مرتے دم تک نبھایا۔ مجھے فخر ہے کہ بلخی صاحب کے جتنے مضامین، اشارہ، میں چھپے ہیں، بہار کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں چھپے ہیں۔ وہ ہر لمحہ میری ترقی وکامیابی کی دعا کرتے رہتے اور عملی طور پر بھی جو ممکن ہوتا گریز نہیں کرتے۔

چار پانچ شماروں کے بعد جب 'اشارہ' بند ہوگیا تو ایک روز میں نے چاہا کہ ان سے مل کر حالات سے آگاہ کردوں۔ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا دیکھا کہ لیٹے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے 'خضر! گھبراو نہیں، آج نہیں تو کل کامیاب ہوگے۔' مجھے ان جملوں سے بڑی تسلی ہوئی۔ مزاج پرسی پر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ چشمہ اترا ہوا ہے اور لیٹے ہی لیٹے گھٹنوں پر ایک کاپی رکھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ مسہری کے سرہانے پاسنگ شو سگریٹ رکھا ہوا ہے۔ وہ سگریٹ پیتے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ لکھتے جاتے ہیں۔ میں نے التجا کی کہ صحت یاب ہوجانے کے بعد لکھنے پڑھنے کا کام شروع کریں۔ یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے۔ کہنے لگے، کیا کروں کام اہم ہے۔ ایک طالب علم کے لیے جلد از جلد ضروری نوٹس تیار کرنے ہیں۔' میں حیران رہ گیا کہ یہ آدمی ہیں یا فرشتہ۔ بیمار ہیں، کمزور ہیں مگر ایک طالب علم کے لیے مصروف مطالعہ وتحریر ہیں۔

سرسید سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ دنیا میں بڑا آدمی کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ بڑا آدمی وہ ہے جو دوسروں کو بڑا بنادے۔ بلخی صاحب اس جملے کے عملی پیکر تھے۔ دوسروں کی زندگی بنانے میں وہ لذت محسوس کرتے۔ ان کے پاس جس نے آکر جو بات پوچھی فوراً بتادی اور صرف بتا ہی نہیں دی بلکہ نوٹ تیار کرکے دے دیا۔ وہ علم کے ایک دریا تھے۔ تشنگان علم وادب نے اس دریا کا پانی پیا اور امر ہوگئے۔ وہ عام اسکالروں کی طرح چیزوں کو چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ ان کا سارا علمی خزانہ کھلا تھا۔ جو چاہے اور جتنا چاہے، دامن بھر کرلے جائے۔ ان خزانوں کے موتی سے کتنوں نے اپنے دامن سجائے۔ یہ تذکرہ خود ایک دفتر کا طالب ہے۔

ولی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ حد درجہ منکسر المزاج ہو۔ بلخی صاحب واقعی ولی تھے۔ وہ جتنے بڑے اسکالر تھے اس کا اندازہ تو ان کی تحریرات ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اتنے بڑے اسکالر ہونے کے باوجود وہ جس قدر منکسر مزاج تھے اس کی گواہی وہی لوگ دے سکتے ہیں جو ان سے ملتے رہتے تھے۔ وہ اپنے مخاطب پر کبھی بھی رعب نہیں گانٹھتے، کبھی بھی اپنے آپ کو بڑا

بنا کر پیش نہیں کرتے اور کبھی بھی مخاطب کو بولنے سے روکتے نہیں بلکہ وہ دوسروں کی بات زیادہ سنتے اور خود کم بولتے۔ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے۔ معمولی پڑھے لکھے بھی اور بڑی بڑی ڈگری رکھنے والے بھی۔ وہ ہر آدمی سے یکساں طور پر اخلاق برتتے۔ سبھوں سے ہنس کر باتیں کرتے۔ سبھوں کو چائے پلاتے۔ پان کھلاتے اور اپنا اسپیشل سگریٹ پاسنگ شو پیش کرتے۔ ان کا دل بڑا ہی مجلاّ و مصفا تھا۔ کسی کی برائی نہیں کرتے اور کسی کا عیب نہیں نکالتے۔ مگر یہ بات ضرور تھی کہ علمی معاملات میں کسی کو بخشتے نہ تھے۔ وہ تحقیق و تنقید کے میدان کے بڑے کٹریل جرنیل تھے۔ وہ ادب کے جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ۔ تنقید، تحقیق، علم عروض اور علم نجوم کے بھی ماہر تھے۔ ان تمام فنون پر ان کی تحریر مستند اور حکیمانہ ہوا کرتی تھی۔ شادؔ کے ہم عصر تھے۔ شادؔ کے معترف بھی تھے اور معترض بھی۔ شادؔ کی شاعری کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ شادؔ جب خود اپنے جی سے کہتے تو خوب کہتے تھے مگر جب دوستوں، شاگردوں اور مصاحبوں کی باتوں میں آ کر غزل کہتے تو وہ نچلے درجہ کی چیز ہو جاتی تھی۔ شادؔ کی شاعری پر انھوں نے ایک کتابچہ ''انشاد شاد'' کے نام سے لکھا ہے جس میں ان کی شاعری کی فنی خامیاں دکھلائی ہیں۔ یہ بات نہ تھی کہ بلخی صاحب کسی گروپ سے منسلک تھے۔ وہ خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انھیں کسی دوسرے کی انجمن کی ضرورت نہ تھی۔ دن رات لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک انھوں نے خدمت ادب کی۔ یوں تو کتابی شکل میں 'تاریخ مگدھ'، 'تذکرہ نسوان ہند'، 'انشاد شاد' اور اسی طرح کی ایک دو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار،(۱) مرتب کر چکے تھے اگر زندگی وفا کرتی تو یہ کتاب بھی چھپ جاتی 'تاریخ مگدھ' کے علاوہ تمام کتابیں انھوں نے خود اپنے خرچ سے چھپوائیں۔ 'تذکرۂ نسوان ہند' سے متعلق میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر اس قدر جامع کتاب اردو میں کوئی دوسری نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کے پاس قلمی نسخے اور مخطوطات کا ایک اچھا ذخیرہ موجود تھا۔ وہ پرانی کتابوں کے رسیا تھے اور دن رات اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ جب پٹنہ یونیورسٹی نے انھیں شعبۂ مخطوطات کا انچارج بنایا تو انھوں نے اس شعبے میں اپنی انتھک کوششیں صرف کیں۔ قلمی

نسخوں اور مخطوطات کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ دو بار حیدر آباد تک گئے۔ نیپال کا بھی سفر انھوں نے اس غرض سے کیا تھا۔ کسی قدیم دستاویز کی خبر جب بھی ملتی اس کو حاصل کرنے کے لیے لپکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یونیورسٹی کا یہ شعبہ انھوں نے ہی قائم کیا اور اپنی زندگی میں اسے اس قابل بنا دیا کہ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ گرمی کی عین دوپہر میں بلخی صاحب اپنے مخصوص لباس میں مراد پور پٹنہ کی سڑک کے کنارے ایک کباڑی کی دوکان پر کھڑے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ سر پر فلٹ ہیٹ ہے منھ میں پاسنگ شو سگریٹ لگا ہوا ہے، ایک ہاتھ میں چھاتا اور ایک ہاتھ سے کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھے جاتے ہیں۔ گرمی کی شدت سے پسینہ سے شرابور ہیں مگر انہماک کا یہ عالم کہ میں نے جب سلام کیا تو سنا تک نہیں۔ مجھے قدرے زور سے دوبارہ سلام کرنا پڑا تب انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر کتاب دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔

وہ بلا کے محنتی تھے۔ شب و روز کام کرتے رہنا ان کا شیوا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ علم و ادب کے میدان میں ناکاروں اور کاہلوں کو قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

بلخی صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ اتنے علوم وفنون پر مہارت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بڑھانے کا جذبہ نہ تھا۔ شہرت اور مجلسوں سے بہت گھبراتے تھے۔ میں نے کئی بار ان کی خدمت میں عرض کیا کہ 'حضور پر ایک مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے۔' ان کی زندگی سے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ انھوں نے بات کاٹتے ہوئے خاکہ لکھنے کو سختی سے منع کیا۔ وہ صوفی منش تھے۔ خموش رہ کر تعمیر ادب کی دھن میں لگے رہنا ان کی فطرت تھی۔ شور و ہنگامہ اور پروپگنڈے کے سخت مخالف تھے۔ اس خیال کو انھوں نے خود اپنی غزل کے ایک مطلع میں یوں پیش کیا ہے:

اس کی کسے ہوس ہے کہ نام ونشاں رہے
دنیا میں میں رہوں نہ مری داستاں رہے

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

کیوں آبرو ہو اپنی کسی کی نگاہ میں
کیوں خوبیوں کا اپنی کوئی قدرداں رہے

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بلخی صاحب شاعر بھی تھے۔ یہ حقیقت ہے پیشہ ورشاعروں کی طرح انھوں نے کبھی بھی شاعری نہیں کی اور نہ کسی مشاعرے میں اپنی غزلیں پڑھیں مگر دوسرے فنون کی طرح فن شاعری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

یوں تو وہ کافی کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے مگر جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ دن اور جیتے۔ ان کے مرنے کے بعد میں جانتا ہوں کتنے نونہالان باغ علم و تحقیق کی بے ثمری پر مہر لگ چکی ہے۔ ۷۷ سال تک انھوں نے زندگی کے چراغ کو اس طرح روشن رکھا کہ اس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کی راہوں کو روشن کر سکتے ہیں۔ ۱۴؍ مارچ ۱۹۶۲ء کو جنرل اسپتال کی ایک چارپائی پر انھوں نے دم توڑ دیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دم توڑتے وقت لبوں پر مسکراہٹ تھی اور موت کی گھبراہٹ کا پتا تک نہ چلتا تھا۔ آخر میں بات سپردگی خاک تک پہنچی۔ لوگوں نے پٹنہ کی ایک مشہور خانقاہ کے احاطے میں دفن کرنا چاہا مگر صاحب سجادہ نے اجازت نہ دی۔ دنیا کی یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ اتنے بڑے فنکار کی لاش پڑی ہوئی ہے اور دوگز زمین دفن ہونے کو میسر نہیں۔ بالاخر اپنے سسرالی احاطہ واقع دوندی بازار، پٹنہ سٹی میں مدفون ہوئے۔ اس ہونے والے واقعہ کی طرف خود اپنی غزل کے ایک مطلع میں اشارہ فرما چکے تھے:

راحت ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دوگز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

☆☆☆

خادم بلخی

فصیح الدین بلخی: ایک تاثر

قبل اس کے کہ میں اپنے بزرگ سید فصیح الدین بلخی کے متعلق کچھ تحریر کروں یہ عرض کر دینا ہے کہ آپ ماہ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۲۵ ربیع الآخر ۱۳۰۲ھ میں عظیم آباد کے محلہ بخشی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جناب صوفی صاحب کے مدرسہ میں جو اپنے وقت کے صاحب کمال عالم شمار کئے جاتے تھے، حاصل کی۔ ساتھ ہی صوفی صاحب ایک خاص طریقۂ تعلیم کے ماہر بھی کہے جاتے تھے۔ صوفی صاحب کے مدرسہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی میں ہوا۔ آپ نے چند سال اس اسکول میں تعلیم پائی تھی کہ شفیق والد بزرگوار کا سایہ اٹھ جانے سے آپ کو اسکول بھی چھوڑنا پڑا۔

ادبی ذوق چونکہ آپ کے خمیر میں تھا لہذا آپ کمسنی کے زمانہ میں ''رفتار زمانہ'' پرچہ سے جو آپ کے مکان سے ہی نکلتا تھا، وابستہ رہے۔ جس میں آپ کے کچھ کلام بھی شائع ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوئے جس نے عظیم آباد اور ملک میں بھی اچھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔ اسی دوران آپ نے ۱۹۱۰ء میں منشی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بہ حیثیت لکچرار مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی آپ کی غیر معمولی ذہانت اور فطری صلاحیت نے موصوف کو جزیرۂ فجی اور اس کے بعد اسکندریہ، دمشق، بیروت، بیت المقدس وغیرہ کی بھی سیر کرائی۔ موصوف کی اس نمایاں کارگزاری کے صلے میں ہندوستان واپس آنے پر گورنمنٹ آف انڈیا نے آپ کو روہتاس کے علاقہ میں کچھ زمین بھی عطا کی۔ آپ کو سب ڈپٹی کی حیثیت سے غالباً جون پور میں جگہ دی جسے آپ نے ترک موالات کے ہنگامی دور میں قبول کرنا مناسب تصور نہ کیا۔ اس کے بعد آپ ۱۹۲۶ء میں ریاست سرائے کیلا میں ریونیو افسر مقرر ہوئے۔ وہاں بھی آپ کا ایک خاص مقام رہا اور چند دنوں بعد ہی آپ

نے وہاں کے مجسٹریٹ کے فرائض انجام دینے شروع کئے، جہاں سے آپ نے آخردم تک پنشن پائی۔ ریاست سرائے کیلا میں آپ کی خدمات کے صلے میں بہت ساری چیزیں عطا کی گئیں۔ اس کے ساتھ کچھ دنوں تک آپ نے ریاست میں چیف فارسٹ آفیسر کی حیثیت سے کام انجام دیئے۔ ۱۹۴۸ء میں ریاست سرائے کیلا سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور اپنے اس فرض کو ۱۹۶۰ء تک انجام دیتے رہے۔ موصوف کی صحت نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ کچھ اور خدمات انجام دیں۔ یہاں تک کہ ۱۳/ مارچ ۱۹۶۲ء کو دن گزار کر شب کے ایک بج کر ۲۰ منٹ پر اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔

آپ کی تصانیف میں مطبوعہ سے زیادہ غیر مطبوعہ ہیں۔ مطبوعہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ مگدھ: یہ کتاب علی گڑھ کے ایم۔ اے کورس میں چلتی رہی ہے۔

۲۔ نسوان ہند: اس میں ۵۰۰ عورتوں کا تذکرہ ہے۔

۳۔ انشاد شاد وغیرہ

غیر مطبوعہ تصانیف

۱۔ تاریخ ہندو شعرائے بہار (۱) ۲۔ صنادید بہار، جس میں تقریباً ۹۰۰ کتبے کے فوٹو موجود ہیں۔ ۳۔ آثار بلخیہ۔ مرحوم نے اپنی جانفشانی اور محنت سے اپنے خاندان کا شجرہ مستند حوالے سے لکھا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ بلخی خاندان محمد تغلق کے عہد حکومت میں کس طرح ہندوستان آیا اور پھر کس طرح بہار میں پھیلا۔

۴۔ فن عروض سے متعلق کتاب ۵۔ بہار میں وہابی تحریک (۲) ۶۔ دستور سخن۔ ان سب کمالات کے علاوہ آپ ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو خود مرحوم نے ایک کاپی پر اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، ضایع ہو گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر خواجہ افضل امام

فصیح الدین بلخی اور پٹنہ یونیورسٹی

در دل زتمنائے قدمبوس تو شد راست
شوقت چہ نمک دادہ مذاق ادبم را

عظیم آباد کے جن لوگوں نے ہندوستان اور بالخصوص صوبۂ بہار کی تاریخ اور ادب پر گہری نظر رکھی ہے ان میں پروفیسر عسکری، ڈاکٹر کے۔ کے دتا (وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی) اور فصیح الدین بلخی مرحوم قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر حضرات کا سروکار پٹنہ یونیورسٹی سے تھا مگر بلخی صاحب سرائے کیلا اسٹیٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد وطن واپس آئے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اب آرام کیا جائے مگر۔

جنون شوق تمنائے نامراد نگر
امید ختم شد و انتظار باباقیست

لہٰذا انھی حضرات نے بلخی صاحب کو پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک کرنے کی صورت نکالی۔ یہ زمانہ ۴۶-۴۷ء کا تھا جبکہ ملک سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔ ہندوستان کے نقشے پر خط تنسیخ کھنچا جا رہا تھا۔ لوگ ایک نئے ملک کے قیام کے لیے کوشاں تھے اور پٹنہ کے چند اہل علم اس علمی مرکز کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے جو شعبہ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے دو سیکشن ہوئے۔ ایک فارسی، عربی اردو اور دوسرا ہندی، سنسکرت اور میتھلی۔ آخری الذکر کا تعلق شاستری جی سے رہا جو بہار ریسرچ سوسائٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس سے منسلک کر دیے گئے تھے۔ بلخی صاحب اگر چہ انچارج عربی و فارسی سیکشن تھے مگر شعبہ کی تمام ذمہ داریاں انھیں کے سر تھیں اور وہ ناظم شعبۂ مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی سمجھے جاتے تھے۔

ممدوح کومخطوطات سے کیا شغف تھا صرف وہی حضرات بیان کر سکتے ہیں جنھوں نے انھیں بر سر کار دیکھا ہے۔ راقم کا قلم اس کی تصویر کشی سے قاصر ہے۔ کرسی بہ غرضی روشنی کھڑکی کے قریب کر لی گئی ہے۔ خود کرسی پر اس طرح چوکور بیٹھے ہیں کہ ٹخنہ ٹھوڑی سے ملا ہوا ہے۔ ہاتھ میں ایک بڑا میگنی فائنگ شیشہ ہے۔ آنکھ شیشہ سے لگی ہوئی ہے اور شیشہ کتاب سے۔ یقین جانیے آنکھ، شیشہ اور کتاب کے درمیان کوئی خاص فصل نہیں ہے۔ اس عالم انہماک میں اگر کوئی صاحب ذوق تشریف لے آئے تو خیر علمی گفتگو شروع ہوگئی ورنہ صرف ایک سگریٹ دے کرانھیں واپس کر دیا یا وہ خود چلے گئے۔ دفتر کی حاضری ان کا مذہب تھا۔ ان کا بیان تھا کہ وہ بارہ برس میں ایک روز بھی غیر حاضر یا فرصت پر نہیں رہے۔ اس طرح ۴۷ تا ۵۹ء وقت بہ آسانی گزرتا رہا۔ ۶۰ء میں نقاہت کے آثار نمایاں ہوئے۔ صحت جواب دینے لگی۔ عمر تقریباً ۷۳ سے تجاوز کر چکی تھی۔ پھر بھی یاران میکدہ اس کے لیے تیار نہ تھے کہ بلخی صاحب کو آرام میسر ہو۔ اگر چہ عسکری صاحب اور دتا بابو ریٹائر کر چکے تھے مگر دوبارہ ان کی تقرری ہو چکی تھی اور وہ مصر تھے کہ بلخی صاحب ان کی مدت ملازمت تک ان کا ساتھ دیں۔

رسید عمر بہ پایان وکار ہا باقیست
جنون من شدہ ختم بہار ہا باقیست

ماہ اگست ۶۰ء سے آخر مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں اجازت ملی کہ وہ اپنا سلسلہ یونیورسٹی سے ہمیشہ کے لیے منقطع کر لیں۔

ان کی دفتری ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ ریسرچ اسکالر کی ہر ممکن معاونت، مخطوطات کی فراہمی، ان کی فہرست تیار کرنا، کسی نادر نسخہ کی طباعت، برٹش میوزیم یا انڈیا آفس سے کسی نسخے کا حصول وغیرہ۔ سیکشن کے قیام کے بعد تقریباً جتنے لوگوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو فارسی یا تاریخ میں ریسرچ ڈگریاں حاصل کی ہیں وہ بلا استثنا بلخی صاحب کے مرہون منت ہیں۔ خوش نصیب تھے وہ لوگ جنھوں نے اپنا مقالہ ان کی زندگی میں تیار کر لیا۔ جو بچ گئے وہ اب تک یوسف کا رواں بنے پھر رہے ہیں۔ مرحوم کا تعلق جتنا اردو، فارسی، عربی سے تھا اس سے کسی طرح کم تاریخ سے نہ تھا۔ تاریخ مگدھ، ان کی مشہور تصنیف آج بھی کالجوں میں رائج ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تاریخ

کے طلبا بھی اس خانقاہ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ ہمارے اس دعوے کی تصدیق ڈاکٹر قیام الدین احمد، برہم دیو پرشاد امبشٹ اور چھمی کانت چودھری کر سکتے ہیں۔

اس شعبے سے ان کی وابستگی ایک جگ یعنی ۴۷ء تا ۵۹ء تک رہی۔ جس میں انھوں نے تقریباً ساڑھے چودہ سو مخطوطات، فرامین، اسناد وغیرہ جمع کرلیں جس کی مجموعی تفصیل بعد میں آئے گی۔ کتابوں کا معتدبہ حصہ حیدرآباد سے آیا جہاں بلخی صاحب اور پروفیسر عسکری، سید عبدالرحیم صاحب مدظلہ کے مہمان رہے۔ کتابوں کی تلاش انھیں صوبے کے کس شہر میں نہ لے گئی۔ کون سا خانوادہ تھا جہاں اس کی فکر اور جستجو میں وہ سرگرداں نہ پھرے اور حتی الوسع کامیاب نہ لوٹے۔ یہاں تک بعض اسکولوں سے قلمی کتابیں لے کر وہاں مطبوعہ کتابیں بھجوادیں جیسے محمڈن اسکول پٹنہ سٹی وغیرہ۔

ملازمت سے سبکدوشی کے وقت جو خیال رہ رہ کر ستارہا تھا وہ یہ کہ ان کا جانشین کون ہوگا۔ جو واقعی ان کا نعم البدل ہو۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگ انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے معتقدین اس سے واقف تھے:

ترا عاشق شود پیدا ولی مجنون نخواہد شد

ناظم مخطوطات کی تقرری ہوجائے گی مگر وہ بلخی نہ ہوگا۔ لوگ تلاش میں تھے کہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ میری موجودگی کہاں تک تسکین کا باعث ہوئی یہ بتانا میرا کام نہیں۔ بلخی صاحب کے تبحر علمی کے لیے بسیار سفر باید کی شرط ہے، جسے پورا کرنے کی کوشش راقم الحروف حتی الوسع ہمیشہ کرتا رہے گا۔ ان کی جمع کردہ کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مجموعی طور پر ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔

	عربی	فارسی	اردو
تاریخ	-	۶۰	۴
تذکرہ	۱۲	۵۷	۵
سفرنامہ	۱	۵	۱۰
جغرافیا	-	۳	-
انشا	-	۶۸	-

	عربی	فارسی	اردو
دواوین	۱	۵۹	۱۸
منظومات	۱	۱۰۱	۹۲
ادبیات	۱۱	۱۱۳	-
قواعد	۱۰	۴۳	-
فن فصاحت وغیرہ (کذا)	۶	۴۰	-
لغت وغیرہ	۳	۲۶	-
تصوف	۴	۱۰۱	۶
حساب	۴	۲۸	-
منطق وفلسفہ	۸	-	-
ہندسہ	۱	۶	-
فقہ ومذہب	۶۱	۸۷	۳۷
متفرقات	۲۱	۱۱۵	-
نقل فرامین واسناد	-	۲۴۰	-
کیمیا	۲	-	-

☆☆☆

فصیح الدین بلخی کی کتاب ''پٹنہ کے کتبے'' کا سرورق

پروفیسر مظفر اقبال

فصیح الدین بلخی مرحوم - چند یادیں

فصیح الدین بلخی صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی تو دل قابو میں نہ رہا۔ آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور تصور میں ان سے آخری ملاقات کی تمام تفصیلات فلم کی طرح نظر آنے لگیں۔ وہ سخت علیل تھے اور پٹنہ جنرل ہاسپٹل کے راجندر بلاک کے ایک بیڈ پر زندگی کی آخری سانسیں بڑی مشکل سے لے رہے تھے۔ ان ہی دنوں اتفاقاً میں ایک ضرورت سے پٹنہ پہنچا۔ احباب واعزہ سے معلوم ہوا کہ بلخی صاحب ہسپتال میں ذی فراش ہیں اور ان کی حالت بہت نازک ہے۔ ان کے اکلوتے بیٹے پروفیسر نادم بلخی کالج سے رخصت لے کر آئے ہوئے ہیں اور اپنے والد کی تیمار داری بڑی تندہی سے کر رہے ہیں۔ میں نے پتا ٹھکانہ دریافت کیا اور کسی طرح وقت نکال کر مرحوم تک جا پہنچا۔ اس وقت میرے ساتھ استاد محترم اختر اورنیوی بھی تھے۔ ہم لوگ بلخی صاحب کے پاس اس وقت پہنچے جبکہ ان پر غنودگی طاری تھی۔ ایک طرف نادم صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ چہرے سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی اور دوسری طرف ایک اسٹول پر کوئی اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد مرحوم نے آنکھیں کھولیں اور ہم لوگوں کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہم لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا جس کا انھوں نے نہایت ہی نحیف آواز میں جواب دیا۔ اس کے بعد اختر صاحب نے دریافت حال فرمایا۔ جس کا جواب انھوں نے رک رک کر لیکن نہایت واضح الفاظ میں دیا۔ 'جی ہاں! زندہ ہوں... میں تو ہسپتال میں آنا نہیں چاہتا تھا لیکن'... نادم صاحب کی طرف ہاتھ کی ایک خفیف جنبش سے اشارہ کر کے... ''ان کی ضد سے چلا آیا۔ اب یہاں روزانہ کافی روپے خواہ مخواہ لمبے

ہور ہے ہیں اور علاج بھی خاطر خواہ نہیں ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا اور نقاہت کے آثار نمایاں تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا تو اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انھیں اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو اور اسے مجھ تک پہنچانا چاہ رہے ہوں۔ چنانچہ میں لپک کر ان کے قریب پہنچا تو بہت ہی نحیف آواز میں بولے ''اگر اورنگ آباد جانا ہو تو مولانا (والد محترم مولانا سید عبدالرؤف اورنگ آبادی جن سے مرحوم کے دوستانہ اور برادرانہ مراسم تھے۔) سے کہہ دیجیے گا کہ میں ابھی مرنے والا نہیں، مجھے یقین ہے کہ ابھی زندہ رہوں گا۔'' اس کے بعد ایک ہلکی سی معصوم اور دلآویز مسکراہٹ ان کے پورے چہرے پر بکھر گئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور گلا رندھ گیا چنانچہ اثبات میں سر ہلا کر دوبارہ سلام کیا اور جلدی سے روانہ ہو گیا۔

راہ میں استاد محترم نے زیادہ تر ان ہی کے متعلق باتیں کیں اور ان کے فضائل بیان کرتے رہے۔ شاید ان کی یقین دہانی کا ہم لوگوں پر الٹا اثر پڑا تھا اور اسی وقت اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ چند روز کے مہمان ہیں۔ لیکن دل اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور خدا سے دعائیں کیں کہ انھیں کچھ عرصہ اور زندہ رہنے کا موقع ملے۔ لیکن حیف! اور صد حیف! کہ دل کی دل ہی میں رہی اور وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔

بلخی صاحب کو پہلی بار میں نے لڑکپن میں اپنے گھر پر دیکھا۔ وہ میرے یہاں چند روز کے لیے قیام پذیر تھے۔ وہ بہت ہی اچھے دن تھے۔ بلخی صاحب مرحوم اور والد محترم مدظلہٗ ہر وقت علم وادب کے ذکر میں مصروف رہتے یا بوسیدہ اور کرم خوردہ قلمی کتابوں کے مطالعہ میں اپنے مصروف ہوتے کہ گرد و پیش کی انھیں کچھ خبر نہ رہتی۔ میں بار بار کمرے میں آ کر ان سے گفتگو کرنا چاہتا لیکن وہ کبھی میری طرف سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ غالباً انھیں میری آمد کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے استفسار پر والد صاحب نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ان کے دوست ہیں اور اس لحاظ سے میں انھیں چچا جان کہہ سکتا ہوں۔ اس کے بعد بھی کئی

بار وہ میرے یہاں آئے۔ اس وقت میں ان سے گفتگو کی جرأت تو رکھتا نہیں تھا لیکن جب والد صاحب اور ان کے درمیان گفتگو ہوتی تھی تو کان لگا کر سنتا تھا حالانکہ کوئی بات اس وقت پلے نہیں پڑتی تھی۔ عرصۂ دراز کے بعد جب نصاب کی کتابوں اور جاسوسی ورومانی افسانوں اور ناولوں کے علاوہ سنجیدہ علمی وادبی کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق ہوا تو بلخی صاحب مرحوم کی مشہور کتاب 'تاریخ مگدھ' نظر سے گزری۔ اس کتاب کے مطالعہ نے مجھ پر بلخی صاحب کی عظمت واضح کردی۔ یہ اردو زبان میں صوبۂ بہار کی نہایت ہی مستند (تاریخی) کتاب ہے۔

۱۹۵۶ء میں اردو زبان وادب کے متعلم کی حیثیت سے میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخل ہوا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت والد صاحب نے اپنے دو مخلص احباب سے ملنے کی بڑی تاکید کی تھی۔ اول پروفیسر حسن عسکری صاحب سابق پروفیسر شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی، ڈائرکٹر جیسوال انسٹی ٹیوٹ پٹنہ اور دوم فصیح الدین بلخی صاحب مرحوم۔ چنانچہ آنے کے چند روز بعد ہی ان دونوں بزرگوں سے ملاقات کی۔ عسکری صاحب سے پٹنہ کالج لائبریری کے دروازے پر ملاقات ہوئی۔ ان کی قلندرانہ شان دیکھ کر انھیں پروفیسر سید حسن عسکری صاحب تسلیم کرنے میں ذرا تامل ہوا۔ لیکن برادرم عبدالمغنی صاحب کے کہنے پر ماننا ہی پڑا۔ اس وقت وہ بہت ہی مصروف تھے چنانچہ تعارف کے بعد صرف علیک سلیک اور خیریت مزاج کی حد تک گفتگو ہوئی۔

بلخی صاحب اس وقت پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات کے انچارج تھے۔ ان سے ان کے آفس میں جاکر ملاقات کی۔ بڑے ہی تپاک سے ملے۔ دیر تک دریافت حال کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد مصافحہ کرکے میں رخصت ہوا تو برابر ملتے رہنے کی تاکید کی۔

یہ ان سے میری پہلی باضابطہ ملاقات تھی جس میں ان سے براہ راست گفتگو کرنے کا موقع ملا اور ان کی شخصیت سے کچھ اس طرح متاثر ہوا کہ جب تک پٹنہ میں قیام رہا، ان سے ملتا رہا اور ان کے علم وفضل سے مستفیض ہوتا رہا۔ ۱۹۵۸ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرلینے کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ملازمت کے سلسلے میں مجھے پٹنہ چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب بھی وہاں گیا ان سے ضرور ملاقات کی۔ اخیر عمر میں ضعف اور نقاہت کے سبب مرحوم ملازمت سے مستعفی ہوکر زیادہ تر اپنے مکان (واقع محلہ گذری پٹنہ سٹی) پر رہتے تھے۔ میں بھی حاضر خدمت

ہوتا تو دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، نجی اور ہر طرح کی باتیں۔ ان کی گفتگو کا انداز بہت ہی دل آویز تھا، بہت ہی دھیمے لہجے میں بولتے تھے اور ہر وقت چہرہ متبسم رہتا تھا۔ عمر کے تفاوت کے باوجود میں نے ان کی صحبت میں کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی۔ میں جب رخصت ہونے لگتا تو بہ اصرار کچھ کھلاتے۔ آم کی فصل میں آم ضرور کھلاتے۔ غالباً انھیں آم سے بہت رغبت تھی۔ یہ اس کمترین پر ان کی غیر معمولی شفقت تھی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

بلخی صاحب نے اپنی زندگی میں ہی ایک محقق اور مورخ کی حیثیت سے قابل رشک شہرت حاصل کر لی تھی۔ 'تاریخ مگدھ' کی اشاعت نے انھیں ملک کے طول وعرض میں ایک مستند مورخ کی حیثیت سے مشہور کر دیا تھا اور اس کے بعد 'تذکرۂ نسوان ہند' کی اشاعت نے انھیں ایک نکتہ رس اور ژرف نگاہ محقق کی حیثیت سے کافی شہرت عطا کی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھیں نمود ونمائش اور شہرت پسندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کبھی بھی انھوں نے شہرت کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ دراصل ان کے مزاج میں حد درجہ انکسار اور طبیعت میں غیر معمولی سادگی واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ ہر شخص ان سے بڑی آسانی سے نفع اندوز ہو جایا کرتا تھا اور بعض حضرات تو ناجائز فائدہ اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

ادب اور تاریخ سے بلخی صاحب کو غیر معمولی شغف تھا۔ مشرقی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ اس طرف چند برسوں میں صوبۂ بہار میں 'تحقیق' کا جو غیر معمولی ذوق شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ہے اس میں بلخی صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ تحقیق کرنے والے ایسی الجھنیں لے کر بلخی صاحب کے پاس حاضر ہوتے اور وہ بڑی آسانی سے ان کی مشکلوں کو حل کر دیتے۔

بعض حضرات کے مقالے کی ترتیب وتدوین کا کام بھی بلخی صاحب نے انجام دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ حضرات مرحوم کی اس بے لوث خدمت کا اعتراف تک نہیں کرتے۔

بلخی صاحب کی عطا وبخشش کی بہت سی کہانیاں میرے سینے میں محفوظ ہیں لیکن خواہش کے باوجود میں انھیں بیان نہیں کر سکتا اس لیے کہ جن باتوں کی پردہ پوشی مرحوم نے اپنی زندگی میں کی ہے، موت کے بعد انھیں بے نقاب کرنے سے یقیناً ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن بات ایسی ہے جس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

بلخی صاحب نے برسوں کی کدوکاوش اور تلاش وجستجو کے بعد صوبۂ بہار کی وہابی تحریک پر انگریزی زبان میں ایک نہایت ہی مستند کتاب تیار کی۔ وہ اسے اپنے خرچ سے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن سرمایے کی کمی نے اس بات کی اجازت نہیں دی اور کتاب اشاعت پذیر نہیں ہوسکی۔ (واضح رہے کہ یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوسکی ہے لیکن اس کا ترجمہ جو راقم الحروف نے مرحوم کی زندگی میں کیا تھا عنقریب شائع ہونے والا ہے)(۱) لیکن اب تک اس کے بیشتر مواد کی اشاعت کسی نہ کسی شکل میں ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر کالی کنکر دت سابق صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی، حال وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی نے اپنی کتاب FREEDOM MOVEMENT IN BIHAR کی تالیف میں اور جناب آر۔ آر۔ دیواکر سابق گورنر صوبۂ بہار نے اپنی کتاب BIHAR THROUGH THE AGES کی ترتیب میں بلخی صاحب کی متذکرہ کتاب سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا ہے اور مرحوم ہی کی زبانی سنا ہے کہ قیام الدین صاحب نے بھی اپنے مقالہ WAHABI MOVEMENT IN BIHAR کی تیاری میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

بلخی صاحب نے صوبۂ بہار کے تمام نوجوان محققین کی رہنمائی کی ہے اور ایک طرح سے اس فن میں انھیں تربیت دی ہے اس لحاظ سے بلاشبہ ان کی بڑی اہمیت ہے۔ صوبۂ بہار میں اس وقت کئی بلند پایہ محققین موجود ہیں جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ بلخی صاحب جس شفقت اور لگن سے نوجوانوں کی رہنمائی کرتے تھے وہ ان ہی ختم ہوگئی۔

بلخی صاحب کو نادر قلمی کتابوں، وصلیوں اور کتبوں کو جمع کرنے کا بے پایاں شوق تھا اور انھیں حاصل کرنے کے لیے ضعیفی کے عالم میں بھی وہ دور دراز کا سفر کیا کرتے تھے۔ بلخی صاحب دوسرے بڑے ادیبوں کے برعکس اردو کی کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھتے تھے اور اس مد میں کافی رقم صرف کرتے تھے۔

بلخی صاحب مضمون نگاری کے مقابلے میں کتب نویسی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ایسی بات نہیں کہ انھوں نے مضامین یا مقالے نہیں لکھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے کافی تعداد میں مقالے لکھے ہیں جو ہندوستان کے موقر ادبی و علمی جرائد میں شائع ہوئے ہیں لیکن وہ باتوں کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنے کے قائل تھے اور اس لیے کسی موضوع پر مکمل کتاب لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

بلخی صاحب کا مخصوص میدان تحقیق تھا لیکن انھیں تنقید سے بھی دل چسپی تھی۔ اردو کے تنقیدی ادب سے انھیں مکمل واقفیت تھی۔ وہ قدیم طرز تنقید کے دل دادہ تھے۔ چنانچہ ان کے تنقیدی رسالہ 'انشاد شاذ' میں تنقید کا قدیم انداز ملتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ 'ہماری شاعری (۲)، کو' اردو شاعری پر ایک نظر، (۳) پر ترجیح دیتے تھے۔

آج بلخی صاحب اس جہان بے بنیاد میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے موجود ہیں اور جب تک ان کے کارنامے موجود ہیں اس وقت تک ان کا نام زندہ رہے گا۔

☆☆☆

خاموش خدمت گار

بلخی صاحب مرحوم سے میری دو چار ملاقاتیں تھیں اور وہ بھی سرسری۔ بہت شفقت فرماتے تھے۔ ان کے جستہ جستہ مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ کتابیں بھی نظر سے گزری ہیں لیکن اس وقت ان کا کوئی کارنامہ میرے پیش نظر نہیں ہے۔ وہ خاموش کام کرنے والوں میں تھے۔

ان کا انہماک علم و ادب کس پر واضح نہیں۔ ان کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں پر وہ لوگ بہتر لکھ سکتے ہیں جو پٹنہ میں ہیں۔ میں اس قدر دور، ان سے ملاقات سرسری، ان کے ادبی کارنامے سامنے نہیں، کیا لکھوں۔

ایک بار مرحوم، شعرائے بہار کا تذکرہ مرتب کر رہے تھے اور نمونہ کلام کے لیے یہ جدت کی تھی کہ ایک مصرعہ طرح دے کر اس پر غزل کہنے کی شرط لگا دی تھی۔ مجھے حکم ہوا تھا۔ طرح غالباً یہ تھی:

دامن لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا

میں نے شاید غزل بھیجی تھی۔ اب یاد نہیں رہا۔

پٹنہ سٹی میں ایک بار کسی نے تعارف کرایا۔ فرمانے لگے کہ آپ سے واقف ہوں۔ ملاقات آج ہوئی۔ پھر گاہے گاہے جب ملے انتہائی محبت سے ملتے۔ بڑی خوبیوں کے انسان چل بسے۔ یہیں پر انسان بے بس ہے۔

ڈھاکہ

۱۲/۹/۱۹۶۲ء

☆☆☆

مولانا سید محمد ایوب شمیم ندوی

سرِّ اکبرؔ کے ایک مخطوطے پر بلخی صاحب کی یادداشت

یک مشت خاک، آئینہ ای شد بہ روزگار
بنمود وجہ باقی و بس خاک تودہ شد
در بہرۂ حق بہ حق رسید و بہرۂ آدم بہ آدم
آب و خاک با فنا شد و دوگانگی با عدم

'رجع الی الحق الی اصحابہ وبقی المسکین فی التراب رسیما'

سید فصیح الدین بلخی کی موت ایک عالم کی موت ہے (۱)، جب سوچتا ہوں کہ موصوف کیا تھے، تو دل کہتا ہے موصوف کیا نہیں تھے! ایک محقق، مؤرخ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے اور جب تک علم و سخن کا چرچا رہے گا جانتی رہے گی مگر وہ سید فصیح الدین بلخی نہیں مل سکتا جو انسانیت کا پیکر اور تواضع کا مجسمہ تھا۔ بڑے لوگ عموماً غرور کی حد تک خود دور ہوتے ہیں، موصوف خودداری کی حد تک بھی مغرور نہ تھے۔ انکساری تو جیسے گھٹی میں پڑی ہو، حلیمی جیسے توام ہو، معصومیت چہرہ سے ہویدا، چہرہ دل کا آئینہ، دل علم و انسانیت کا منبع، دماغ فہم و ذکا' کا سرچشمہ، بولتی آنکھیں (۲)، ہنستے ہونٹ تحقیق و تجسّس فطرت، تلاش و تفحص جبلت، نور علم سے سینہ معمور، شراب دانش سے آنکھیں مخمور۔

وحدت الوجود کی بحث ہو یا وحدت الشہود کی، ہمہ اوست کی گفتگو ہو یا ہمہ از اوست کی، شعر و سخن کا چرچا ہو یا ادب و ثقافت کا، فقر و تصوف کا ذکر ہو یا تاریخ و فلسفہ کا، موصوف کے پاس ہر ایک کے لیے ایک دستاویز موجود ہے جیسے عمر اس دشت کی سیاحی میں گذری ہو۔ جس نے جس موضوع پر گفتگو کی، سارا (۳) خزانہ اسی کے حوالہ کر دیا: 'خود (۴) تہی دست، نام رہے اللہ کا'۔ ہزاروں فیضیاب ہوئے۔ سیکڑوں مشہور روزگار ہوئے۔ کتنوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری

لی۔ بہتیرے مصنف ہوگئے۔ آفتاب علم اپنی جگہ پر رہا۔ ضوفشانی گوشے گوشے تک ہوئی۔ روشنی کونے کونے تک پہنچی۔ مرحوم بہتے دریا تھے (۵)، جس کا جی چاہے ہاتھ دھولے۔ خنک و شیریں چشمہ تھے، جس کا جی چاہے پیاس بجھالے۔ میرا حصہ دور کا جلوہ تھا، مگر جلوہ بہر حال جلوہ ہے۔ آنکھیں نہ خیرہ ہوئیں نہ بند، کچھ منور ہو گئیں۔

میرا ہمیشہ سے خیال تھا اور ہے کہ دارا شکوہ کے ساتھ مؤرخین نے زیادتی کی ہے۔ اس کا 'الحاد و زندقہ' اب ایسا بھی کیا تھا کہ نام و نشان ہی میٹ دیا جائے۔ دارا شکوہ کچھ بھی نہیں تو دس کتابوں کا ضرور مصنف ہے۔ بعض کتابیں بڑی محنت اور کاوش سے لکھی ہیں۔ 'سرِّ اکبر' کے لیے اس نے تمام کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ 'سفینۃ الاولیاً' کے لیے اس نے 'نفحات الانس'، 'تاریخ یافعی'، 'طبقات سلطانی' وغیرہ کا مطالعہ کیا اور شب و روز تاریخ کی تفتیش اور واقعات کی ترتیب میں لگا رہا: 'شب و روز جز فکر ایشان، فکری نداشت'۔ (سفینۃ الاولیاء، قلمی نسخہ، پٹنا یونیورسٹی لائبریری، نمبر ۷۵۷)۔

'مجمع البحرین' میں ہندو فلسفہ اور اسلامی تصوف کو جس طرح دلائل اور براہین کے ساتھ ایک کر دکھایا ہے اس کی اس کوشش اور کاوش کا اندازہ کچھ اہل علم ہی لگا سکتے ہیں۔ رسالہ 'حق نما' صرف ۲۶ اوراق کا رسالہ ہے مگر اس کے علم و دانش اور فضل و کمال پر بُرہانِ قاطع ہے۔

ڈالٹین گنج کی نشست میں دارا شکوہ کا ذکر چل پڑا، سید فصیح الدین بلخی نے پوری تقریر کر دی اور 'سرِّ اکبر' پر اپنا نوٹ عنایت کیا۔ یہ تبرّک آپ کے سامنے ہے: جناب سید فصیح الدین بلخی صاحب نے ۲۷/اپریل ۱۹۶۰ء کو جناب شاہ شاحق صاحب ملا چک، بھاگلپور کی اجازت سے یہ عبارت نقل کی 'کتاب سرِّ اکبر' مملوکہ شاہ شاحق صاحب ملا چک، بھاگلپور، "11x8

'سرِّ اکبر' فارسی مؤلفہ محمد دارا شکوہ ۱۰۶۷ھ: چاروں ویدوں کا ملخص ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وید آسمانی صحیفے ہیں اور قرآن و حدیث سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ صفحہ ۵۵۸-۵۵۹: این ترجمہ ہای اُپنکھت ہر چہار بید بہ عبارت راست براست در مدت شش ماہ آخر روز دوشنبہ بست و ششم ماہ رمضان المبارک سنہ یک ہزار و شصت و ہفت ہجری در شہر دہلی در منزل نگم بودہ باتمام رسانید۔

چون ذوقِ دیدنِ عارفانِ ہر طایفہ وشنیدنِ سخن سنجانِ بلندِ توحید بہم رسیدہ، کتب تصوف درنظر آوردہ درسالہا تصنیف کردہ بود۔ تشنگی طلب توحید اودم بہ دم اعادہ می شد... خواست کہ جمیع کتب سماوی رادرنظر آوردہ تاازہمان کتب کہ خود تفسیر خود است اگر کتابی مجمل باشد در کتابی دیگر مفصّل یافتہ شود از آن تفصیل اصل دانستہ گردد، نظر برتوریت وانجیل وزبور ودیگر کتب صحف انداخت اما بیانِ توحید در آنہا ہم مجمل ومرموز بود۔ از ترجمہ ہای سہلی کہ اہلِ غرض کردہ بودند مطلب معلوم نہ گردد ودر پے آن شدند۔ از چہ جہت در ہندوستان وحدت عیان گفتگو توحید بسیار است۔ Colophon تمام شد۔

ترجمۂ اُوپنکھت ہای ہر چہار بید، الحمد ومنتہٖ کہ کتاب ہذا حسب الارشاد جناب فیض مآب صاحب اقبال جناب منشی چُنّی لال صاحب از کتاب جناب قبلہ وکعبہ منشی آنند سروپ صاحب بخطِّ خامِ احقر العباد دیبی پرشاد در شہر بنارس، محلہ لاہوری چوک، بوقت صبح، روز جمعہ، متی پوس سودی جیٹھ ۱۹۱۳ سنبت تحریر باتمام رسید۔

اوّل ورق

'حمد خدایی را کہ زبان در بیان او لال است اما بعد فقیر بی اندوہ محمد دارا شکوہ در سنہ ۱۰۵۱ھ کہ بہ کشمیر جنت نظیر رفتہ بود، جاذبۂ عنایت الہٰی وفضل لامتناہی ارادت اکمل کاملان، زبدۂ عارفان، اوستادِ پیران حضرت ملا شاہ سلمہ اللہ از دریافت جمیع کتب سماوی چہار کتب کہ جمیع اسرار سلوک و اشتغال توحید صرف واین معنی از ہمین ظاہر است در آن مندرج است آن را اُوپنکھت (اُپنشد) می نامند'۔

مرحوم نے فرمایا کہ شاہ صاحب نے دیکھنے کی اجازت بہ مشکل دی۔ اس خیال سے کہ نقل صاحب موصوف کی طبیعت پر گراں نہ ہو مندرجہ ذیل خلاصہ انگریزی میں لکھ لیا:

Sire Akbar or Greatest Secret compiled by Dara Shukuh in 1067 sampat dated 1973 sampat by Munshi Debi Prasad. 860 8"x11"

Nastaliq. An index of the contents of the book at the beginning. Dara has made mention of a Hindu tradition according to which the text of the Vedas disappeared from the world and were again revealed after a long time on the same spot where Dara compiled

this work. He adds that this may be in a way reappearance of the Vedas in a new garh for the guidance those who may choose to follow it.

موصوف نے اس پر بس نہیں کی، شعیب راہی کو پٹنا خط لکھا کہ فلاں فلاں لائبریری سے داراشکوہ کی تصانیف پر نوٹ لکھ کر بھیج دیں۔ شعیب راہیؔ نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں درج ہے:

برٹش میوزیم catalogue جلد اول سے 'سفینۃ الاولیاً' کے متعلق عبارت انگریزی میں

برٹش میوزیم catalogue جلد اول سے 'سکینۃ الاولیاً' کے متعلق عبارت انگریزی میں

برٹش میوزیم catalogue جلد دوم سے 'مجمع البحرین' کے متعلق عبارت انگریزی میں

'سفینۃ الاولیاء'، فارسی، قلمی کی عبارت مع تعداد اوراق فارسی میں

Oriental Biography سے داراشکوہ کی زندگی انگریزی میں

'سکینۃ الاولیاء' اور 'مجمع البحرین' یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں نہیں تھیں۔ یہ دونوں کتابیں خدا بخش لائبریری میں ہیں۔ 'سفینۃ الاولیاء'، سنہ تصنیف اس قلمی کتاب میں کہیں درج نہیں ہے۔ برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں جو عبارت ہے اس میں سنہ تصنیف نہیں ہے۔ برٹش میوزیم کے کیٹلاگ آف پرشین جلد اول، ص ۳۵۶ کی 'سفینۃ الاولیا' سے متعلق انگریزی عبارت کا ترجمہ:

'جیسا کہ دیباچہ سے واضح ہے مصنف کا مقصد یہی تھا کہ ہر ولی کا نام، پیدائش کی تاریخ، وفات کی جگہ اور مدفن اور دوسری تفصیلیں یکجا کی جاتیں جو بے شمار قدیم اور جدید تخلیقوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ص (ب) ۱۸۱ پر مصنف رقمطراز ہے کہ وہ بڑی جانفشانی اور کاوش کے بعد چند تاریخیں معلوم کرنے میں کامیاب ہوا جو 'نفحات الانس'، 'تاریخ یافعی' اور 'طبقات سلطانی' میں نہیں تھیں۔ اختتام کی تحریر سے واضح ہے کہ یہ تخلیق ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو پایۂ تکمیل تک پہنچی۔

سکینۃ الاولیاء، ص ۳۵۸: 'مصنف دیباچہ میں بیان کرتا ہے کہ جب اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی اسے ۱۰۴۹ھ میں سلسلۂ قادریہ کی ابتدائی تعلیم ایک مشہور و معروف پیر میاں جی کے ایک شاگرد محمد شاہ لسان اللہ، ص (الف) ۸۷، کے ذریعہ ملی جس کے زیر سایہ اس نے اپنی دولت اور مرتبہ کے باوجود بہت جلد ایک سچے درویش کی ساری صفات حاصل کر لی۔ مصنف

نے اس تصنیف کو ۱۰۵۲ھ میں مکمل کیا'۔

مجمع البحرین: برٹش میوزیم کیٹلاگ آف پرشین جلد دوم، ص ۸۲۸

ایک رسالہ: ہندو فلسفہ کے اصطلاحی الفاظ اور اسلامی تصوف میں اس کے مساوی محاورات:

بنام آن کہ او نامی ندارد
بہ ہر نامی کہ خوانی سر برآرد

ایک دوسرے نسخے (Add - 18.464.ii) کے دیباچہ میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس نے صوفیوں کے اصول کو اختیار کیا۔ اور جب ہندو سادھوؤں سے گفتگو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا صوفیوں سے اختلاف محض لفظی ہے تو اس نے یہ کتاب دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے لکھی۔ جیسا کہ اختتام کی تحریر سے ظاہر ہے کہ اس نے اس کتاب کو ۱۰۶۵ھ میں مکمل کیا، اس وقت اس کی عمر ۴۲ سال کی تھی (ملاحظہ ہو: ص ۱۴۰ Munich Catalogue)

حواشی:

(۱) موت المتقی حیاۃ لاانقطاع لھا: متقی کی موت ایسی حیات کو مستلزم ہے جس میں انقطاع نہیں ہے۔

(۲) تیراہٗ اذا ما جئتہٗ مستھیلاً کانک تغطیہ الذی انت سائلہٗ: جب طلب کے لیے تم اس کے پاس جاؤ گے تو اسے کشادہ رو منبسط پاؤ گے اس طرح پر گویا تم ہی اسے وہ چیز دے رہے ہو جو اس سے لینے آئے ہو۔

(۳) تعود بسا الکف حتیٰ لو انہٗ اراد الفباض لم تجیبہ انا ملہٗ: کشادہ دستی فطرت بن گئی ہے اگر مٹھی بند بھی کرنی چاہیں تو انگلیاں مڑ نہیں سکتیں۔

(۴) ولو لم یکن فی کفہ غیر وجھہ لجاد بھا فلیتق اللّٰہ أملہٗ: اگر ان کے ہاتھ میں اپنی جان کے سوا کچھ نہیں ہے تو طلب کرنے پر وہ بھی دے دیں گے تو طالب کو ایسے وقت میں خدا سے ڈرنا چاہیے۔

(۵) ھو البحر من ایّ النواحی اتیتہٗ فلجتہٗ المعروف والجود ساحلہٗ: وہ دریا ہیں، خواہ تم کسی طرف سے آؤ تم کو فیض پہنچے گے، اس کا کنارہ عطا اور ساحل بخشش ہے۔

☆☆☆

سید محمد حسنین

سید فصیح الدین بلخی عظیم آبادی

فاصلہ ہمارے محسوسات میں کیسی حیرت خیز تبدیلی پیدا کردیتا ہے اس کا عملی تجربہ کہسار کی نظارگی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ فاصلہ جس قدر دور ہو، کہسار کی نیرنگ نواز بلندیاں اور وسعتیں اپنے نشیب و فراز کے ساتھ از افق تا سطحِ دائرۂ بصارت میں بہ یک نظر سمٹ آتی ہیں۔ لیکن جب دامن کہسار میں آیئے تو یہ احساس یا ادراک کہ نقشہ دوسرا اور منظر متضاد ہے بغایت پر لطف اور انبساط افزا ہوتا ہے۔

میرا کچھ ایسا ہی تجربہ سید فصیح الدین بلخی (۱۸۸۵ تا ۱۹۶۲ء) کی شخصیت سے وابستہ رہا ہے۔ جب وہ مجھ سے دور تھے اور جب میں ان سے قریب ہوا۔ بعد اور قربت کے اس خوش گوار امتزاج نے ان کی سیرت و کردار کی دروں بینی میں نہ صرف میری معاونت کی بلکہ نئے دو پر کیفِ احساسات سے روشناس کرایا۔

میں نے فصیح الدین بلخی کو پہلی بار ۲۸ فروری ۱۹۳۷ء میں دیکھا تھا۔ یہ میری سگی بھانجی سیدہ کنیز فاطمہ عرف بے بی سلمہا کے عقد کی تاریخ تھی۔ اس تاریخ کو وہ سید محمد اسحاق بلخی سے بیاہی گئی تھیں۔ فصیح الدین بلخی کی بڑی بہن، بی بی مریم کے تین بیٹوں، سید جمال بلخی، سید محمد یوسف بلخی باطن اور سید محمد اسحاق بلخی میں آخر الذکر سب سے چھوٹے تھے۔ اس وقت وہ پٹنہ کے پرنس آف ویلس میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے متعلم تھے۔ بعد تکمیل تعلیم یہ بی۔ این۔ کالج میں بہ حیثیت میڈیکل افسر ملازم ہوئے اور اپنے سسرال 'کاشانہ' (محلہ بھونر پوکھر) میں پرائیوٹ طور پر پریکٹس کرتے رہے۔ چند سال بعد ڈاکٹر اسحاق کو ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو انھوں نے پاکستانی ملازمت قبول کی۔ ابتدائی چند سال مشرقی پاکستان میں گزارے، پھر مغرب چلے گئے۔

ڈاکٹر بلخی کی عمر نے وفا نہ کی۔ مرض سرطان کے پُراز امید کراچی واپس آئے مگر مقدر میں صحت نہ تھی۔ بہ تاریخ تیسری مارچ ۱۹۶۵ء اپنی فرشتہ صفت بیوی اور پانچ اولاد کو غم زدہ چھوڑ کر جان جان آفریں کے سپرد کی۔

ڈاکٹر بلخی کو مشایخ بلخیہ سے مزاج تصوف تو نہ ملا مگر ملکۂ شعر گوئی سے بہ درجہ بہرہ ور ہوئے۔ شعر و شاعری سے انھیں غایت ذوق تھا اور علم العروض پر اچھی نگاہ تھی۔ واقف تخلص تھا۔ ابتدا میں اپنے منجھلے ماموں سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کیا تھا، لیکن باضابطہ کسی کے شاگرد نہ رہے۔ شگفتہ بحروں میں ترکیب بند نظمیں، قطعات اور غزلیات لکھتے جن میں تاثراتی بوباس کے ساتھ صحت تراکیب الفاظ اور روزمرے پر کڑی نگاہ رکھتے۔ نغمۂ شادی اور نوحۂ غم کی ساعتوں میں سہرے اور تاریخی قطعات بھی منظوم کرتے۔ ان دنوں 'بزم سخن' (سائنس کالج پٹنہ) اور 'بزم ادب' (پٹنہ کالج) کی سالانہ تقریبات دھوم دھام سے منائی جاتیں۔ ان مواقع پر مذاکرے کے علاوہ شعر و نثر کے بین المدارس مقابلے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بلخی طرحی مصرعوں اور موضوعی نظموں پر طبع آزمائی کرتے مگر مشاعروں میں اپنا کلام پیش نہ کرتے۔

ڈاکٹر بلخی کو پان، زردہ اور چائے سے بڑی رغبت تھی۔ علم نجوم اور رمل سے بھی لگاؤ تھا۔ یہ شوق انھوں نے اپنے نانا ڈاکٹر غیاث الدین بلخی سے ورثے میں پایا تھا جن کی علم نجوم پر ایک تصنیف کا بھی ذکر ملتا ہے۔ علاوہ بریں ڈاکٹر بلخی کو کنڈلی بنانے کا بھی شوق تھا اور علم محاضرات کا بھی عمل کرتے تھے۔ خاندان یا برادری میں جب کوئی غیر معمولی سانحہ ہوتا مثلاً سنگین چوری، کسی فرد کی گم شدگی یا مفقود الخبری، تو وہ محاضرات کے ذریعے صورت حال کا علم حاصل کرتے۔ نتائج عموماً گول مول ہوتے مگر اپنی ذہانت اور تاویلات سے ڈاکٹر بلخی حاجت مند کو قائل کر دیتے۔ ایک بار سسرال میں راتوں رات بھیانک چوری ہوئی۔ کوئی فرد زنان خانے کے محفوظ کمرے میں رکھے کئی بڑے ٹرنک کھول کھول کر بیوی کے سارے زیورات اور کل نقرئی سامان اٹھا کر لے گیا۔ حیرت ہے کہ پاس کے کمروں میں سونے والوں کو مطلق بھنک نہ ملی۔ ڈاکٹر بلخی عامل محاضرات ہوئے۔ مختلف عمر کے بچوں اور ناخواندہ بڑوں پر متواتر عمل کیا لیکن ہوشیار چور کی سدھ بدھ علم محاضرات نہ دے سکا۔

ڈاکٹر بلخی مجھ سے عمر میں بڑے اور رشتے میں چھوٹے تھے مگر ادبی مذاق نے تفریق خردی و بزرگی ختم کردی تھی۔ میرا اسکول کا آخری اور کالج کے ابتدائی سال کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میں ح۔م۔ اسلم کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا تھا اور گاہے گاہے افسانے۔ ایک دوسرے کی نگارشات سننے کی دل چسپیوں نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کردیا تھا۔ پر اس رشتہ و روابط کے باوجود ڈاکٹر بلخی کے چھوٹے ماموں اور بیگم ڈاکٹر بلخی کے چھوٹے ماموں ایک دوسرے سے دور تھے. بہت دور۔

سید فصیح الدین بلخی کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے میں لاعلم نہ تھا کہ ڈاکٹر بلخی ہی اولین وسیلہ تھے۔ ہاں! فصیح الدین بلخی کے ایک بھتیجے سید رفیع الدین بلخی کے گھر آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ یہ ان کے بڑے بھائی سید حفیظ الدین بلخی (۱۸۷۳-۱۹۳۶ء) کے بیٹے تھے۔

رفیع الدین بلخی کا مکان ہمارے مکان کے پاس ہی تھا۔ یہ سول کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ شہر کے ایک سوشل اور احباب نواز وکیل تھے۔ بڑی جاذب نظر شخصیت تھی ان کی۔ تراشا سا خوبصورت چہرا، دراز بازو، خوش قامت، خوش پوش اور نہایت خوش بیان، سپید مائل گندمی رنگ پر گھنی انی دار مونچھ، ان کی خوب روئی میں اضافہ تھی۔ یہ پٹنہ کے ایک ذی علم اور مقبول وکلا میں تھے اور روشن دماغ کے ہر دل عزیز انسان۔ سیاسی مسائل پر غایت اعتماد کے ساتھ اظہار خیال کرتے۔ بہ ظاہر نیشنلسٹ تھے مگر محمد علی جناح کے مخالفین میں نہ تھے۔ شعر و شاعری سے اچھی دل چسپی تھی۔ سخن فہمی کے ساتھ سلیقۂ بذلہ سنجی بھی کم نہ تھا۔ اتوار کو یا یوم تعطیل میں ان کے مکان میں چند ہم مذاقوں کا جمگھٹا رہتا تھا جو دانشوران شہر کے لیے ساعت خوش وقتی ہوتی۔ جمیل مظہری اور سہیل عظیم آبادی سے میری جان پہچان رفیع الدین بلخی کی قیام گاہ میں ہوئی تھی۔ تاثرات کی فراوانی اول الذکر سے اور ثانی الذکر سے زیادہ حاصل ہوئی جو بعد میں چند برسوں کے اندر ہی اندر، تقابلی طور پر متضاد ہوگئی۔ جمیل مظہری کے تکلم میں فکر کی رعنائی ان دنوں بھی کم نہ تھی۔ بڑا دور رس دماغ تھا ان کا۔

فصیح الدین بلخی سے قریب ہونے کا دوسرا وسیلہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد (والد پروفیسر کلیم الدین احمد) تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی فہیم الدین احمد، فصیح الدین بلخی کے سب سے بڑے بھائی

حفیظ الدین بلخی کے گہرے دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر عظیم اور حفیظ بلخی ہم وطن تھے اور دونوں قادر الکلام شاعر۔ انھوں نے ۱۸۹۷ء میں عظیم آباد سے ایک گلدستہ موسوم بہ 'تحفۂ بہار' شائع کیا تھا جس کی ادارت حفیظ بلخی کے سپرد تھی۔

ڈاکٹر عظیم کے نانا، شمس العلما حکیم عبدالحمید پریشاںؔ، میرے والد کے سگے خالو تھے اور ڈاکٹر عظیم کی والدہ حکیم صاحب کی اولاد محل ثانی تھیں۔ عید بقرعید کے مواقع پر والد مرحوم کے ساتھ ہم سب بھائی اپنے دادیہالی رشتہ داروں سے ملنے جب پٹنہ سٹی جاتے تو صادق پور کے علاوہ محلہ خواجہ کلاں بھی ضرور جاتے جہاں ڈاکٹر عظیم اپنے تعمیر کردہ خوب صورت مکان میں رہتے تھے۔

خواجہ کلاں سے میرا آنا جانا چھ سالہ کالجی تعلیم کے اواخر میں بتدریج بڑھتا گیا۔ بی۔ اے کی تکمیل کے بعد اکثر اتوار کی صبح میں ڈاکٹر عظیم کے یہاں چلا جاتا۔ ان کی دل نواز شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی۔ گفتگو نہایت عالمانہ کرتے اور انداز گفتگو از حد دل نشیں ہوتا جیسے

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

تبحر علم، حسن مستزاد تھا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کو ان کا یہ انداز گل افشانی گفتار نصیب نہ تھا۔

ڈاکٹر عظیم سے رفاقت کا مقصد جذبۂ اکتساب علم تھا جس کا علاقہ نصاب درسی نہیں تفہیم مذاہب تھا۔ میں مذہب سے رسماً بھی بے گانہ کبھی نہ رہا۔ مذہبی امور میں، علمی سطح پر، جب کسی پہلو پر کچھ کھٹک محسوس ہوتی، تو اپنے گھر میں پروفیسر محمد اسلم (شعبۂ عربی فارسی و اردو سینٹ کولمبس کالج ہزاری باغ۔ مہاجر پاکستان، مدفون کراچی) کے بعد مجھے خاندان کی اس بزرگ ہستی سے رجوع کرنے میں لذت و راحت محسوس ہوتی۔ ذہانت اور فراست کے ساتھ نہایت نکتہ رس دماغ تھا ان کا۔

تو پٹنہ کی آمد و رفت میں کبھی فصیح الدین بلخی سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ خواجہ کلاں سے قریب بخشی محلہ میں رہتے تھے۔ ہماری ملاقات علیک سلیک سے زیادہ نہ تھی۔ ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے لائبریری مخطوطات میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر ان کی تقرری ہو چکی تھی۔

ایم۔ اے تک میں کہانی کار تھا۔ ندیم، گیا اور معاصر، پٹنہ میں کئی افسانے شائع ہو چکے تھے۔ علمی و ادبی موضوعات پر قلم کبھی کبھی اٹھتے۔ نصاب میں خصوصی مضمون 'بہار اسکول، تھا۔ عزیز الدین بلخی کی مشہور زمانہ تصنیف 'تاریخ شعرائے بہار' اور فصیح الدین بلخی کی 'تاریخ مگدھ،

کے مطالعے سے اس پرچہ کی تیاری پر خاص روشنی ملی تھی۔ فصیح الدین بلخی کی ادبی شخصیت کی دید وشناخت کا یہ پہلا موقع تھا ذاتی اور براہ راست۔ ان کی شخصیت کی تہ داری سے آشنا تو ضرور ہوا پر مزاج اور افتاد کی نیرنگیاں چشم مشاہدہ کی گرفت میں نہ آسکیں۔ عاشق تاریخ و تحقیق اور خادم زبان وادب کا یہ قدآور انسان میری نظروں سے دور تھا ہنوز کافی دور۔

ریاست بہار میں ادبیات اردو کا پہلا پی۔ ایچ۔ ڈی میں ہوں یہ تصدیق یا ترجیح محض اتفاق ہے۔ اس سبقت یا فضلیت کو حالات کی۔۔۔ سمجھتا ہوں اپنی سرفرازی نہیں مانتا۔ حق پرستی حسب مقدور میرا اشعار رہا ہے اور ہے لیکن 'تحقیقات' میرا شغل یا شرف نہیں۔ میرے معمولات میں عمل حق کی اثر اندازی غالب رہتی ہے پر میری استعداد مجھے محقق کا مرتبہ نہیں دے سکتی۔ میں 'تحقیقات ادبیہ' کی سنگلاخ وادی میں از خود نہیں آیا اس کی سیر وسیاحی کا شوق مجھے پروفیسر کلیم الدین احمد نے دلایا۔ رفاقت پروفیسر سید حسن عسکری اور رہبری قاضی عبدالودود نے کی۔ فخر ہے کہ ان خاصان علم وادب کی الفت وشفقت مجھے بے پایاں ملی۔ ان ہی بزرگان تنقید، تاریخ اور تحقیق میں ایک نام فصیح الدین بلخی کا بھی شامل ہے۔

فصیح الدین بلخی انجانے نہ تھے۔ قربت ہوئی تو یہ احساس تعجب خیز تھا اور حسرت ناک بھی کہ قرابت کے باوجود دشت تحقیق وتاریخ کی سیاحی میں اس جواں دل اور جاں باز مرد میدان کی فیض بخشی سے کیوں دور رہا اور کس قدر دور تھا۔ یہ ۴۸ء-۴۹ء کا زمانہ تھا۔ میرے مقالۂ تحقیقی کا موضوع میر و سودا کے ایک معاصر دہلوی شاعر مرزا محمد علی فدوی۔ حیات، عہد، شاعری کا اور کلام، تھا۔ تلاش موضوع کے بالکل ابتدائی ایام میں فصیح الدین بلخی کا نام اکیلا تھا۔ انھوں نے ہی فخر بہار اور میر منشی شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کے اس پہلے استاد اور گمنام استاد کا نام تجویز کیا تھا جس پر قاضی عبدالودود نے دو صاد لگائے۔ یہ مجھے فصیح الدین بلخی نے ہی بنایا تھا کہ ریختہ کے اس مقبول انام خوشگو کے قلمی دیوان کے تین نسخے موجود ہیں اور یہ کہاں ہیں۔

تنقید میں تاریخ کا عنصر لازمی نہیں، تحقیق کے لیے یہ ایک جزو لاینفک ہے۔ تاریخ میرے لیے باعث دلکشی نہ تھی۔ اسکول میں ان دنوں تاریخ اور جغرافیا لازمی مضامین تھے۔ میرا بھی دونوں ہی سے واسطہ رہا مگر جغرافیا نے بی۔ اے تک ساتھ دیا۔ جب ریسرچ سے واسطہ

ہوا تو شعرائے ریختہ کے تذکروں کے ساتھ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری تھا۔ طبیعت کو اس طرف کرنا ہی پڑا۔

فصیح الدین بلخی کی 'تاریخ مگدھ' نے اس مضمون سے دل چسپی بڑھا دی تھی۔ اس تصنیف اور اس کے مصنف کی قدر محسوس ہوئی۔ جب ان سے دور گزشتہ کے صاحب دیوان عظیم آبادی شعرائے ریختہ کی بات ہوتی تو جیسے تروتازہ معلومات کے دریچے کھل جاتے۔ عہد سراج الدولہ کے عظیم آبادی واقعات کی صراحت وہ ایسی تفصیل کے ساتھ اور نہایت معروضانہ انداز سے کرتے کہ حیرت ہوتی۔ ان کی زبانی مجھے عظیم آباد کے قدیم مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال سن کر راحت محسوس ہوئی۔ تاریخ اور ادبی تاریخ سے میرا ذوق وشوق فصیح الدین بلخی نے ہی بڑھایا۔

ریسرچ کی بامرادی یا تکمیل میں جہدارضی (FIELD WORK) وہی اہمیت رکھتی ہے جو سائنس داں کے لیے لیب (LAB)۔ یہ تحقیقات کی وہ منزل یا مکان ہے جہاں محقق کے استغراق، انہماک اور تفتیش وتلاش کو دیکھ کر اس کی علامت دیوانگی کا شبہ ہوتا ہے۔ اردو کے تحقیقاتی ادب میں اس نوع کی کدوکاوش کا پہلا نمونہ سرسید احمد کی 'آثار الصنادید' میں ملتا ہے۔ اس راہ کے دوسرے بڑے نام شہباز اور شبلی ہیں۔ دونوں نے جہدارضی سے خاطر خواہ کامرانی حاصل کی اور اس عمل کو مثالی بنایا۔ فصیح الدین بلخی میں بھی یہ عمل وعزم غضب کا تھا۔ وہ نچلے کبھی نہ بیٹھتے۔ مقصد حصول خام مواد ہو یا معاون مواد، وہ بے جھجک حوصلہ مندانہ اقدام کرتے، راہ کی صعوبت یا کام کی نامرادی کے احتمال سے کبھی دل برداشتہ نہ ہوتے۔ جب وہ نئے شہروں کی طرف رخ کرتے تو وہاں کی قدیم آبادی یا اس کے مضافات میں ضرور جاتے۔ ان شہروں میں انھیں ایسے اجڑے گھروں کی تلاش رہتی جہاں جذبہ توسیع علم فضل وبرکت میں داخل تھا۔ کہتے تھے کہ ان علم نواز متمول گھروں میں گردونواح کے نادار اور ہونہار لڑکوں کی پرورش وپرداخت کا رواج عام تھا۔ اور یہ بچے صاحب خانہ کی جاگیر سمجھے جاتے تھے۔ ان گھروں میں ایسے نقل نویس بطور ملازم رکھے جاتے جن کا کام کتابوں کی کتابت ہوتی اور اس آبادی کے بڑے بوڑھوں سے بات چیت کر کے وہ واقعی علم کے ایسے چھپے خزانوں کا پتا لگا لیتے جو بوسیدہ چوبی صندوق یا کرم خوردہ ٹوٹی الماریوں میں رکھے ہوتے اور ان کی راہ تکتے۔ پروفیسر اختر اورینوی

نے لکھا ہے:

...انھوں نے مخطوطات کا انبار لگا دیا۔ اس خرمن کے خوشہ چیں کم ہیں مگر بلخی نے دولت بے پایاں جمع کر دی ہے۔ نیپال، دکن، بہار، اتر پردیش کے گوشے گوشے سے بوریوں میں بھر بھر کر قلمی نسخے سمیٹے ہیں۔ کتب خانہ خدا بخش اور پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ادبی خزانے کی وجہ سے عظیم آباد آج مدینۃ العلم ہے...

فصیح الدین بلخی کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اپنے وسیلہ معاش میں بھی انھیں اس شوق کی آسودگی کا ہمیشہ خیال رہتا۔ ملازمت اور انتخاب ملازمت میں اس پر بھی ان کی نگاہ ہوتی کہ وہ نئی ہو، انجانی ہو اور دور دراز ہو۔ انھیں کسی جگہ قطب کی لاٹ بن کر رہنا گوارا نہ ہوتا۔ ملازمت جیسے دشت نوردی تھی اور قیام ملازمت عرصۂ آسودگی جذبۂ سیاحی۔

ان کی پہلی ملازمت سیوان میں نارتھ بہار سٹلمنٹ آفس میں بہ حیثیت قانون گو ہوئی۔ اس کی مدت طویل نہ تھی۔ جزیرۂ فجی میں سپریم کورٹ میں ترجمان کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ چند ہی سال ٹھہرے۔ پونا ملٹری آفس میں معلم منشی کا عہدہ ملا۔ فوجیوں کو اردو فارسی عربی کی تعلیم دیتے۔ قیام زیادہ دن نہ رہا۔ چند ایام کلکتہ میں گزارے اور فورٹ ولیم کالج سے بھی وابستہ ہوئے۔ اڑیسہ کے راجپوت اسٹیٹ سرائے کیلا میں ریونیو افسر بحال ہوئے۔ الغرض ہر جگہ اپنے جی سے جاتے۔ ادھر جی بھرتا ادھر قدم اٹھ جاتے۔ ان کی آخری ملازمت پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے MANUSCRIPT SECTION میں ریسرچ اسسٹنٹ کی تھی۔

فصیح الدین بلخی میں عزم و عمل کا شہ زور جذبہ تھا۔ ایک جذبۂ بے اختیار۔ ان کے مصروف ماہ و سال ان کے مزاج اور شعار کے مرقعے تھے۔ وہ عدم ثبات کے قائل تھے اور فریفتہ تبدل۔ معاش ہو یا مشاغل ان کے معمولات حیات میں یک رنگی نہ تھی۔ اس سرشت کو تلون پسندی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا ہر نیا قدم یا شغل نئے تجربے کی تفتیش تھی جیسے اسی روشنی سے وہ مقصد حیات کے تعین میں مدد لیتے ہوں۔ طبیعت کے اس عدم قرار کو عدم قناعت سے موسوم کرنا بھی غلط ہوگا۔ چونکہ زندگی کے ناموافق حالات میں بھی وہ اضمحلال و اضطراب

کے اسیر نہ ہوتے، اچھے یا برے مواقع پر بھی ان کی راست روی میں فرق نہ آنا، غیر متوقع آزرد گی بھی ان کے منصوبے یا مہم کو نیم جان نہ بنا سکتی۔ یہ ان افراد میں تھے جن کے حوصلے اور ہنر بخشی کے پیمانے یا پھیلاو کا اندازہ بہ یک نظر آسان نہیں۔ وہ سرگرم عمل رہے اور جذبہ بے اختیار کے ساتھ زندہ رہے۔

فصیح الدین بلخی کی مصروف زندگی کا ایک رخ ایسا بھی تھا جس میں تبدیلی نہ آئی۔ کم از کم اپنی رفاقت کی بیس سالہ زندگی میں میں نے کوئی فرق نہ دیکھا۔ یہ رخ ان کے معمولات کا ایک جز بنا رہا۔ فعال شخصیت اور فیض بخش سیرت کا ایک وصف خاص، ان کی درون خانہ مشرقیت اور بیرون خانہ مغربیت میں ایک محکم پائیداری تھی۔ وہ ٹائی کے ساتھ قدیم وضع کے تھری پیس سوٹ استعمال کرتے تھے جس کا رنگ صوفیانہ ہوتا۔ دن میں فلٹ ہیٹ اور شام میں نائٹ کیپ پہنتے، سگریٹ اور چائے کے عادی تھے۔ جو مقررہ اوقات پر اعلا قسم کے ہوتے۔ مہمان نواز تھے اور اچھے کھانے کے شوقین مگر طعام کے اقسام اور انداز مغربی ہوتے۔

فصیح الدین بلخی ادیب تھے تخلیق کار نہ تھے۔ یہ حسن کے شیدائی تھے اور حسن اخلاق کے تمنائی۔ ادب اور آداب حیات کی الفت نے ان کے کردار اور اطوار میں نفاست پسندی، خوش سلیقگی اور تنظیم کاری کا وہ حسن دل افروز پیدا کر دیا تھا جو اچھے حساس اور ہوش مند اہل ادب میں بھی کم نظر آتا ہے۔

انھیں تاریخ اور تحقیق سے فطری دل چسپی تھی۔ اس ذوق کی بالیدگی میں وہ ہمیشہ باشعور رہے۔ ان کی اکثر تاریخی اور تحقیقی کاوشیں، فتوحات کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن کامرانی کے باوجود ان کی نگارشات اور نظریہ میں DOGNATISM کے رنگ نہ ابھرتے۔ وہ منکسر المزاج تھے اور دل آزاری سے دامن بچاتے ہوئے حق بیانی سے گریز نہ کرتے۔ تکلم ہو یا تحریر، صیغۂ واحد متکلم سے عمداً احتیاط برتتے۔ اپنے اس سلوک اور مسلک میں وہ قاضی عبدالودود سے بہت دور اور پروفیسر سید حسن عسکری سے بہت قریب تھے۔ وہ اس مقولہ کے پیکر تھے

SIMPLE LIVING AND HIGH THINKING

فصیح الدین بلخی نے بڑی عمر پائی۔ انھوں نے دوڈوبتی اور ابھرتی صدیوں کی شام وصبح

دیکھی۔ دیارِ مشرق ان دنوں بہار، بنگالہ اڑیسہ تین ریاستوں میں پھیلا تھا۔ مرشد آباد اور عظیم آباد
اس دیار کے دو مشہور مراکز علم و ادب تھے۔ ایک شمع داغ فراق صحبت شب تھی اور دوسرا مہر نیم روز۔
انھوں نے عظیم آباد کے وہ سنہرے دن دیکھے جسے تاریخ ادب بہار کا دور درخشاں کہیے آزاد،
سید فضل حق، نواب سید محمد، اثر، سید امداد امام، پریشان، حکیم عبدالحمید حسرت، سید سعید احمد۔ جمیل مظہری۔
خیال، نصیر حسین۔ رنجور، سید محمد یوسف۔ ساقی، عبدالباری محمد۔ سخن، خواجہ فخر الدین دہلوی ثم عظیم
آبادی۔ سلطان، نواب سید تجمل حسین، سلیمان ندوی۔ شادؔ، سید علی محمد، شوق سید ظہیر احسن۔
شہبازؔ، سید عبدالغفور۔ عرش گیاوی، ضمیر الدین۔ عظیم، ڈاکٹر محمد عظیم الدین۔ مسلم، محمد مسلم۔
نساخ، سید عبدالغفور۔ وحشت، سید رضا علی۔ قاضی عبدالودود۔ یگانہ، مرزا یاس عظیم آبادی
ثم لکھنوی - اس دور درخشاں کے چاند تارے تھے۔ شاعری اور علم و ادب کے یہ اہم نام ہیں اور
ناقابل فراموش۔ یہ مشاہیر عہد گزشتہ فصیح الدین بلخی کے معاصرین تھے۔ ان میں چند ان کے
بزرگ تھے اور چند رفقا۔ ان باکمالوں سے ان کی رسمی راہ و رسم نہ تھی بلکہ اکثر سے ذاتی روابط تھے۔

امرا اور نوابوں کے محبوب اشغال میں شعر و شاعری کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ روساء عظیم
آباد کی محفل نشاط میں بزم شاعری کا بھی خاص مقام رہا ہے۔ ان کے دولت کدہ پر یا ان کی
سرپرستی میں مہتم بالشان مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ ان تاریخی مشاعروں میں فصیح الدین بلخی نے
نہ صرف شرکت کی اور کلام دلپذیر کے رنگ و آہنگ سے حظ اٹھایا بلکہ ان کاملین فن کی بالمشافہ
شاعرانہ چشمکوں کا عینی مشاہدہ بھی کیا جو برجستہ ہوتیں اور باران سنگ شہاب کی مثال ہیں۔

انھوں نے عظیم آباد کے ایسے کئی ادبی معرکے بچشم خود دیکھے جو بہار کی جان دار ثقافتی
زندگی کی رونق تھے۔ معرکۂ شاد اور پریشان، جن کا نقیب 'الپنچ' تھا، صفیرؔ و شادؔ کا معرکہ جو رشتۂ
تلمذ کا مسئلہ تھا، داستان سروش اور فسانۂ عجائب کا معرکہ جو سخن دہلوی اور رجب علی بیگ کے فن
داستان گوئی کا مباحثہ تھا۔ ان میں شاد عظیم آبادی اور حکیم عبدالحمید پریشان کے معرکہ کا سبب شادؔ
کا بے جا فخر و مباہات تھا۔ اپنی سخن دانی پر وہ دون کی لیتے۔ غضب یہ کہ شرفائے عظیم آباد کی
زبان دانی کو بھی نہ بخشا۔ حکیم صاحب نے نعوذ کہا۔ الپنچ نے ہوا دی۔ عظیم آباد کے کوچہ و بازار میدان
گئے۔ حکیم صاحب سے نبرد آزمائی کھیل نہ تھی۔ جید عالم تھے اور جہاں دیدہ۔ سیکڑوں اشعار

پر مشتمل فی البدیہہ عربی قصائد کہنے میں طاق، حاذق طبیب تھے اور علاج کی دور دور تک دھوم تھی۔ شاد ناعاقبت اندیش نہ تھے۔ اپنی عاقبت کیوں بگاڑتے، عاجزانہ اور معصومانہ کہا:

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں
بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا

ایک وہ دن تھے اور ایک یہ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی 'اردو شاعری پر ایک نظر، ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ شاد عظیم آبادی کا کہیں ذکر نہ تھا۔ میں نے چھیڑا 'ذہن نقاد اس جا عصبیت کا شکار ہو گیا ہے' کلیم صاحب مسکرائے جواباً کہا 'یہ کتاب اردو شاعری کی تاریخ نہیں چند اصناف شاعری پر تنقید ہے۔'

اس کتاب کے چار ایڈیشن اضافے اور تبدیلی کے ساتھ منظر عام پر آتے گئے۔ مصنف نے مگر شاد عظیم آبادی کا نام نہ لیا۔ میں ہر بار ٹوکتا۔ کئی برس بعد انھوں نے ایک خاص زاویۂ تنقید سے کلیات شاد کی تدوین کی اور اپنے مقدمہ میں مقام شاد کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

... حد تو یہ ہے کہ کبھی کبھی شاد کے قدم میر اور غالب سے بھی آگے اٹھ جاتے ہیں...

حق بخشے، بڑوں کی بڑی بات ہے۔

فصیح الدین بلخی تحقیق میں قاضی عبدالودود، تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور تاریخ میں پروفیسر سید حسن عسکری کے مدمقابل نہیں۔ اصلاً وہ خادم زبان ہیں اور ایک بے لوث بندۂ اردو۔ وہ بڑے محقق یا مورخ میں بھی شمار نہ ہوں گے مگر ان کی خدمت اردو کا مقام پروفیسر آل احمد سرور کے اس خیال میں پوشیدہ ہے:

بڑا نقاد وہ نہیں جس کی رائے ہمیشہ صحیح مانی جائے۔ بڑا نقاد وہ ہوتا ہے جس کی رائے سے دوسروں کو کسی موضوع پر بہتر اور جامع رائے قائم کرنے کی توفیق ہو اور اس جامع رائے کا سراغ اس نقاد کی رائے سے ملا ہو۔

فصیح الدین بلخی کی علمی اور ادبی کارگزاریاں کچھ ایسی ہی عظمت کی حامل ہیں۔ صحیح معنی

میں وہ 'طالب تحقیق' تھے۔ ان کی زندگی تاریخی حقایق کی تلاش وتفتیش میں گزری۔ ان کا سرمایۂ جہد ارضی سے بے پایاں ہے۔ ان کی تحقیقات کے مواد یا مسالا سے بہتوں نے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر کالی کنکر دت ہوں یا پروفیسر قیام الدین احمد، پروفیسر سید اختر احمد اورنیوی ہوں یا ڈاکٹر سید مظفر اقبال۔ فصیح الدین بلخی کے انمول خزانۂ مخطوطات سے جھولیاں سب نے بھریں اور ان کے قائم کردہ نشان راہ سے منزل مقصود حاصل کیا۔ وہ بحر تحقیق کے غواص تھے۔ گوشہ آب تہ دار سے انھوں نے چھوٹے بڑے موتی کے خزانے نکالے، انھوں نے دربائے بے بہا جو مال بازار نہیں، مآل ادب ہوئے، اردو کے اس جان نثار خادم کو زندہ رکھنے والی چار کتابیں ہیں۔

۱۔ انشاد شاد (تنقید) مطبوعہ ۱۹۳۴ء (۱)، قومی پریس، بانکی پور پٹنہ

۲۔ تاریخ مگدھ (صوبۂ بہار کی مکمل تاریخ ۶۴۲ ق تا ۱۹۴۳ء) مطبوعہ ۱۹۴۴ء انجمن ترقی اردو ہند

۳۔ تذکرہ نسوان ہند (تذکرہ) مطبوعہ ۱۹۵۴ء شمسی پریس پٹنہ سٹی

۴۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار (تذکرہ) مطبوعہ ۱۹۶۲ء نیشنل بک سنٹر ڈالٹن گنج

سید فصیح الدین بلخی کی وفات ۱۴/ مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوئی۔ جمیل مظہری نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔ تاریخی مصرع ہے۔

کہہ فصیح الدین بلخی آج ہیں شبلی کے پاس

۱۳۸۱ھ

☆☆☆

۱۔ رسالے پر سال اشاعت موجود نہیں معلوم نہیں مقالہ نگار نے یہ سال کہاں سے درج کر دیا ہے (عباس)

احمد یوسف

فصیح الدین بلخی - ایک بڑا عالم اور محقق

فصیح الدین بلخی انیسویں صدی کے اواخر کے آدمی تھے (پیدائش ۱۰ر فروری ۱۸۸۵ء)
انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے امتیازی شان سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ والد کی وفات کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ تک پونا ملٹری اسکول میں معلم رہے، پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک فورٹ ولیم کالج میں معلمی کی۔ اس کے بعد جزیرۂ فجی کی عدالت عالیہ میں بحیثیت مترجم بحال ہوئے۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے اور وطن واپس آ گئے۔ یہاں کواپرٹو کورس کا امتحان دے کر ملازمت شروع کی۔

فوجی ملازمت کے سلسلے میں پہلی جنگ عظیم میں سیریا، مصر، فلسطین، دمشق، بیردت اور بیت المقدس وغیرہ میں رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر اس نوکری سے استعفادے دیا۔ کئی برسوں تک سخت معاشی بحران میں مبتلا رہے۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں ریاست سرائے کیلا میں REVENUE OFFICER اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے بحال ہوئے اور وہاں سے ۱۹۴۷ء میں رٹائر ہونے کے بعد یونیورسٹی میں شعبۂ مخطوطات کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے۔

تالیفات:۔

۱۔ تارخ مگدھ: سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۴ - ۲۰ ابواب پر پھیلی ہوئی ۴۶۹ صفحات پر مشتمل، صوبۂ بہار کی یہ تاریخ ۲۶۳ ق۔م۔ شروع ہو کر ۱۹۴۳ء پر ختم ہوتی ہے۔
۲۔ انشاد شاد: قومی پریس بانکی پور، ۱۹۴۰ئ - ۲۰۳ ص۔ شاد عظیم آبادی کی شاعری

کے نقائص بتائے ہیں۔

۳۔ تذکرۂ نسوان ہند: شمسی پریس پٹنہ ۱۹۵۶-۳۲۵ص۔

۴۔ تذکرۂ ہندو شعرائے بہار: نیشنل بک سنٹر ۱۹۶۲ء-۱۶۹ص۔مقدمہ' کتاب کی تاریخ ۳۱؍جولائی ۱۹۶۱ء (مصنف کا انتقال ۱۴؍مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوا) صاحبزادہ نادم بلخی نے ۱۶؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کی مورخہ' احوال ضروری' کے عنوان سے فصیح الدین بلخی صاحب کی مختصر سوانح عمری کا اضافہ کیا ہے۔ایک تصویر بھی شامل ہے۔اس میں ۱۲۰۰ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کے بہار کے ۱۳۱ ہندو شعرا کے حالات مع نمونہ کلام (اردو فارسی) درج ہیں۔

رسائل میں شائع شدہ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) شوق قدوائی اور شوق نیموی کا ایک شاگرد۔شائع شدہ کوئل،ڈالٹن گنج اپرس ۱۹۶۲ء

(۲) امیر مینائی' صبح نو' اگست ۱۹۵۸ء(۳) مخالفت قیاسی' اشارہ' پٹنہ مارچ،اپریل۔

(۴) اطراف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام،انسان' پورنیہ نمبر ۱۹۵۶ء (۵) روز ماہ وسال کی سرگزشت' تہذیب' دسمبر ۱۹۵۲ء،(۶) عظیم آباد کا ایک جوانمرگ شاعر' تہذیب' اگست ۱۹۵۴ء،(۷) اردو قواعد ولغات کی تدوین' تہذیب' اپریل ۱۹۵۳ء۔(۸) تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف' اشارہ' فروری ۱۹۵۹ء (۹) اجاگر چند الفت' اشارہ' جنوری' فروری ۱۹۶۰ء (۱۰) پلاموں کی تاریخی سرگزشت' کوئل' ڈالٹین گنج' ستمبر ۱۹۶۱ء،(۱۱) شبلی نعمانی' صبح نو' اگست ۱۹۶۱ء،(۱۲) موسیقی اور شاعری' مصدر' پٹنہ جولائی ۱۹۵۶ء،(۱۳) راسخ عظیم آبادی' صنم' پٹنہ' بہار نمبر' ۱۹۵۹ء،(۱۴) امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں صبح نو' مئی ۱۹۵۸ء(۱۵) فدوی پر ایک مسدس' معاصر' پٹنہ ج دوم ۱۹۵۴ء(۱۶) راجہ رام نرائن موزوں واشارہ' پٹنہ جنوری ۱۹۵۹ء (۱۷) سرقہ اور توارد' اشارہ پٹنہ (۱۸) صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت' نگار' لکھنؤ ۱۹۵۳ء (۱۹) عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر' صدائے عام' خاص نمبر (۲۰) عظیم آباد میں شعرا کے مزارات معاصر جنوری ۵۲ء (۲۱) وزیر علی عبرتی' اشارہ جنوری ۵۴ پٹنہ (۲۲) نواب امداد امام اثر۔(۲۳) منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد' ندیم' بہار نمبر گیا ۱۹۳۴ء،(۲۴) قلعۂ رہتاس کی تاریخ' ندیم' گیا (۲۵) مثنوی گوہر جوہری' اشارہ' پٹنہ (۲۶) شوق نیموی' اشارہ دسمبر ۵۸ء، پٹنہ

(۲۷) مولوی سجاع الدین ’صبح نو‘ پٹنہ۔

فصیح الدین بلخی کے وہ مضامین جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں

۱۔ علی ابراہیم خاں خلیلؔ (۹) ۲۔ ملا غلام یحیٰ بہاری۔

ان کے کچھ اہم ریڈیو ٹاک درج ذیل ہیں :۔

۱۔ صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت ۲۔ بہار شریف کا میلہ ۳۔ محمود گانواں ۴۔ ملک محمد جائسی اور پد مادت ۵۔ اکبر کے نورتن میں فیضیؔ اور ابوالفضل ۶۔ تاریخی کتابوں کی بطور مآخذ اہمیت۔

فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ علم نجوم (سائزہ ۵×۱۰‘ صفحات ۱۰۹ ۲۔ تحریک وہابیہ‘ بہار میں THE WAHA BI MOVEMENT IN BIHAR ۳۔ آثار بلخیہ ۴۔ آثار قدیمہ ۵۔ دستور سخن۔

غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیل:

۱۔ علم نجوم (مخطوطہ)

باب اول

۱۔ فصل اول: تعداد اسماے بروج ۲۔ فصل دوم: حالات بروج ۳۔ فصل سویم: درجات بروج ۴۔ فصل چہارم: زمانہ قیام بروج ۵۔ فصل پنجم: تعلقات بروج۔ ۶۔ فصل ششم: نواں ۷۔ فصل ہفتم: اعداد بروج ۸۔ فصل ہشتم: خواص بروج۔

باب دوم

منازل یعنی نچھتر

۱۔ فصل اول: تعداد اسمائے نچھتر ۲۔ فصل دوئم: بیان حروف متعلقہ نچھتر ۳۔ فصل سویم: خواص نچھتر۔

باب سوئم - تاثرات

۱۔ فصل اول: ایام اوقات ولادت ۲۔ فصل دوئم: خاصیت ماہ تولد ۳۔ فصل سویم: خاصیت بکرمی ۴۔ فصل چہارم: خاصیت تاریخ یعنی نتر ۵۔ فصل پنجم: خواص روز ۶۔ فصل

ششم: خواص توانسا ۷۔ فصل ہفتم: خواص کرن۔

باب چہارم۔ ستارگان

۱۔ فصل اول: تعداد اسمائے ستارگان ۲۔ فصل دوئم: حالات ستارگان ۳۔ فصل سویم: دوستی ودشمنی ستارگان ۴۔ فصل چہارم: خواص ستارگان ۵۔ فصل پنجم: سختی ونرمیٔ ستارگان ۶۔ فصل ششم: مدارج ستارگان ۷۔ فصل ہفتم: جمیعت واستقامت ستارگان ۸۔ فصل ہشتم صورت وسیرت ستارگان ۹۔ فصل نہم: خواص از روئے مدارج ستارگان ۱۰۔ فصل دہم: تعلقات ستارگان۔

باب پنجم

۱۔ فصل اول: طریقہ کنڈلی بنانے کا۔ ۲۔ فصل دوئم: حقیقت طالع ۳۔ فصل سویم: امتحان صحت زائچہ (الف) امتحان اول۔ پدر مولود وقمر کا۔ (ب) مکان پیدائش (ت) امتحان مکان نو۔ (ث) امتحان تعداد عورت زچہ خانہ (ج) امتحان چراغ زچہ خانہ (ح) امتحان چار پائی حاملہ (خ) طریقۂ دریافت بابہ (د) امتحان صحت پرس کنڈلی (زائچہ سوال) ۴۔ فصل چہارم: اقسام خانہ ۵۔ فصل پنجم: منسوبات دروازہ خانہ ۶۔ فصل ششم: سرخی مدارج ستارگان ۷۔ فصل ہفتم: خواص ستارگان مطابق دروازہ خانہ۔

مجموعی طور پر اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب میں علم نجوم سے متعلق رموز ونکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جابجا ڈانگراموں اور جدول سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اگر کبھی یہ کتاب شائع ہوئی تو اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہوگی۔

زائچہ پیدائش جو نجمی صاحب نے خود ہی بنایا تھا

۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز چہار شنبہ ۳ بجے شب مطابق پھاگن بدی ۱۹۱۰ سمبت۔

۲۔ تحریک وہابیہ بہار میں: کتاب انگریزی میں ہے اور اس میں کل ۲۳ ابواب ہیں۔ ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) The Wahabi Creed (2)Patna Made a centre of the movement (3) character of Patna Muslims (4) Patna Moulavis join syed Ahmad (5) The doctrine of Hijrat (6) War on the frontier (7) The

Balakot disaster (8) Maulavi Nasiruddin"s defeat of Ghazni (9) Wilayat Ali and Enayet Ali as Leaders (10) At Kanpur (11) Resumption of activities in1850 and Sermon in the Fort of Delhi (12) Non- Cooperation. passive resistance and Paralell government.(13)Enayat Ali against the Britishers (14) Arrest of Wahabi leaders in 1857 (15) British Military expedition to the frontier (16) Maulavi Abdullah resumes leadership (19) Ambala Trial of 1864 (18) Patna Trial of 1869 (19)Confiscation of Properties destruction of graves (20)The After- Math (21)Arrest and Convictions of Amir khan and Hashmat Dad khan 1869 -70 (22) Insdiscriminate Proceedings (23) Release in 1884.

علمائے صادقپور کے گھروں اور قبرستان کے نقشے وغیرہ خصوصی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے برٹش سامراج کے مظالم کی بڑی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے ہیں جو ۳۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ کمپنی نئی دلی سے جلد ہی شائع ہوجائے گی۔

۳۔ آثار بلخیہ :۔ بلخی صاحب کی یہ تیسری غیر مطبوعہ کتاب ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے مادۂ تاریخ ۱۳۴۹ھ نکلتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں بلخی صاحب کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم ادھم بلخی، حضرت شمس مظفر بلخی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی جیسے ناموراولیا اوران کے خاندان کا حال قلم بند کیا گیا ہے ساتھ ہی خاندان بلخیہ کا نسب نامہ بھی ہے۔

اس کے بعد کے باب میں شہر بلخ کے حالات اور حضرت ابراہیم ادھم بلخی کے واقعات ملتے ہیں۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'بلخیوں کی ہندوستان و بہار میں آمد'۔ آگے ایک چھوٹی سی سرخی ملتی ہے 'بلخی شاہزادے کا باغ'

چوتھے باب کا عنوان ہے ''مولانا شمس بلخی۔'' پانچواں باب ہے 'مولانا برہان الدین شمس مظفر بلخی۔ چھٹے باب کی سرخی ہے حضرت حسین ملقب بہ نوشہ توحید بلخی۔ ساتویں باب کی سرخی ہے مولانا حسن بلخی۔ آٹھویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم احمد بلخی ملقب بہ لنگر دریا بلخی۔ نویں باب کی سرخی ہے مخدوم ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی، اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی ذکر آیا ہے اور لکھا ہے کہ مخدوم حافظ بلخی، مخدوم ابراہیم کے منجھلے بیٹے تھے۔ آپ ہی کی

اولاد ہے جو خانقاہ فتوحہ کا نظم ونسق دیکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم شاہین بلخی، مخدوم محمود بلخی ابن ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے۔ دسویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم درویش بلخی۔' اس کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں۔ ان کی سرخیاں یوں ہیں: ''مولوی محمد واحد بلخی ابن قاضی طہارت التوحید بلخی ومولوی حمید الدین بلخی متخلص بہ اوج''۔ یہاں پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور بھی لکھنا چاہتا تھا یعنی اس کے بعد کے لوگوں کے احوال، لیکن اسے موقع نہیں ملا۔

فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ پدری

حضرت عبد مناف سیدنا شمس الدین بلخی

حضرت ہاشم (درزمان سلطان محمد تغلق عہدہ در دیوان شاہی یافتن)

حضرت عبدالمطلب مولانا قمرالدین مولانا سید معز بلخی مولانا امین

حضرت ابوطالب بلخی (خلیفہ مخدوم چرمپوش)

بلخی

حضرت علیؓ حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی

حضرت امام حسینؓ مخدوم حسن بنی فردوسی

حضرت زین العابدین مخدوم احمد لنگر دریا بلخی

حضرت امام علی اصغر مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی

سیدنا قاسم مخدوم شاہین بلخی

امیر سید محمد مخدوم ابراہیم بلخی

سید زید مخدوم جنید بلخی

سید اسحاق حضرت دیوان معین الدین بلخی

سید احمد حضرت دیون معمور شاہ بلخی

سید یعقوب حضرت دیوان فخر اسلام بلخی

سید محمد حضرت فہیم اللہ بلخی

سید ناصر الدین قاضی سید طہارت التوحید بلخی

سید امیر رسلمان　　　　سید واجد بلخی

سید سلطان ابراہیم ادھم بلخی قدس سرہٗ　　　　مولوی سید ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

سیدنا محمد و بلخی　　　　قاضی امین الحق　قاضی واعظ الحق

سیدنا سراج الدین بلخی

سیدنا حمید الدین بلخی

سیدنا علی بلخی

فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ مادری

ملا رکن الدین منیری از اولاد حضرت مخدوم

تاج فقیہہ در قصبہ میر شرف

ملا عبدالشکور

ملا عبدالحکیم

ملا عبدالرقیب

ملا غلام شریف

ملا غلام یحیٰ

قاضی کمال الحق

۴۔آثار قدیمہ: اس کتاب کا ذکر فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب تاریخ مگدھ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ مخطوطہ مجلد ہے اور خوش نویس کی تحریر میں ہے۔ سائز ۱۲×۸ ہے اور صفحات ۲۴۳ ہیں۔ اس مجلد مخطوطہ میں کل ۲۶۰ سرخیاں اس طرح ہیں: ''عظیم آباد کے جغرافیائی حالات۔ گنگا ندی، سون ندی، پن پن ندی، موربر درد یا ندی، پھلکو، متھواس میانہ اور شکری ندی، پہاڑی، عام کیفیت، نباتات، شمار فصل ربیع، گوبی، آلو کی کاشت، اشجار و ثمر۔

قصبہ منیر کا حال: ۹۸۰ھ کی مسجد، لنگر قلی خان کی قبر ۹۸۳ھ، بڑی درگاہ اور سندھ در کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۴ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، مقبرے کا کتبہ ۱۰۳۶ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ، قصبہ منیر کی مسجد

۱۱۰۳ھ، دوسری مسجد کا کتبہ ۱۲۱۲ھ، بعض مشاہیر کا ذکر شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ، قصبہ دانا پور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ، شاہ محمد اکبر ابوالعلائی کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۳۳۴ھ، لان سے شاہ درگاہ ارزاں تک، باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ، تبارک علی کی مسجد ۱۲۷۵ھ، ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پر لگا ہوا ہے۔ ۱۰۴۰ھ میں یہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ اجالت خاں کی مسجد ۱۲۲۴ھ، مسمات نورن کی مسجد ۱۲۳۳ھ، بھکنا پہاڑی، درگاہ شاہ ارزاں کے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ، درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲، شاہ سجادل کا مزاز ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کریم بخش کا مزار ۱۲۵۲ھ، عباداللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۰ھ کتبہ عید گاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۰ھ، شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ۔

ننموھیہ سے پچھم دروازے تک: نچلی سڑک انگلش روڈ کے انحراف کا حال، شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، کتبہ ۱۹۲۷ء ایک لامعلوم شخص کی قبر اور گنبد، ڈنکے کی املی کی مسجد ۱۱۹۶ھ، ایک اور مسجد، ایک لامعلوم قبر اور گنبد، مسجد ۱۲۱۷ھ شاہ باقر کے تکیے کا کتبہ، شاہ حمزہ علی کا کتبہ اور مزار ۱۲۲۶ھ، شاہ کالے کا مقبرہ ۱۱۲۴ھ، لان کی مسجد ۱۲۵۸ھ۔

عدالت کے احاطے میں میجر فاکس کی قبر ۱۷۶۴ء، بی بی ماں کی مسجد ۱۲۱۲ھ، بی بی ماں کی قبر ۱۲۲۵ھ۔

مراد پور، خدا بخش لائبریری، مراد پور کی مسجد ۱۲۳۳ھ کا کتبہ، حمام کا کتبہ ۱۲۴۹ھ، پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے مکانات، انجینیر نگ کالج، گولکپور کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خادم علی کی مسجد ۱۲۵۸، تاجو کی مسجد ۱۲۱۴ھ، ۱۲۸۲ھ کی مسجد، پتھر کی مسجد ۱۰۳۶ھ، موہن ڈفالی کی مسجد ۱۲۶۳ھ، ایک انگریز کی قبر ۱۸۲۰ء، جلالت خاں کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۶ھ، حاجی چاند کی مسجد ۱۲۵۲، بی بی لطیف کی قبر کا کتبہ ۱۲۷۶ھ، گلزار باغ میں اثناعشریہ کی مسجد ۱۲۶۱ھ، شیخ تیغ علی کی مسجد ۱۲۵۵ھ، بی بی مدار بخش کی قبر ۱۲۵۸، شاہ عالم بادشاہ کی جلوس گاہ ۱۲۶۵ھ، پیر بخش ۱۲۶۵ھ

لودی کٹرہ سے خواجہ کلاں گھاٹ تک: تکیہ شاہ کی قبر ۱۲۵۷ھ، حسینی بیگم کی قبر، مسماۃ جعفر کی قبر ۱۲۰۳ھ، دولی گھاٹ میں بی بی مخدومن کی مسجد ۱۱۹۰ھ، جانی مسجد میر ابراہیم کی قبر

۱۱۹۹ھ، شیش محل کی دوسری مسجد ۱۲۶۴ھ، ولندیز کا پشتہ، میتن گھاٹ کی مسجد اور حضرت منعم پاک کا مزار، حضرت شاہ عشق کا تکیہ، حاجی تقی کی مسجد اور مقبرے کا ذکر، محمد کریم شاہ کی قبر ۱۳۳۳ھ، بخشی گھاٹ اور ڈاکٹر فلرین کا مکان، رائے صاحب کا پشتہ، حویلی بیگمان۔

پچھم دروازے سے پورب دروازے تک کا حال: مرزا معصوم کی قبر ۱۰۳۳ھ، محلہ گذری کی عمارتیں، مرزا علی کی قبر ۱۲۶۵ھ، شیخ رضا کی مسجد اور ایک قبر، بادشاہ محل اور بادشاہ نواب مارکیٹ، نواب لطف علی خاں بادل کی مسجد ۱۲۰۰ھ، منیر الدولہ کی قبر ۱۱۸۸ھ، بیٹی بتیال اور رحیم النساء کی قبر ۱۱۶۰ھ، انگریزوں کا گورستان اور مقتل ۱۷۶۳ء۔

۱۷۶۳ء محلہ گورہٹہ کی بڑی مسجد ۱۲۱۴ھ، محلہ گورہٹہ کی چھوٹی مسجد ۱۲۱۴ھ، پادری کی حویلی ۱۷۱۲ء، لیڈی روز امام کی قبر ۱۹۲۷ء، بخشی محلہ، نواب جعفر علی خاں کا گورستان، اشرف النسا بیگم کی قبر ۱۳۳۰ھ، نواب تصدیق حسین خاں کی قبر ۱۳۴۰ھ، مولوی اکرام الحق کی مسجد ۱۳۴۷ھ (جو بلخی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے)، ارشاد علی عرف کی چھٹن کی قبر ۱۳۴۳ھ، مہدی علی عرف نبن کی قبر ۱۳۴۴ھ، محمدی جان کی مسجد ۱۳۰۵ھ، کوچہ کمنگر کی مسجد ۱۲۶۱ھ، محلہ خواجہ میر کلاں، ڈاکٹر صادق خاں کی مسجد ۱۲۹۹ھ، مخدوم حسن علی کا مزار ۱۲۴۴ھ، جعفر خاں کی عدالت ۱۰۷۴ھ، حسن علی کا دار العلوم ۱۱۴۲، مسجد بیگو حجام ست گھروا (حسین شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہے) ۹۱۶ھ، بیگو حجام والا کتبہ ۱۰۵۶ھ، اورنگ زیب کی مسجد جو روضہ کی مسجد کہی جاتی ہے ۱۰۹۲ھ، فخر الدولہ کی مسجد ۱۲۰۲ھ، گدام کی مسجد متصل کٹرہ شائستہ خاں ۱۲۹۶ھ، چوک کی مسجد ۱۲۵۱ھ، خواجہ عنبر کی مسجد ۱۱۰۰ھ، مدرسہ سیف خاں کے سیفی مدرسہ کی مسجد ۱۰۳۸ھ، عمارت چہل ستون وکلام عظیم آباد، قلعے کے باہر ایک مسجد ۱۲۲۹ھ، شاہ معروف کی قبر۔

مغل پورہ کے کتبے: صغریٰ بیگم کی قبر ۱۳۱۳ھ، صغریٰ فاطمہ کی قبر ۱۳۳۴ھ سید کرامت کی قبر ۱۳۳۲ھ، شیخ احمد علوی کی مسجد ۱۲۵۲ھ شیخ بہاری کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خواجہ عطاء اللہ کی قبر ۱۲۶۳ھ، شیخ محمد رفن کی قبر، مولوی نوادر علی کی قبر ۱۲۶۳ھ، علی حسین دلدنجو کی قبر ۱۳۲۰ھ، حاجی عباس کی قبر ۱۳۴۷ھ، مظہر حسین کی مسجد ۱۳۴۷ھ، مظہر حسین کی مسجد ۱۳۰۴ھ، میاں خاں کی قبر ۱۲۷۱ھ۔

جگی چوراہا، گلشن حیدری، کنگھیاٹولہ، سنارٹولی، شاہ کی املی، نودی کٹرہ اور دوندی بازار کا حال: یام صاحب کی مسجد ۱۲۴۳ھ، بلاتی کی مسجد ۱۲۰۵ھ، میر قطب الدین کی قبر ۱۱۸۳ھ، گورستان سید علی عظیم کی قبر ۱۲۳۴ھ، سید نظام الدین کی قبر ۱۳۰۵ھ، گھسوبی بی کی قبر ۱۲۴۱ھ گلشن حیدری و گلشن حیدری کی مسجد، امام باڑہ گلشن حیدری میں جڑا کتبہ ۱۲۵۰ھ، سید نجف علی کی قبر ۱۲۶۱ھ، نواب یوسف علی خاں کی قبر ۱۳۱۴ھ، عبدالحق خاں کی قبر ۱۳۱۰ھ، قبر کلثوم بی بی، بشارت حسین کی قبر ۱۳۰۸ھ، محمد ذاکر کی قبر ۱۳۲۲ھ، سنارٹولی میں مرزا معشوق کی قبر ۱۳۴۱ھ، محلہ باغ میر گلابی میں شاہ وارث علی کی قبر ۱۲۲۱ھ، محمد شاہ کی املی میں ایک مقبرہ ۱۲۱۲ھ، کشمیری کوٹھی میں فضل علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ، کنگھیاٹولہ میں چند کتبے، شیخ غلام یحییٰ حضور کی مسجد ۱۲۰۷ھ، شیخ غلام یحییٰ کی قبر، مرادالنساء کی مسجد ۱۲۳۲ لودی کٹرہ میں دوسری مسجد ۱۲۲۳ھ، کلیم احمد حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، ایک گنبد کی مسجد یادوندی بازار کی مسجد ۱۰۶۱ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۰۵۰ھ۔

منگل روڈ کا حال: پیارالنسا کی قبر ۱۱۹۹ھ، منگل تالاب چوک شکار پور کی مسجد ۱۲۸۷ھ چوک شکار پور کتبہ کی دوسری مسجد، حاجی تاتار کی مسجد، منشی کاظم علی کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۸ھ، حاجی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ، محلہ ڈھول پورہ شیر شاہی مسجد محمد مراد شہید صوفی کا کتبہ ۹۴۹ھ، اشرف علی خاں فغاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۲۳ھ، حسین بیگم کی مسجد ۱۲۴۲ھ سید اقبال رضوی بن سید حیدر علی رضوی المعروف بہ جمال حسین ۱۲۲۹ھ، فیض النساء بیگم کی قبر ۱۲۶۷ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد ۱۰۷۲ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۷۲ھ، مسماۃ فاطمہ کی قبر ۱۱۸۸ھ میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ، میر اشرف کی وفات کا قطعہ تاریخ ۱۱۸۸ھ، میر فرحت حسین کی مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد، شاہ منصور کی قبر۔

نواب هیبت جنگ کا مقبرہ: واقع محلہ بیگم پور ۱۷۴۸ء، افضل حسین کی قبر ۱۰۶۲ھ، حاجی علی بخش کی مسجد، کلثوم النسا کی مسجد، شاہ کمک کی مسجد، شاہ کڑک کی مسجد ۱۳۵۳ھ، شاہ کڑک کی قبر، سرائے کی مسجد اور آمنے سامنے والی مسجد، عبدالرحمان سجاد کی مسجد ۱۱۵۰ھ، تھانہ مال

سلامی میں ایک قبر کا کتبہ بغیر نام وتاریخ، ڈیس کوٹھی اور برتر کی قبر ۱۷۹۰ء، مسجد سیرہ میر کے پاس ایک لڑکے کی قبر ۱۲۱۹ھ۔ مسجد پیرڈمریا گنگا ندی کے کنارے، منجھلی بیگم کی قبر ۱۲۸۲ھ، شاہ ڈمریا کی قبر، محلہ نون گولہ کی مسجد، شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ بلن کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر ۱۱۵۵ھ، محمد حسین ولد مصنف سیر المتاخرین غلام حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ باڑے کی مسجد ۱۲۱۷ھ، عالی النساء بیگم کی مسجد ۱۲۴۴ھ، بزرگ امجد کی مسجد ۱۱۰۰ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین کی قبر ۱۳۴۰ھ، فرزند علی کا امام باڑہ ۱۲۳۰ھ کنگن کا مقبرہ، کٹرہ مال سلامی میں ایک قدیم مسجد، پولیس چوکی کے پاس ایک مندر، باغ جعفر خاں، قدم رسول کی مسجد، نادر گنج محمد علی خان کی قبر ۱۱۷۸ھ، نوری حیدر کا مقبرہ بواجی کی باؤلی، سبل پور کا حال، مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت کا مزار (کچی درگاہ)، شاہ آدم صوفی (پکی درگاہ)، اللہ جلالی کی قبر ۱۳۳۷ھ، جٹھلی کی مسجد ۱۳۱۰ھ۔

مجلد حصے کے علاوہ اس سائز پر قصبہ سہسرام کا حال درج ذیل ہے:

قصبہ سہسرام وعالمگیری مسجد، آثار قدیمہ سہسرام وتاراچنڈی مندر، حسین نور کا مقبرہ حسین نور کے مقبرہ کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ، ایک عجیب صفت، عیدگاہ کے کتبے، دائرے جانب والا کتبہ، درربانی کا کتبہ، دکھن جانب والا کتبہ، سرمست خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ، صفدر جنگ کا قلعہ، حمام چندن پہاڑی کے پاس مسجد ۱۰۲۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ مہدی حسین کی قبر ۱۲۰۱ھ، امام باڑے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی بازار میں ایک مسجد ۱۱۰۵ھ، جانی بازار میں امام باڑہ ۱۲۰۰ھ، کرن سرائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ ۱۲۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔

اس کے بعد کاپی سائز پر آٹھ صفحات میں اورنگ آباد کا حال ہے۔

قصبہ اورنگ آباد: عبدالولی خان کی مسجد ۱۱۳۰ھ، موضع سرس شمس الدین خاں کی مسجد ۱۰۷۱ھ، غلام مصطفی کی قبر ۱۲۰۵ھ، نواب غلام حسین کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۲۸۳ھ، قصبہ داؤدی مسماۃ فراست کی قبر ۱۲۶۶ھ۔

دستور سخن: بلخی صاحب اس کتاب کا صرف پہلا صفحہ صاف کر سکے تھے۔ باقی اوراق پریشان کی صورت میں ان کے پوتے سید مظفر بلخی کے پاس محفوظ ہیں، جوان، پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

صاف شدہ حصے کے مندرجات: اردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقا، حروف تہجی کی قسمیں، حروف تازی کی قسمیں اور اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک سرخی اصطلاحات کی ملتی ہے جس میں حذف وترمیم تخفیف، اشباہ ازالے تحریک وتسکن عقب ومنتقل ابواب مترادف مشترک وتوالی، قیاسی وسماعی اور اشتقاق کے معنی لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد، فصاحت، کی سرخی ملتی ہے۔

اس میں تنافر، اتصال، توالی، اضافت، صنف تالیف، مخالفت قیاسی حک واضافہ اور استقاط کا بیان ملتا ہے۔

اس کے بعد تکرار اور حشو کی سرخیاں ملتی ہیں۔

اس کتاب میں حروف تہجی سے لے کر قواعد، فن عروض وغیرہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

☆☆☆

سید علی حیدر نیر

فصیح الدین بلخی کی شخصیت اور علمی خدمات

فصیح الدین بلخی کا نام علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ بہار کے ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ آپ نے پوری زندگی علم وادب کی خدمات کے لیے وقف کردی۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم ادہم بلخی شاہ بلخ سے ملتا ہے۔ یہی بلخی کی وجہ تسمیہ ہے۔ بہار میں بلخی خانوادے جتنے موجود ہیں، ان کا سلسلہ حضرت مولانا شمس الدین بلخی پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے جیّد بزرگ ہیں اور آپ نے مخدوم الملک حضرت مخدوم شاہ شرف الدین کے خالہ زاد بھائی خلیفہ مخدوم احمد چرم پوش سے بیعت حاصل کی۔ مولانا مظفر بلخی اور مولانا معز بلخی آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔ ہندوستان میں تغلق خاندان (کی حکومت) کے زمانے میں اس خاندان کا ورود ہوا۔ یہ خاندان دلّی آیا اور وہاں سے الگ ہوکر بہار شریف آیا اور پھر وہاں سے بہار کے مختلف مقامات مثلاً سملی، فتوحہ اور منیر شریف وغیرہ میں منتشر ہوگیا۔ یہ خاندان تصوف کے ساتھ ساتھ علم وادب کی بھی خدمت انجام دیتا رہا۔ مولانا مظفر بلخی صاحب دیوان شاعر تھے۔ مولانا حسین نوشہ توحید بلخی نے عربی میں ایک رسالہ، حضرات خمس، تصنیف فرمایا۔ مونس القلوب آپ ہی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ آپ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ حضرت مخدوم حسن بلخی اور حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی بلند پایہ صاحب دیوان صوفی شاعر گزرے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس خانوادے سے متعلق بزرگوں نے علم دین اور علم دنیا دونوں کی خدمت انجام دی۔ آج بھی اس خانوادے سے متعلق حضرات علم وادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شاہ تقی بلخی نے اردو میں 'فقہ ہندی' مرتب کی۔ یہ تیرہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد واحد بلخی فن معمار گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولوی حمید الدین بلخی اوج، فارسی کے قابل ذکر شاعر تھے۔

ڈاکٹر غیاث الدین بلخی پدر فصیح الدین بلخی نے علم نجوم اور مصطلحات و انتظامات زمینداری سے متعلق کتابیں مرتب کیں۔ علاوہ ازیں 'طرز معاشرت' بھی مرتب کی جس میں اصول حفظان صحت بہ طور ناول پیش کیے۔ ایک رسالہ 'علاج ہیضہ' بھی مرتب کیا۔ جناب فصیح الدین بلخی کے برادر بزرگ جناب مولوی حفیظ الدین بلخی نے جو ایک ادیب و شاعر بھی تھے، ۱۸۹۸ء میں پٹنہ سے 'تحفۂ بہار' نکالا تھا۔ اس کی مجلس ادارت میں حفیظ الدین بلخی کے علاوہ حکیم فہیم الدین احمد فہیمؔ بھی شریک تھے۔ آپ کے برادر عزیز مولوی عزیز الدین بلخی رازؔ نے تا عمر علم و ادب کی خدمت انجام دی۔ آپ کی تصنیف 'تاریخ شعرائے بہار' بہت معروف ہے۔ آپ کی دوسری گراں قدر اردو تصنیف 'انسان کی پرواز' ہے جس میں فن ہوائی جہاز رانی کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ آپ نے ۵-۱۹۰۴ء میں 'رفتار زمانہ' نام کا ایک ادبی جریدہ بھی جاری کیا تھا۔ آپ کے برادر موصوف مولوی نظام الدین بلخی سے ایک منظوم تخلیق 'قوم کی جوانی' یادگار ہے۔

بلخی خانوادے کی علمی و ادبی کاوشوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس خاندان میں ذی علم حضرات گزرے ہیں، جنھوں نے اپنی نگار شات سے چمنستانِ اردو فارسی کی آبیاری کی اور ہمیشہ ایک علمی ماحول قائم رکھا۔ اسی ماحول میں فصیح الدین بلخی صاحب کے ذہن کی نشو و نما ہوئی۔ موافق ماحول اور ذوقِ سلیم نے مل کر دو آتشہ کا کام کیا۔

فصیح الدین بلخی کا سنہ پیدائش ۱۸۸۵ء ہے۔ آپ نے طویل عمر پائی۔ درد گردہ کے مریض تھے۔ اخیر عمر میں مرض نے شدت اختیار کر لی۔ پٹنہ کے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ اس عالم میں بھی مطالعہ کے شغف کا یہ عالم تھا کہ برابر محدب شیشے سے مطالعہ جاری رکھتے۔ پروفیسر بی۔ کے۔ رائے پٹنہ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالہ کے سلسلے میں جونند کمار کی پھانسی کے متعلق تحقیق کر رہے تھے، انگلینڈ سے اصل کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی منگائی تھی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی۔ بلخی صاحب نے اس حال زار میں بھی اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ مرض کی شدت بڑھتی چلی گئی بالآخر آپ اس سے جاں بر نہ ہو سکے اور اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ سنہ وصال ۱۹۶۲ء مطابق ۱۳۸۰ھ ہے۔ پس ماندگان میں اپنے فرزند ابراہیم بلخی متخلص بہ نادم کو چھوڑا جو جی۔ ال۔ اے۔ کالج ڈالٹن گنج میں صدر شعبۂ اردو

کے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ادب وشعر دونوں سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام 'آغاز سحر' چھپ چکا ہے۔ ادبی مضامین بھی رسالوں میں لکھتے ہیں۔ ہفتہ وار جریدہ 'زمین' کے نائب مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ نادم کے خالہ زاد بھائی رفعت بلخی ایم۔ اے ملٹی پرپز ضلع اسکول ڈالٹن گنج میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ افسانہ نگار ہیں۔ یہ سب فصیح الدین بلخی کا فیض ہے جنھوں نے اسلاف کے علمی وادبی ماحول کو برقرار رکھا اور اس کے لیے موافق ماحول تیار کیا۔

فصیح الدین بلخی نے ادب وشاعری کے ساتھ فن ورزش اور فن شناوری میں بھی مشق بہم پہنچائی تھی۔ فن کشتی پٹنہ کے مشہور ومعروف استاد، سے سیکھی تھی اور فن شناوری کے استاد خان بہادر خاں روہیل کھنڈی تھے۔ دور سابق میں شرفا اور روسا ان تمام فنون سے آگہی ازبس ضروری سمجھتے تھے۔ فصیح الدین صاحب اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ اس لیے آپ نے ان فنون شریفہ میں بھی مشق بہم پہنچائی تھی۔

آپ پہلی جنگ عظیم میں فوج برطانیہ کے ایک موقر عہدے پر مامور ہوکر دمشق، قاہرہ اور فلسطین وغیرہ مقامات سے وابستہ رہے۔ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان جزیرۂ فیجی کی عدالت عالیہ میں مترجم کے فرائض بھی انجام دیے۔ ملٹری اسکول پونہ میں معلم ومترجم بھی رہے۔ اختتام جنگ کے بعد کچھ عرصے کے لیے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں معلم کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس طرح بلخی صاحب نے حضرت سعدی کے اس شعر پر کماحقہ عمل کیا۔

تابدکان وخانہ در گردی   ہرگز خام آدمی نشوی
برو اندر جہان تفرج کن   پیش ازان کہ از جہان بروی

تجربات سے مالا مال ہوکر بلخی صاحب نے وطن مالوف کو مراجعت کی۔ آپ واقعات کا ایک بیش بہا خزینہ اپنے سینے میں دفن رکھتے تھے۔ اسکندریہ، دمشق، فلسطین اور بیت المقدس اور قاہرہ وغیرہ کے واقعات اکثر بیان کرتے۔ آپ کے ملازم پتھرو میاں آپ کے ہمراہ تھے۔ قاہرہ گرینڈ ہوٹل کے واقعات بالخصوص بیان کرتے۔ اس طرح بلخی صاحب نے بصارت اور بصیرت دونوں حاصل کی۔ اور اللہ پاک پروردگار کے 'سیروفی الارض' سے کافی استفادہ فرمایا۔ تجربات سے علم راسخ

ہوتا ہے۔آپ نے بصارت سے نہیں بصیرت سے کام لیا۔کائنات کا مطالعہ کیا اور ان مواقع سے حتی الامکان فائدہ اٹھایا۔

آپ کی طبیعت کو شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔اس فن میں آپ کو کسی سے شرف تلمذ حاصل نہ تھا۔غزل کی طرف رجحان زیادہ تھا۔کلام کو محفوظ نہیں کرتے۔اقتضائے طبع کے تحت شاعری کرتے تھے اس لیے تحفظ کا التزام نہیں کیا۔پچاس غزلیں یادداشت سے اپنے فرزند نادم بلخی کو لکھوائیں۔کلام میں پختگی ہے۔آپ اسے ایک طنزیہ نظم بھی یادگار ہے جو ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔یہ نظم مطبوعہ ہے۔بہر صورت شعر گوئی آپ کا اصل میدان نہیں ہے اس کو ضمنی حیثیت حاصل ہے۔

فصیح الدین بلخی کو تاریخ وتحقیق سے اصل دل چسپی تھی۔آپ نے اپنی پوری علمی کاوش اس کے لیے وقف کردی۔آپ سے مندرجہ ذیل تصانیف یادگار ہیں۔

(۱) تاریخ مگدھ : یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) کے تحت ڈاکٹر عبدالحق نے شائع کی۔یہ کتاب اب کم یاب ہے۔اس میں قبل مسیح سے دور جدید تک کے حالات آپ نے قلم بند کئے۔زبان میں سادگی ہے اور انشا میں سلاست۔

(۲) تذکرۂ نسوان ہند: مطبوعہ، اس میں ۴۹۸ خواتین کے تذکرے ہیں جن میں ۲۸۶ شاعرات، ۵۴ مصنفات وذی علم خواتین، ۱۶ کاملات، ۱۰۱ شہیرات اور ۴۱ مقدسات کے تذکرے ہیں۔اس طرح یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں ان خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے شاعری کی۔دوسرے حصہ میں ان خواتین کا ذکر ہے جنھوں نے کسی خاص فن میں کمال حاصل کیا۔تیسرے حصے میں ۱۶ کاملات، چوتھے حصے میں ان خواتین کا ذکر ہے جو مذہبی، سیاسی، اخلاقی، تمدنی یا دیگر اوصاف کی بنا پر ممتاز ہیں۔پانچویں حصے میں ان خواتین کا ذکر ہے جنھیں مذہبی تقدس کی بنا پر امتیاز حاصل ہوا۔

(۳) وہابی تحریک: یہ کتاب WAHABI MOVEMENT IN BIHAR کے نام سے انگریزی میں طبع ہوچکی ہے۔اس میں بہار کی مشہور ومعروف وہابی تحریک کے عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

(۴) ہندو شعرائے بہار: یہ کتاب ان ہندو شعرا سے متعلق ہے جن کا تعلق سرزمین بہار سے ہے۔ یہ کتاب نادم بلخی کے زیر اہتمام طبع ہو رہی ہے۔ علاوہ بریں ایک کتاب شوق نیموی کی شخصیت و شاعری پر اور دوسری کتاب فن عروض پر عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے کہ آپ کو لکھنے پڑھنے سے تا زیست تعلق رہا۔ رسائل و جرائد میں اکثر و بیشتر مضامین شائع ہوتے رہے۔ شاعر، شاہراہ اور معاصر، آج کل وغیرہ کے علاوہ تقریباً تمامی مقامی رسائل و جرائد میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ آپ کے مضامین تاریخی، ادبی اور تحقیقی ہوتے ہیں۔ یہی تین شعبے آپ کی علمی و ادبی کاوشوں کے ضمن میں آپ کے ذوق علمی کے جولان گاہ رہے۔ شعر و شاعری سے تعلق محض ضمنی تھا۔ یہ آپ کا اصل میدان نہ تھا۔

فصیح الدین بلخی صاحب کی شخصیت بے حد جاذب تھی۔ آپ ایثار، خلوص اور صداقت کے پیکر تھے۔ تمام عمر میں شاید ہی آپ نے کسی کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ بزرگوں احترام اور اعزہ پر شفقت، جو ہمارے اسلاف کا خاصہ تھی، بلخی صاحب اس کے نمونہ تھے۔ علاوہ بریں علمی کام کرنے والوں کے ساتھ وہ اتنا خلوص برتتے تھے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ضمن میں بہت وسیع الظرف تھے۔ جو شخص بھی علمی تعاون کا طلب گار ہوتا آپ کے پاس سے محروم واپس نہیں ہوتا۔ حتی الامکان اس کی اعانت فرماتے۔ اپنے پاس اس سلسلہ کی جتنی چیزیں ہوتیں بلا تامل ان سے استفادہ کا موقع دیتے۔ ان کتابوں کے مطالعے میں جہاں اشکال پیدا ہوتے آپ حتی الوسع رفع کرتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ سراپا تعاون تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کو اس میں روحانی حظ حاصل ہوتا تھا اور آپ کے جذبۂ علم پروری کی تسکین ہوتی تھی۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں میر سوزؔ پر اپنے تحقیقی مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں گیا۔ وہاں پہلی بار فصیح الدین بلخی صاحب سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں شعبۂ مخطوطات کے انچارج تھے۔ آپ بے حد شفقت و محبت سے پیش آئے۔ میر سوزؔ کے کلام کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ سے جو اس شعبہ کی ملک ہے، کماحقہٗ استفادے کا موقع دیا۔ علاوہ بریں ایک قدیم انتخاب کلام شعرائے اردو سے بھی مطلع فرمایا جس میں میر سوزؔ

کے کلام کا انتخاب تھا اور مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔ محض چند لمحوں کی ملاقات میں بلخی صاحب کی شخصیت سے میں اس قدر متاثر ہوا جو حد بیان سے باہر ہے۔ آج تک یہ نقوش میرے قلب وذہن میں محفوظ ہیں۔ یہ ضمناً میں نے تذکرہ کردیا۔ اس لیے کہ یہ میرے ذاتی تجربات تھے جن سے بلخی صاحب کی پرخلوص شخصیت اور علم دوستی پر روشنی پڑتی ہے۔

علاوہ بریں جناب محمد ہادی ایم۔ اے اسسٹنٹ لائبریرین پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، بلخی صاحب کے شریک کار رہ چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بلخی صاحب روزانہ چار آنے پیسے چائے کے لیے دے دیا کرتے تھے اور وہ لوگ بلاناغہ بلخی صاحب کی اس سخاوت سے مستفید ہوتے رہے۔ ملازمت کے اخیر ایام تک بلخی صاحب کا یہ فیض تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ بلخی صاحب کس قدر وضعدار آدمی تھے۔ ہادی کا مزید قول ہے کہ بلخی صاحب سگریٹ کے بے حد عادی تھے۔ ان کو چین اسموکر کہہ لیجیے۔ علمی مشاغل میں استغراق کی یہ کیفیت تھی کہ ایشٹرے سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ سگریٹ پیتے جاتے اور کبھی سوختہ حصے کو جھاڑتے نہیں، یہ از خود وقفہ وقفہ سے جھڑتا جاتا۔ آپ ہمیشہ پاشنگ شو سگریٹ پیتے۔ کبھی دوسرے سگریٹ کو اس کے مقابلے میں منھ نہیں لگاتے۔ پاشنگ شو کی ایک کش سے بہت سے علمی نکتے حل کرتے اور ہمیشہ مطالعے میں مستغرق رہتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فی زمانہ فصیح الدین بلخی صاحب کی شخصیت مغتنمات سے تھی۔ جیسا کہ قبل واضح کیا جاچکا ہے آپ کو مطالعے سے بے حد شغف تھا۔ ادب تاریخ، تحقیق اور تفسیر، مذاق کے لیے خال شعر گوئی سے آپ کی طبیعت کی مناسبت تھی۔ آپ کا قلم ہمیشہ متوازن رہا۔ مرنجاں مرنج قسم کے بے ضرر انسان تھے۔ کسی کے ساتھ بھی علمی تعاون میں کافی فیاض تھے۔ تاحین حیات آپ نے اپنی وضعداری نباہ دی اور اپنے اسلاف کے شایان شان اپنے گھر کا ماحول بھی علمی وادبی بنایا۔ اخلاف میں علم وادب کا ذوق پیدا کیا:

ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

☆☆☆

فصیح الدین بلخی صاحب مرحوم کی چار تصانیف

(۱) تاریخ مگدھ

'یعنی صوبہ' بہار کی مکمل تاریخ جس میں ۶۴۲ سنہ ق م سے ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) تک تمام تاریخی واقعات وحالات مستند کتب تواریخ سے اخذ کر کے مسلسل اور مکمل طور پر اصل ماخذ کے حوالوں کے ساتھ تفصیل وار درج کئے گئے ہیں'

یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

باب اول : ابتدائی حالات اور ۶۴۲ ق م سے نند خاندان کی حکومت ۳۱۹ ق م تک

باب دوم : موریا خاندان کی حکومت ۳۲۲ ق م سے ۱۸۶ ق م تک۔

باب سوم : سونگا اور کانوا خاندان کے زمانہ سے اندھرا کی حکومت کے بعد ۳۰۰ء تک

باب چہارم : گپتا خاندان کی حکومت ۲۷۱ء تا ۳۱۹ء

باب پنجم : بت شکن برہمن راجا ساسانیکا کے حملے کے بعد سے ۷۳۰ء تک کے مختلف واقعات

باب ششم : پال خاندان کی حکومت ۷۳۰ء تا ۱۱۹۷ء

باب ہفتم : اقطاع بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز

باب ہشتم : بہار و بنگالے میں خاندان بلبن کی حکومت

باب نہم : اقطاع بہار و بنگالے میں طائف الملوکی اور آزادانہ حکومت کا آغاز

باب دہم : صوبۂ بہار میں سلاطین شرقیہ کی حکومت

باب یازدہم: بہار میں پٹھانوں کی حکومت

باب دوازدہم: بہار میں شہنشاہ اکبر کی حکومت ۱۵۷۴ تا ۱۶۰۵ء

باب سیزدہم :   جہانگیر بادشاہ کا دور ۱۶۰۵ تا ۱۶۲۵ء

باب چہاردہم: شاہجہاں کا دور ۱۶۲۷ تا ۱۶۵۷ء

باب پانزدہم: اورنگ زیب کا عہد ۱۶۶۰ تا ۱۷۰۶ء

باب شانزدہم: سلاطین مغلیہ کے ورثا کا دور ۱۷۰۷ تا ۱۷۳۰ء

باب ہفت دہم: بہار کا بنگالے میں شامل ہونا اور صوبیداروں کی منصوبے بازی۔ شجاع الدین محمد خاں اسد جنگ ۱۷۳۱ تا ۱۷۳۹ء

باب ہیزدہم :   حکومت میں انگریزوں کا دخل ورسوخ ۱۷۵۸ء

باب نوزدہم :   انگریزی حکومت بہ حیثیت شاہی دیوان ۱۷۶۵ تا ۱۷۵۷ء

باب بستم :   سلطنت برطانیہ کی براہ راست حکومت ۱۷۶۵ تا ۱۸۵۷ء

اس باب میں تبدیل وزارت ۱۹۳۳-۱۹۳۶ء کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی ۱۹۴۲ء کی تحریکات اور ۱۹۴۳ء کے کچھ حالات بھی درج کئے گئے ہیں۔

''تاریخ مگدھ'' بارہ سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ خاتمۂ کتاب میں مولف مرحوم فرماتے ہیں:

> الحمد للہ کہ اس کتاب میں ۶۴۲ قبل مسیح سے ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۶۲ھ تک مگدھ، پاٹلی پتر، بہار و عظیم آباد پٹنہ کے سلسلے وار تاریخی حالات اتمام کو پہنچے اور راقم کی بارہ برس کی محنت ٹھکانے لگی۔

'تاریخ مگدھ' صوبۂ بہار کی پہلی مستند تاریخ ہے جس میں دلائل و براہین سے انگریز مورخوں کی بے شمار غلط بیانیوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی بہت سے ایسے اہم واقعات پیش کئے گئے ہیں جو اب تک مورخین کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔

اس کتاب کے معیار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبۂ بہار کے سابق گورنر شری آر۔آر۔ دیواکر کی تالیف BIHAR THROUGH THE AGES کا ایک اہم ماخذ یہ کتاب بھی ہے۔

اس کتاب کی زبان بہت ہی صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ انداز بیان مورخانہ اور ناقدانہ ہے۔ نمونے کے طور پر قلعۂ پٹنہ کی تعمیر کے متعلق بلخی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

تاریخ داودی میں مذکور ہے کہ شیر شاہ نے بنگالے سے واپس آکر پٹنہ میں گنگا کے کنارے قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ معماروں اور خشت سازوں نے پانچ لاکھ روپے اس کے خرچ کا تخمینہ کیا۔ شیر شاہ نے بعض معتمدوں کی نگرانی میں کام شروع کرایا اور کچھ عرصے میں مستحکم قلعہ تیار ہو گیا۔

کرنل ویڈل نے لکھا ہے کہ غالباً یہ قلعہ پاٹلی پتر کی اینٹوں سے تیار ہوا اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ تاریخ شیر شاہی کے مطابق یہ قلعہ دو میل لمبا تھا اور اتنے بڑے قلعے کے لیے پانچ لاکھ روپے صرف مزدوری کو کافی ہو سکتے ہیں (بحوالہ ڈسکوری آف دی اگزاکٹ سائٹ آف پاٹلی پترا مصنفہ کرنل ویڈل ۱۸۷۲ء):

راقم کے خیال میں یہ قیاس صحیح نہیں ہے اس لیے کہ پاٹلی پتر کے کھنڈروں میں جو اینٹیں پائی جاتی ہیں وہ اس قلعے کی اینٹوں سے بالکل مختلف ہیں اور پاٹلی پتر کے خوشنما ترشے ہوئے پتھروں کا بھی کوئی وجود اس قلعے کے کسی حصے میں نہیں پایا گیا۔ برخلاف اس کے قلعے کا وہ پشتہ جو گنگا کے دھارے سے ٹکراتا رہتا ہے اور جس کو بشپ ہبر نے غلطی سے پہاڑی ٹیلہ سمجھا تھا اس کی تعمیر ہو بہو اس طور کی ہے جیسی راجگیر میں بن گنگا نامی نالے کے قریب قدیم ترین قلعے کی فصیل ہے۔ غالباً یہ حصہ راجا اجات سترو کے بنائے ہوئے قلعے کی یادگار رہ گیا ہے جس کی کیفیت اس راجا کے حالات میں بھی مذکور ہو چکی ہے۔ چینی جاتری یوانگ چوانگ کی تحریر سے بھی پایا جاتا ہے کہ ۱۶۳۸ء کے قریب گنگا کے کنارے جو شہر آباد تھا وہ فصیلوں سے محیط تھا۔ اس سے بھی قرین قیاس ہے کہ شیر شاہ نے کوئی نیا قلعہ نہیں بنوایا بلکہ پرانے

قلعے کو مجدداً درست کرایا اور اس کے لیے اس زمانے میں پانچ لاکھ کی

راقم کافی ہوگی۔

کتاب ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوئی تھی اور اب نایاب ہے۔(۱)

(۲) تذکرہ نسوان ہند

جس میں قدیم زمانہ سے دور حاضر تک ملک ہند کی نامور خواتین یعنی
پانچ سو شاعرات، مصنفات، کاملات، شہیرات اور مقدسات کے
حالات مستند تواریخ و تذکرہ سے اخذ کر کے تحقیقات کے ساتھ درج
کئے گئے ہیں۔

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی ۲۸۶ شاعرات کا ذکر ہے۔ حصۂ دوم میں ۵۴ مصنفات اور ذی علم خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ حصہ سوئم میں مختلف فنون کی ۱۶ کاملات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حصۂ چہارم میں ۱۰۱ شہیرات کے حالات بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے سیاسی، تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے یا کسی ذاتی وصف کے سبب ملک گیر شہرت حاصل کی اور حصۂ پنجم میں مختلف مذاہب کی ۴۱ مقدس خواتین کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۲۵ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

اب سے کوئی پچیس سال قبل راقم کو مشاہیر کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کا
خیال ہوا جس کا ذکر راقم نے 'تاریخ مگدھ' کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔
اسی زمانہ سے راقم نے متفرق طور پر مشاہیر کے حالات قلم بند کرنا
شروع کیا تھا۔ حال میں بعض عزیزوں کے اصرار سے تمام اوراق
پریشان کا جائزہ لیا تو ظاہر ہوا کہ قدیم زمانہ سے دور حاضر تک تقریباً
ایک ہزار اشخاص کے حالات جمع ہوگئے ہیں جن میں پانچ سو خواتین
کے حالات ہیں۔

چنانچہ ان پانچ سو خواتین کے حالات کو ایک علاحدہ کتاب کی شکل میں ترتیب دے

کر 'تذکرۂ نسوان ہند' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔

'تذکرہ نسوان ہند' اردو زبان میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد تذکرہ ہے جس میں بلاامتیاز مذہب وملت ہندوستان کی تمام مایۂ ناز اور ذی وقار خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ مولف نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ ''کسی ملک کے باشندوں کی علمی' ادبی، فنی، سیاسی، تمدنی اوراخلاقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے مردوں کے علاوہ عورتوں کے حالات کی واقفیت بھی ضروری ہے۔'' اور غالباً مصنف کے پیش نظر یہی مقصد تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اپنے ملک کی قابل فخر خواتین کے کارناموں اور حالات سے یکسر ناآشنا تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب مس میونے بدنام زمانہ کتاب 'مدرانڈیا' لکھ کر ہندوستان کی خواتین کو دنیا کی نظروں میں ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی تو ہم کوئی مناسب اور باوزن جواب نہیں دے سکے۔ یہ صحیح ہے کہ لالہ لاجپت رائے نے اس کے جواب میں ایک کتاب 'فادرانڈیا' کے نام سے لکھی تھی لیکن وہ جواب علمی اور سنجیدہ نہ تھا' تذکرۂ نسوان ہند' نے اس کمی کو پورا کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تذکرۂ نسوان ہند' 'مدرانڈیا' کا نہایت ہی مناسب اوروزن دار جواب ہے۔

صاحب تذکرۂ نسوان ہند' کے غیر معمولی ذوق تجسس وتحقیق اور روشن خیالی کی داد دینا پڑتی ہے کہ جہاں انھوں نے ملک کی مشہور شاعرات، مصنفات اور مقدسات کا ذکر کیا ہے وہاں باکمال رقاصاوں اور فلمی فنکار عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تذکرہ نسوان ہند' ایک مستند تذکرہ ہے اور اس کی ترتیب میں اردو فارسی کی ۳۵ مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے لیکن ایسی بات نہیں کہ یہ ہرقسم کی خامی سے پاک ہے یا اس میں مزید ترمیم واضافہ کی گنجایش نہیں۔ خود مصنف کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اس میں مزید اضافہ کی گنجایش ہے۔

''راقم کو اس کا احساس ہے کہ اس تذکرے میں مزید اضافہ کی گنجایش ہے۔''

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس موضوع پر آیندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب شمع ہدایت کا کام دے گی۔

اس کتاب کی زبان بہت ہی شگفتہ اور رواں ہے۔ مرحوم انداز بیان میں سادگی،

سلاست اور شگفتگی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک نمونہ درج ذیل ہے۔' ہندی کی مشہور مصنفہ مہادیوی ورما کے متعلق لکھتے ہیں:

ہندی ادب وشاعری میں دور حاضر کی بہترین مصنفہ اور شاعرہ مانی جاتی ہیں۔ سمبت ۱۹۶۴ء (۱۹۰۹ء) میں فرخ آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد گوبند پرشاد ورما بھاگل پور میں ٹی۔ ان۔ جے کالجیٹ کے ہڈماسٹر تھے اور ان کی والدہ ہیم رانی دیوی ایک ذی علم اور خداشناس عورت تھیں جو شعروشاعری کا بھی مذاق رکھتی تھیں۔ مہادیوی ورما نے چھٹے کلاس تک اندور میں تعلیم پائی اور گھر میں اپنی ماں سے تلسی داس، سورداس اور میرابائی کی تصنیفیں پڑھیں اور گھر ہی میں موسیقی اور تصویر کشی سیکھی۔ ۱۹۱۷ء میں ان کی شادی ڈاکٹر سروپ نراین ورما سے ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے پریاگ مڈل اسکول کا امتحان اور ۱۹۲۵ء میں انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور سارے صوبہ میں اول آئیں۔ پھر دو برس انٹرمیڈیٹ اور چار برس بعد بی۔ اے کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی اور بعد میں سنسکرت میں ایم۔ اے کی ڈگری پائی اور پریاگ مہیلا ودیا پیٹھ کی پرنسپل مقرر ہوگئیں۔ ان کی تصانیف میں نیرجا، نہار، رشم ریکھا،ساندھ گیت، دیپ شکھا اور یاما نظم میں اور اتیت کے چل چتر، اسمرتی کی ریکھائیں، شرنکھلا کی کڑیاں، نثر میں مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بنگال کے قحط وغیرہ پر بھی رسالے لکھے تھے جن کی قیمت کو قحط زدوں کیا مداد کے لیے وقف کردیا تھا۔ ان کو کتاب نیرجا پر پانچ سو روپے اور یاما نامی کتاب پر منگلا پرشاد فنڈ سے بارہ سو روپے بطور انعام حاصل ہوئے تھے۔ ہندی ادب سے واقفیت رکھنے والے کہتے ہیں کہ میرابائی کے بعد سے اس وقت تک کوئی دوسری عورت ان کی مدمقابل نظر نہیں آتی۔

(۳) انشاد شاد

یہ ۲۴ صفحات کا ایک مختصر سارسالہ ہے جس میں بقول مصنف 'شاد عظیم آبادی کے کلام پر اصولی تنقید اور حقیقی تبصرہ، پیش کیا گیا ہے اور 'شاد کے چیدہ' اشعار کو زبان وفن کے معیار سے جانچ کر کلام کی حقیقت کھول دی گئی ہے۔'

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاد ایک ممتاز اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری کی دھوم پورے ملک میں مچی ہوئی تھی۔ خود بلخی صاحب مرحوم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں:

> خان بہادر سید علی محمد شاد مرحوم نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ تمام ہندوستان کے شعرا میں شہرت رکھتے تھے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں کہ زبان و بیان کی بے شمار خامیاں کلام شاد میں بکھری پڑی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاد کی زندگی میں ان کے نکتہ چینوں نے ان خامیوں کو خوب خوب نمایاں کیا اور شاد کی ان ہی کمزوریوں کا سہارا لے کر ان کے رتبۂ بلند کو فروتر ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ چوں کہ 'انشاد شاد' میں بھی کلام شاد کے عیوب ونقایص کی نشان دہی کی گئی ہے اس لیے شاد کے انتقال کے بعد جب یہ رسالہ شایع ہوا تو لوگوں نے شاد کے مخالفین کی فہرست میں ایک نام محترمی فصیح الدین بلخی صاحب مرحوم کا بھی درج کر لیا حالانکہ اس کو صداقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مرحوم کو شاد عظیم آبادی سے کسی قسم کی کد نہیں تھی اور نہ ہی رسالہ 'انشاد شاد' معاندانہ' جذبے کے تحت لکھا گیا ہے۔ بلخی صاحب مرحوم خود فرماتے ہیں:

> یہاں شاد کے کلام پر حقیقی تنقید وتبصرہ منظور ہے۔ میں نہ ان کا حریف نہ حامی، نہ مخالف اور نہ ان کے ذاتی حالات سے کوئی بحث وسروکار رکھتا ہوں۔

کفر است درشریعت ماکینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

اس تحریر سے کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے ابنائے وطن کو زبان کی صحت و فصاحت کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے لکھا ہے۔ شاد اب زندہ نہیں اور حقیقتاً ان کے کلام سے کوئی بحث نہ تھی لیکن غلط زبان کو میر انیس کی زبان کہہ کر تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے۔(۱) اور مشہور و معروف اہل زبان اور اساتذۂ فن کے کلام کے مقابلے میں شاد کا کلام پیش کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی شاد کو نہیں پہنچتا۔ ایسی حالت میں شاد کے کلام پر اصولی تنقید و حقیقی تبصرہ ایک ادبی فرض معلوم ہوا۔

اور اسی ادبی فرض کو پورا کرنے کے لیے مرحوم نے یہ رسالہ سپرد قلم کیا۔ اس رسالہ کی تصنیف کے وقت مرحوم کے پیش نظر، کلام شاد، مطبوعہ ۱۹۲۴ء اور 'میخانۂ الہام' مطبوعہ ۱۹۳۸ء اور وہ اشعار تھے، جو شاد کی رحلت کے بعد ان کے ایک شاد گرد نے رسالہ 'ندیم' گیا میں شایع کرائے تھے۔

'کلام شادؔ' جناب شاد کا اولین مجموعۂ کلام ہے جس کی طباعت و اشاعت شاد کی زندگی میں ہوئی تھی۔ اس پر رسالہ الناظر (اگست ۱۹۲۴ء) کا تبصرہ موجود تھا۔ چنانچہ بلخی صاحب نے 'انشاد شادؔ' کے ابتدائی اوراق میں اسی گراں قدر تبصرہ کو بعینہ اس اعتراف کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

چوں کہ اس دیوان پر ایک اہل زبان کی تنقید موجود ہے اس لیے فی الحال نئی تنقید لکھنا فضول سمجھ کر سابق تنقید کے اعادہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس کے بعد حسب ذیل عنوانات کے تحت شاد کے اشعار پیش کر کے ان کے نقایص کی وضاحت کی گئی ہے۔

عامیانہ مذاق اور سوقیانہ انداز بیان، زبان اور محاورات کی غلطیاں' تناقض، شتر گربہ، سرقہ حشو و زواید، ردیف کا چسپاں ہونا، زبان اور فن

سے نا آشنا ہونا، سرقہ کلام، عروج کے عوض ہبوط، اصلاح واترمیم اور شاد کا اختراع وتصرف وغیرہ۔

ان عنوانات کے تحت جو اشعار پیش کئے گئے ہیں، وہ واقعی شاد کے منتخب اشعار کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں زبان وفن کی خامیاں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عام نگاہوں سے یہ نقایص پوشیدہ رہتے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم کی ژرف نگاہی اور نکتہ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی باریک بیں نگاہ سے یہ عیوب پوشیدہ نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جو مرحوم کی بے پناہ ناقدانہ صلاحیت کی شہادت دیتے ہیں۔

(۱) شادؔ کا مشہور شعر ہے:

ترے فراق کے صدمے جو بڑھنے لگتے ہیں
نئے خیال نئے دھیان گڑھنے لگتے ہیں

اس شعر کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ دور جدید کے صف اول کے شاعر فیض نے اس شعر کا سرقہ کیا ہے:

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

تبصرہ: 'بڑھنے' کا قافیہ 'گڑھنے' غیر فصیح ہے۔ اہل زبان گھڑنا بولتے ہیں اس کا قافیہ 'لڑنا' اور 'پڑنا' وغیرہ آتا ہے۔ علاوہ اس بات کے گھڑنا بولتے ہیں۔ خیال اور دھیان گھڑنا مہمل اور خلاف محاورہ ہے

(۲) شعر: مرغان قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تبصرہ: 'ایسے میں' اور 'ابھی' - دونوں فرمایا ہے ان میں سے ایک حشو ہے۔

(۳) شعر: آنکھوں سے سوجھنا بھی گیا انتظار میں
شیشے خراب ہوگئے اس دور بین کے

تبصرہ: آنکھوں سے سوجھنا بھی گیا، کہنے سے بھدا پن ظاہر ہوتا ہے۔ کسی مشاق شاعر نے مصرعۂ اول کو سن کر یوں اصلاح دی ہے:

پتھرا گئی ہیں آنکھیں مری انتظار میں
شیشے خراب ہوگئے اس دوربین کے

(۴) شعر: رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اسی کا ہے
پلائے جس کو خود پیر مغاں پینا اسی کا ہے

بصرہ: مطلع کے دونوں مصرعے دولخت ہیں۔ ان میں جو ربط ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔

(۵) سرقہ کی مثالیں:

(الف) اپنی ہستی کو غم و رنج و مصیبت سمجھو موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو
(شادؔ)

اتنی سی زیست پہ اللہ مصیبت یہ ہے موت کی قید لگا دی ہے غنیمت یہ ہے
(میر تقی میرؔ)

(ب) غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا
(شاد)

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے زمین سخت ہے آسمان دور ہے
(مثنوی شوق)

تبصرہ: مضمون اڑا لینے پر بھی شعر مہمل کہا۔ فلک تو دور ہے اس کے لیے 'ہو جانا' کیا؟

(ج) جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا
(شاد)

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا پیٹھ پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا
(نور الحق تپاں)

(۶) شاد کا شعرہ بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں
چھینک آیا میں کہاں کس کو دیا

شاد کی اصلاح　　　　دل کی پروا تک نہیں اے بے خودی
کیا کیا، پھینکا کہاں، کس کو دیا

شاد کے شاگرد ولی کاکوی کی ترتیب:

بے خودی دل کا پتہ شب سے نہیں
کیا کیا، پھینکا کہاں، کس کو دیا

تبصرہ: ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرعۂ اول میں 'شب سے' کہنے کی کوئی حاجت نہیں۔ یہ ٹکڑا وزن پورا کرنے کے لیے ٹھونس دیا گیا ہے اور اصلاح شدہ مصرعہ آخر میں چھبل کا ف کے قاعدے سے چھ کاف کا التزام ہے جس سے تلفظ میں گرانی پیدا ہوگئی ہے۔ شاد کو مضمون کی جھلک نظر آئی لیکن طبیعت رو بہ راہ نہ تھی اور زبان پر قدرت نہ تھی، زبان الجھ رہ گئی۔ دیکھیے اسی قسم کے مضمون کو کہنے والا کس صفائی سے نظم کرتا ہے:

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا　　میرؔ
کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے　　معلوم نہیں کدھر گئے ہم　　دردؔ
کچھ یاد بھی ہے کہاں ہوا گم　　کس سے پوچھیں سراغ دل کا　　عشق عظیم آبادی

ان مثالوں سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کا تعلق اردو تنقید کے قدیم دبستان سے تھا۔ دراصل مرحوم کے عہد میں شاعری میں زبان و بیان کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مرحوم جدید تنقید سے مطمئن نہیں تھے اور کلاسیکی تنقید کے مداح اور پیرو تھے۔

بہر کیف! یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ شاد کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھنے اور کلام شاد کے محاسن و معائب کا عرفان حاصل کرنے کے لیے 'انشاد شاد' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(۴) صوبۂ بہار میں وہابی تحریک

محترمی فصیح الدین بلخی صاحب مرحوم کی گراں قدر تصنیفات میں 'صوبۂ بہار میں وہابی تحریک' کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں تمام مستند ماخذ سے مدد

لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مرحوم نے تمام اصل دستاویزوں کی چھان بین کی اور ان کی مدد سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے اس گم شدہ باب کو نہایت دلآویز پیرایہ میں بیان کیا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں سید احمد بریلوی کی جماعت نے ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس جماعت نے باضابطہ طور پر انگریزوں اور ان کے حامیوں سے زبردست جنگ کی تھی اور ساتھ ہی صوبۂ سرحد میں ایک متوازی حکومت بھی قائم کر رکھی تھی۔ جس خلوص اور جوش سے یہ جماعت اپنے ملک سے غیر ملکیوں کو نکالنے کے لیے کوشاں تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے بہت قبل انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹ جاتا لیکن افسوس کہ اپنوں کی غداری اور انگریزوں کی عیاری و مکاری سے یہ جماعت پسپا ہوگئی۔ لیکن مٹ کر بھی اپنا امٹ نقش چھوڑ گئی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد جب تحریک آزادی کا جائزہ لیا جانے لگا تو لوگوں نے اس جماعت کے کارہائے نمایاں کو نظر انداز کرنا چاہا۔ اس موقع پر ملک کے کچھ باشعور اور انصاف پسند مورخین نے اس جماعت کے کارناموں سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہرؔ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کاوشیں قابل داد تحسین ہیں۔ لیکن ان حضرات نے اس جماعت کے چند اکابرین اور ان کی سرگرمیوں پر سیر حاصل روشنی نہیں ڈالی تھی۔ اس جماعت کا ایک اہم مرکز عظیم آباد تھا اور اس قدیم شہر کے محلہ صادق پور کے چند معزز خاندان کے افراد نے اس جماعت کے قیام اور استحکام میں تن من دھن کی بازی لگا دی تھی۔ ان خانوادوں کی سرگذشت کو سب سے پہلے مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی کتاب 'محمد بن عبدالوہاب' میں بیان کیا۔ لیکن ان کی کتاب کو سند کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ انھیں اصل دستاویزیں ستیاب نہیں ہوسکی تھیں۔ بلخی صاحب مرحوم کا یہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ لیکن افسوس کہ اب تک ان کی یہ گراں قدر تصنیف محتاج طباعت واشاعت مسودہ کی شکل میں پڑی ہوئی ہے۔'

بلخی صاحب مرحوم ایک کشادہ دل اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ مزاجاً نہایت خلیق اور نیک واقع ہوئے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران بے شمار اشخاص نے ان سے فائدہ

اٹھایا... اس غیر مطبوعہ کتاب سے اب تک صوبۂ بہار کے کئی اہل علم استفادہ کر چکے ہیں۔

بلخی صاحب نے اس کتاب کے آغاز میں تحریر فرمایا ہے:

> ہندوستان کی جنگ آزادی کا کوئی بھی تذکرہ 'نام نہاد' وہابی تحریک (وہابی کے معنی ہیں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو۔ یہ اصطلاح انگریزوں نے عبدالوہاب نجدی کے پیروؤں کے لیے سیاسی پروپگنڈے کی غرض سے وضع کی تھی۔ نجد کے وہابیوں نے عرب میں ترکی حکمرانوں سے مقابلہ کیا تھا اور شمالی افریقا میں برطانوی اثر واقتدار سے ٹکر لی تھی۔ برٹش نے آخر کار ۱۸۹۸ء میں اس فرقے کے آخری رہنما مہدی کی قبر کو جو سوڈان میں ہے' پسپا کر کے انتقام لیا) کا ذکر کئے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جس کا عظیم آباد ۴۶ برسوں تک (۱۸۲۲-۱۸۶۸ء) ایک مستقل مرکز رہا ہے اور جس کی باگ ڈور شہر کے خوش حال مسلم خانوادوں کے افراد کے ہاتھوں میں تھی جو اپنی علمیت' خدا ترسی اور تقدس کے لیے مشہور تھے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ صوبۂ بہار میں وہابی تحریک، کی داستان اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ بلخی صاحب مرحوم کی یہ گراں مایہ کتاب محرومِ اشاعت رہے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

'پٹنہ کے کتبے'- فصیح الدین بلخی کا کارنامہ

کتبے شبہ قارۂ ہند کی تاریخ کے لیے ایک نہایت اہم ماخذ قرار دیے جا چکے ہیں۔ پورے ہندوستان کی عہد قدیم کی تاریخ محض سنسکرت اور دراویڈی زبانوں کے کتبوں کی مدد سے مرتب کی جا سکی ہے۔ عہد قدیم میں کتبے کتب تاریخ کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے غرض وغایت سے نصب کرائے گئے۔ اس کے پیش نظر ان کی عبارت کتبہ نصب کرانے والے بادشاہ، حاکم، تاجر یا ایسے با اثر شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ لیکن عہد وسطی میں اچھی خاصی تاریخ کی کتابیں لکھی گئیں، اس لیے عربی فارسی کتبوں کا تاریخ کے اہم یا واحد ماخذ ہونے کی وہ حیثیت قائم نہ رہی جو سنسکرت اور دراویڈی زبانوں کے کتبوں کو حاصل تھی۔ عربی فارسی کتبوں کی عبارت مذکورہ کتبوں کے مقابلے میں نہایت مختصر ہوتی ہے تاہم تاریخی مواد بہ کثرت موجود ہونے کے باوجود ان کتبوں سے عہد اسلامی کے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف گوشوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل میں جانا یہاں ضروری نہیں اس لیے کہ اس موضوع پر انگریزی میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور راقم کے ایک اردو مضمون میں بھی اس کا تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔ مجملاً عرض ہے کہ صرف بنگال کے عہد اسلامی کی قبل از عہد مغل تقریباً ساڑھے تین سو سالہ تاریخ کو ہی لے لیجیے۔ کتب تواریخ کی عدم موجودگی میں اکبری عہد کے مورخوں نے بلا استثنا جو غلط بیانیاں اور فاحش غلطیاں کی ہیں، وہ محتاج بیان نہیں۔ سلاطین بنگال کی پوری سیاسی تاریخ ایک بہت بڑی حد تک وہاں کے عربی کتبوں اور سکوں کی مدد سے مرتب کی جا سکی ہے۔ سندھ کی قبل از مغل عہد کی تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔ ان کتبوں میں سیاسی تاریخ کے علاوہ دیگر امور تاریخ پر بھی کافی مواد ملتا ہے جیسا کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں

محکمہ آثار قدیمۂ ہند وغیرہ کی جانب سے شایع شدہ کتبوں سے پتا چلتا ہے۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور دیگر امور کی تاریخ کے لیے ماخذ کی جو تلاش و تحقیق کی اس میں کتبوں کی طرف اچھی خاصی توجہ دی گئی۔ پھر انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے اضلاع کے گزیٹیر مرتب کرنے کی جو مہم شروع ہوئی اس نے بھی کتبوں کی دریافت اور ان کو تاریخ مواد کے طور پر استعمال کرنے کی مہم کو مہمیز کا کام دیا۔ ان ہی دنوں آثار قدیمۂ ہند کی بنیاد پڑنے سے اس کام کو بھی منظم طور پر ہاتھ میں لیا گیا۔ لیکن اس میں مذکورۂ بالا صورت حال کے پیش نظر سنسکرت اور دراویڈی کتبوں کی تلاش و تحقیق کو سبقت حاصل رہی۔ آثار قدیمۂ ہند کی جب بیسویں صدی کی ابتدا میں لارڈ کرزن کے عہد میں تنظیم عمل میں آئی تو عربی فارسی کتبوں کو مذکورۂ بالا زبانوں کے کتبوں کے مجلہ اپیگر افیا انڈیکا کے دوسالہ ضمیمہ میں شایع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے ایک شمارے کے بعد اسے مستقل دوسالہ رسالہ شکل دے کر اس کا نام 'اپیگر افیا انڈو مسلمیکا' رکھا گیا۔ پھر اسی صدی کے پانچویں دہے میں جو دوسری تنظیم عمل میں آئی، اس میں عربی فارسی کتبے مزید توجہ کے مستحق قرار دیے گئے۔ ان سب کوششوں کے نتیجے میں بالخصوص صوبائی گزیٹیروں کی ترتیب کے دوران عربی فارسی داں طبقے میں مقامی کتبوں میں دل چسپی پیدا ہوئی اور کئی مقامات کی تاریخ مع وہاں کے کتبوں، اردو۔ فارسی اور انگریزی میں لکھی گئی۔

بہار کے کسی مقام کے کتبوں کی اس قسم کی کتاب کا راقم کو علم نہیں۔ مرحوم فصیح الدین بلخی صاحب کی کتاب عظیم آباد کے کتبے کو جو ۱۹۵۱ء میں تکمیل کو پہنچی لیکن ۱۹۹۳ء میں 'پٹنہ کے کتبوں' کے نام سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شایع کی ہے، بلاخوف تردید اولیت کا شرف حاصل ہے۔ البتہ اس سے قبل پٹنہ کالج کے پروفیسر سید محمد صاحب اپنے ایک انگریزی مضمون میں پٹنہ شہر کے ۱۱۳ کتبے 'پٹنہ کے قدیم کتبے' کے عنوان سے ۱۹۳۰ء میں شایع کر چکے تھے۔ (دیکھیے جرنل آف دی بہار اینڈ اوڑیسہ ریسرچ سوسائٹی پٹنہ، جلد ۱۶، شمارہ ۴-۳، ۱۹۳۰ء، صفحات ۳۲۷ تا ۴۲۲)

بلخی صاحب نے اپنی کتاب میں اس مضمون کا کئی جگہ حوالہ دیا ہے لیکن پروفیسر ممدوح

کی اس مستحسن کوشش کو پورے شہر کے دور دراز مقامات، گلیوں، کوچوں، محلوں، علاقوں میں واقع اور بکھرے پڑے تقریباً تمام کتبوں پر مشتمل بلخی صاحب کی کتاب کی ہمسری کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

بلخی صاحب کی کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہر کتبہ کے بارے میں ضروری معلومات دینے کا التزام کیا ہے۔ کتبوں کے شہر کی گلی کوچوں میں مقامات، ان کے فاصلے، کتبوں کی حامل عمارتوں کے نام، ان کی تاریخ، ان کی موجودہ حالت وغیرہ کو نظرانداز نہیں کیا ہے نیز مسجد، مقبرے، قبر، عمارت وغیرہ پر کتبہ کی عین جائے وقوع کو بھی بیان کیا ہے۔ کتبوں کے پتھر کی قسم، ان کی لمبائی چوڑائی وغیرہ بھی بالالتزام درج کی ہے تاکہ اگر کتبہ کا پتھر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اس کتاب کی مدد سے اس کی اصل جائے وقوع وغیرہ کا پتا لگایا جاسکے۔ اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم نے کتبوں کی عبارت کو پڑھنے میں اچھی خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ بلخی صاحب کی زندگی میں کئی بار میرا پٹنہ جانا ہوا لیکن ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا اب افسوس ہوتا ہے۔ ان سے میری پہلی اور آخری ملاقات پٹنہ کے مشہور و معروف تاریخ داں، تاریخ کے نامور استاد اور بہار کے بیسیوں کتبوں سے اہل علم کو روشناس کرانے والے میرے کرم فرما پروفیسر سید حسن عسکری صاحب مرحوم نے کرائی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ ملاقات نہایت مختصر تھی۔ اس صحبت کی تفصیلات اب ذہن میں نہیں ہیں۔ البتہ کچھ دنوں کے بعد عسکری صاحب کے توسط سے بلخی صاحب کی کتاب کا مسودہ میں نے حاصل کیا تھا جو کئی ماہ میری تحویل میں رہا اور میں نے ان تمام کتبوں کے متن کی نقل اپنے دفتر کے ریفرنس کارڈز کے لیے کرائی تھی۔ یہ بلخی صاحب کی فراخ دلی کی مثالی ہے۔ ان دنوں آثار قدیمہ ہند کی عربی فارسی کتبوں کی شاخ کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ہوسکے بارہویں صدی کے آخر تک کے ہی کتبوں کے چربے لیے جائیں۔ عسکری صاحب بھی اسی موقف کے قائل تھے۔ اس کے بعد بلخی صاحب سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اب جبکہ 'پٹنہ کے کتبے' کتاب شایع ہوکر سامنے آئی ہے تو پتا چلا کہ وہ ۱۹۶۲ء میں ہی راہی ملک بقا ہوچکے تھے۔

الغرض اگر چہ ان ہی دنوں بلخی صاحب کی گرانقدر خدمات کا تہ دل سے معترف ہوچکا

تھا لیکن مذکورہ بالا موقف کے پیش نظر ان کتبوں کو اپیگرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلمنٹ (اپیگرافیا انڈو مسلمیکا کا نام آزادی کے بعد بدل دیا گیا تھا) میں شایع کرنے کی نوبت نہیں آئی اور بلخی صاحب کی کوششوں کا اعلانیہ طور پر اعتراف کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اپنی اس فروگذاشت کی تلافی کے طور پر مرحوم کی روح پر فتوح کو اپنا خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر کے خوشی ہو رہی ہے۔ اس قضا شدہ فرض کی ادائیگی کے لیے میں 'ادراک' کے مدیر ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب کا ممنون ہوں جن کے اصرار بلیغ سے میں یہ فریضہ ادا کر سکا۔

'پٹنہ کے کتبے' کے بارے میں خیر الکلام قل ودل کے مصداق اپنی رائے سطور بالا میں پیش کر چکا ہوں۔ اگرچہ ان میں مشمولہ کتبے اکثر و بیشتر تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کے ہیں تاہم ان کی بھی اپنی خاص اہمیت ہے۔ میری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد عربی فارسی کتبوں کے آثار قدیمہ کے دفتر کے موقف میں تبدیلی واقع ہوئی ہے چنانچہ گزشتہ دو دہوں سے ان کی جانب سے قدیم کتبوں کے چربوں کے مقابلے میں تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کے کتبوں کے چربوں کی تعداد کتبوں کی سالانہ رپورٹ میں زیادہ نظر آتی ہے۔ ویسے بھی ان آخری زمانہ کے کتبوں کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔ کم از کم مقامی تاریخ کے لیے۔ اور قبل اس کے کہ یہ حوادث زمانہ کا شکار ہو جائیں ان کا ڈکومنٹیشن ضروری ہے۔ اس لحاظ سے بھی 'پٹنہ کے کتبے' مرتب کر کے بلخی صاحب نے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

ان کتبوں کی مختلف النوع اہمیت - سیاسی، تاریخی، معاشرتی، ادبی وغیرہ۔ کا اندازہ تو قارئین خود لگا سکتے ہیں۔ ان میں پٹنہ شہر کی گزشتہ تین چار سو سالہ تاریخ کے اوراق بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کتاب سے گویا پٹنہ شہر کی تاریخ کے کئی گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے ضلع عظیم آباد عرف پٹنہ کے جغرافیائی حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کے اندراجات سے پٹنہ شہر کا پورا نقشا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ گویا یہ کتاب شہروں کی تاریخ میں ایک نمایاں اضافہ ہے جس سے شہر کے محلوں، راستوں، کوچوں، مساجد، مقابر، مدارس، گورستان، تاریخی مقامات، رہائشی مکانات، ہسپتال، کالج وغیرہ اہم جگہوں کے نام آیندہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔

اس سلسلے میں صرف ایک دو کتبوں کا ذکر وں گا۔ ایک کتبہ خانقاہ حضرت شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کے صحن میں ایک قبر کی لوح مزار پر کندہ ہے۔ اس کتبہ سے میسور کے سلطان ٹیپو
شہید کے خاندان کے صحن میں ایک قبر کی لوح مزار پر کندہ ہے۔ اس کتبہ سے میسور کے سلطان
ٹیپو شہید کے خاندان کے ایک شاہزادہ بنام محمد کریم کے بارے میں جن کے وجود تک سے بہت کم تاریخ داں بھی واقف ہوں گے، نئی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ان کا پٹنہ کا قیام یا کم ازکم یہاں وفات پا کر مدفون ہونا بذات خود ایک نئی اطلاع ہے۔ شاہزادہ محمد کریم حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے تھے اور باعزت زندگی بسر کرنے کے بعد انھوں نے ۴۲ سال کی عمر میں بروز پیر ۳ ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ میں وفات پائی۔ وہ امجد شاہ چشتی سے بیعت تھے۔ دس اشعار کے کتبے کے قطعۂ تاریخ میں شاعر نے اپنا تخلص شمشاد دیا ہے (ص ۴۲) - اسی طرح اس کتاب میں پٹنہ کے مشہور خطاط نواب یوسف علی خان اور ان کے شاگرد مرزا لطف علی خان کے نام ملتے ہیں۔ پٹنہ کے اس نامور فرزند (متوفی ۱۳۱۴ھ) کا قطعۂ تاریخ وفات شاؔد عظیم آبادی کے قلم سے ہے اور اس کی کتابت ان کے شاگرد مرزا لطف علی خان نے کی ہے (ص ۷۳)۔

اس کے علاوہ اس کتاب کو پٹنہ شہر کی ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں درج کتبوں کے قطعہ ہائے تاریخ کے کہنے والے متعدد فارسی۔ اردو شعرا کے نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ فارسی شعرا میں خرامی، معنوی، ضیائی، لطف اللہ، معمار اور میر امان اللہ عاصی (گیارہویں صدی ہجری)، نحیف (نہ کہ نجف جیسا کہ کتاب میں صفحہ ۱۰۳ پر مذکور ہے)، معظم، رزاق، تقدیر، باقر، حسین، مفتون، حیرت اور مظہر الحق (بارہویں صدی ہجری)، احمد، فرحت، شفا، فکر، نکہت، زاہد، بشیر، عشقی، عبرتی، یحییٰ، فریاد، شکر، فرقتی، مشتاق، ساکن، طیب اور واعظ (تیرہویں صدی ہجری) اور شاد عظیم آبادی، سنجر، لطیف، علیم، افضلی، شمشاد، فقیر، شہرت، حافظ، احمد وغیرہ (چودھویں صدی ہجری) کے نام ملتے ہیں۔

اردو شعرا میں شاد، عشرتی (سید بادشاہ نواب)، سعید (سید عباس حسین عظیم آبادی)، مطیر (کاظم حسین لکھنوی)، مجید اور منشی شفاعت (چودھویں صدی ہجری) کے نام ملتے ہیں۔ گویا اردو زبان میں کتبہ لکھوانے کا رواج چودھویں صدی ہجری سے پہلے نہیں تھا۔ عربی کا صرف

ایک کتبہ ملتا ہے جسے شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے۔ مندرجہ بالا شعرا میں عبرتی، شاد وغیرہ تو جانے پہچانے ہیں لیکن اکثر وبیشتر گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں کی ادبی اور دیگر پہلوؤں کی اہمیت کا مقدمہ میں جائزہ لیا جانا چاہیے تھا۔

اردو رسائل، جریدوں اور رسالوں کے تبصرے کے کالموں میں اکثر وبیشتر ادبی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ خالص علمی کتابوں کی تصنیف وتالیف کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ کتبہ شناسی یا آثار قدیمہ کے دیگر موضوعات پر کوئی کتاب برسوں میں بڑی مشکل سے شائع ہوتی ہے۔ اس لیے اردو ادب میں ایسے اچھوتے موضوع پر ایسی گرانقدر کتاب شائع کرکے خدابخش لائبریری کے فعال اور قابل ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اردو ادب میں بھی گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ البتہ 'حرفے چند' میں کتاب کا نام 'عظیم آباد کے کتبے' رکھنے کے بجائے 'پٹنہ کے کتبے' رکھنے کی جو توجیہ انھوں نے پیش کی ہے، وہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پورے پیراگراف کا استدلال محل نظر ہے۔ ساتھ ساتھ افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب جس طرح ہمارے سامنے آئی ہے وہ کم ازکم ایک دقت طلب اور باریک بیں، ذی استعداد قاری کے نزدیک اتنی خاطر خواہ نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھی۔ کتابت اور طباعت اگر اعلا نہیں تو بری بھی نہیں ہے۔ لیکن مصنف کی عدم موجودگی میں مسودے پر نظر ثانی یا کاپی اڈیٹنگ کرانا ضروری تھا۔ جیسا کہ سطور آیندہ سے ظاہر ہوگا۔ کتاب کی اشاعت کے وقت خود پٹنہ میں ایک ماہر کتبہ شناس پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب مرحوم موجود تھے۔ انھوں نے صوبۂ بہار کے ۱۲۰۰ھ تک کے عربی کتبوں کو مع عبارت، عکس، تاریخی نوٹ وغیرہ اپنی انگریزی کتاب 'کارپس آف دی عربک پرشین انسکرپشنز آف بہار' مطبوعہ کے۔ پی جائسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ ۱۹۷۴ء میں شائع کیا تھا۔ ان کی مدد سے کتاب زیر تبصرہ کی فروگذاشتوں کو جن کی نشان دہی سطور آیندہ میں کی جائے گی، دور کیا جاسکتا تھا۔ ان فروگذاشتوں میں کچھ تو ایسی ہیں جو لائبریری کے نشریاتی شعبہ کے کارمند حضرات بذات خود یا قیام الدین احمد صاحب کی کتاب سے رجوع کرکے تھوڑی سی زحمت اور توجہ سے درست کرسکتے تھے۔ مثلاً ان کتبوں میں سال بنا یا سنہ وفات، مادۂ تاریخ میں ادا کئے گئے ہیں۔ عام طور پر پتھر پر کتبوں کی عبارت میں مادۂ تاریخ کے نیچے، اوپر یا برابر میں مطلوبہ

سال یا سنہ ہندسوں میں بھی کندہ کیا جاتا ہے۔ اس سے مادۂ تاریخ کا حساب لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی نیز دقت طلب قاری تفنن طبع کے طور پر بھی اس کا حساب لگا کر مادۂ تاریخ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ البتہ بعض کتبوں میں جن کی تعداد کم ہے یہ کلیہ نہیں برتا جاتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ کتبوں کے مادۂ تاریخ کے ساتھ ہندسوں میں بھی سال کے عدد کندہ ہوں تو اس کی نشان دہی اس کو نقل کر کے کر دینا چاہیے۔ بصورت دیگر یعنی مادۂ تاریخ کے ساتھ اعداد کندہ نہ ہوں تو کتبہ کی عبارت نقل کرنے کے ساتھ مادۂ تاریخ کے نیچے یا برابر میں قوسین میں برآمد شدہ سال ہندسوں میں لکھنا چاہیے تا کہ قاری تمیز کر سکے کہ پتھر پر سنہ ہندسوں میں کندہ ہے یا نہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی صورت میں اگر مادۂ تاریخ کی عبارت کو پڑھنے یا اس کی کتابت میں غلطی ہوئی ہو تو سنہ غلط ہوگا اور اس کا قاری کو پتا نہ چل سکے گا۔ لیکن پتھر پر سنہ والے ہندسوں کی موجودگی میں قاری حساب لگا کر پتا لگا سکتا ہے کہ مادۂ تاریخ صحیح ہے یا نہیں۔ صحیح نہ ہونے کی صورت میں اسے کتبہ شناس یا کاتب کی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔ کتبے کا عکس شائع ہوا ہو تو یہ کام آسان ہو جاتا ہے۔

'پٹنہ کے کتبے' میں اس اہم نکتہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عموماً کتبہ شناس' مادۂ تاریخ کے نیچے لکیر ڈال کر اس کی نشان دہی کرتا ہے اور پتھر پر سنہ ہندسوں میں کندہ ہو تو اسے لکیر کے نیچے بالالتزام لکھتا ہے جیسا کہ قیام صاحب کی کتاب' کارپس' میں ہے اور نہ ہو تو سنہ کے اعداد قوسین میں لکھنا چاہیے۔ مطبوعہ کتاب میں اس ضرورت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ کچھ مقامات پر لکیریں دی گئی ہیں اور کچھ پر نہیں۔ جہاں دی گئی ہیں وہاں بھی احتیاط نہیں برتی گئی ہے جس کی وجہ سے قاری کو صحیح مادۂ تاریخ کے تعیین کرنے میں دشواری پیش آتی ہے (دیکھیے صفحات ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۴۳، ۳۶، ۴۴، ۵۲، ۵۵، ۵۹، ۶۲، ۶۶، ۶۸، ۷۶، ۹۵، ۹۶، ۹۹، وغیرہ)۔ پھر تقریباً ہر کتبہ کی عبارت میں سنہ ہندسوں میں دیے گئے ہیں۔ بظاہر مسودہ میں بھی یہی صورت ہوگی۔ یہ کہنا اب مشکل ہے کہ بلخی صاحب نے بھی مندرجہ بالا سطور میں دکھائی گئی لکیر اور ہندسوں میں سنہ والے فرق کو ملحوظ رکھا ہے یا نہیں۔ بہر حال مطبوعہ کتاب کی یہ بہت بڑی فروگذاشت ہے جس کا ازالہ معمولی سی توجہ اور محنت سے ہوسکتا تھا۔

کتاب میں ایسی کئی مثالیں ملیں گی جن میں مطبوعہ عبارتوں کے مادہ ہائے تاریخ سے صحیح سنہ برآمد نہیں ہوتا۔ یہاں چند مثالیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔

(۱) قل لی من دخل کان امنا اور در دولت کشادہ باد مدام (ص ۱۶) ان دونوں تاریخی مادوں پر نہ لکیر ہے نہ ہندسوں میں سال بنا۔ منیر شریف کی چھوٹی درگاہ کے ان کتبوں کا سرخی میں ۱۰۳۲ دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ پہلے مادۂ تاریخ سے ۱۰۶۲ کے اعداد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مصرع موزوں نہیں ہے۔ 'قل' کے بعد 'لی' کا لفظ بے محل ہے۔ ویسے پتھر پر بھی یہ لفظ نہیں ہے (کارپس، پلیٹ ...)۔ 'لی' کے ۴۰ اعداد نکالنے سے صحیح تاریخ ۱۰۲۲ھ حاصل ہوگی۔ دوسری عبارت کے بارے میں مصنف نے صراحت نہیں کی کہ یہ مادۂ تاریخ ہے۔ اس سے ۱۰۲۲ برآمد ہوتا ہے جو سال تعمیر ہے۔

(۲) دائما باد ابنائے عیدگاہ سیف خاں = ۱۰۳۸ (ص ۳۴)

اصل کتبہ میں جیسا کہ 'کارپس' کی پلیٹ سے معلوم ہوتا ہے پہلا لفظ 'دایما' ہے، 'دائما' نہیں۔ دایما سے ہی ۱۰۳۸ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ کتابت یا قرأت کی یہ غلطی مرادالنسا کی مسجد کے کتبہ (ص ۷۰) میں بھی موجود ہے۔

(۳) بقعۂ خیر ہمیں باد آباد (ص ۳۵)۔ یہاں نہ لکیر ہے نہ ہندسوں میں سنہ۔ سرخی میں ۱۰۵۶ دیا ہے۔ اس مادۂ تاریخ سے ۱۱۰۷ حاصل ہوتے ہیں جو بقول قائل قطعہ ایک زیادہ ہے۔ گویا تاریخ ۱۱۰۶ ہے۔ لیکن مصنف نے سال بنائے تاریخ سرخی میں ۱۰۵۶ قرار دیا ہے۔ گویا انھوں نے مادۂ تاریخ سے ۱۰۵۶ برآمد کئے تھے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ خود مصنف نے سہواً یا کاتب نے 'ہمیں' لکھدیا بجائے 'ہمی' کے، جو دستور زبان کے حساب سے صحیح ہے۔ اس طرح ۵۰ عدد زیادہ شمار میں آئے۔ پتھر پر بھی ۱۰۵۶ ہجری کندہ ہے (کارپس' پلیٹ A۴۶)

(۴) ذالک مقام ابراھیم ۱۱۹۰ھ (ص ۳۹)۔ یہاں لکیر ندارد۔ مادۂ تاریخ سے 1191 برآمد ہوتے ہیں۔ اگر چہ فن تاریخ گوئی میں ایک عدد کی کمی بیشی جائز سمجھی گئی ہے لیکن یہاں یہ بات نہیں۔ کاتب نے 'ذلک' کو 'ذالک لکھ دیا جس سے الف کا ایک عدد حساب میں زیادہ ہوا۔ پتھر پر بھی ذالک (کھڑے زبر کے ساتھ) کندہ ہے (دیکھیے کارپس، پلیٹ A ۷۰) یہ کتبہ نہایت

خوش خط نستعلیق اور ثلث میں لکھا ہوا ہے۔
(۵) داد رضوان بہشت آواز طبتم فادخلو (ص ۴۶)۔ یہ نواب منیر الدولہ کے سنہ وفات کا مادۂ تاریخ والا مصرعہ ہے۔ بظاہر اس میں لفظ 'آواز' کے عدد کو تاریخ میں شمار نہیں کرنا چاہیے لیکن شمار کرنے سے ہی ان کی صحیح تاریخ وفات (بقول عسکری صاحب کی تحقیق جو قطعی ہے ۱۱۸۷ھ اور بقول بلخی صاحب ۱۱۸۸ھ جو آواز کے عدد ملانے سے حاصل ہوتے ہیں) حاصل ہوتی ہے۔ بغیر اس کے بقول بلخی صاحب مادۂ تاریخ سے ۱۱۷۳ حاصل ہوتے ہیں' جو صحیح نہیں ہے۔ طبتم فادخلو (کذا) سے ۱۱۷۲ اور آواز کے عدد ملانے سے ۱۱۸۷ حاصل ہوں گے۔ یہاں کتابت کی غلطی سے فادخلوا کا آخری الف چھوٹ گیا ہے (دیکھیے کارپس، پلیٹ A ۶۷)۔ پس آواز کے عدد ملانے سے ۱۱۸۸ دستیاب ہوں گے جو صحیح تاریخ وفات سے ایک سال بعد کی ہے۔ قیام الدین احمد صاحب نے یہاں ایک سال کی کمی بیشی کے جواز کا ذکر کر کے مادۂ تاریخ کو تحقیق شدہ سنہ وفات کے مطابق قرار دیا ہے (دیکھیے کارپس، ص ۳۳۰)
(۶) این خانۂ خداہست زیبجی قائم (ص ۵۵)۔ لکیر کشیدہ لفظ سے صرف ۱۲۶۱ ۲۲ھ عدد برآمد ہوتے ہیں۔ پورے کتبہ کی عبارت (جو قرائن سے مادۂ تاریخ معلوم ہوتی ہے) سے ۱۵۰۵ عدد برآمد ہوتے ہیں۔ غالباً یہ پورے کتبہ کا ایک مصرعہ ہی ہے اور اس سے ماقبل عبارت میں تخرجہ، تعمیہ یا اس قسم کا کوئی اشارہ ہوگا۔ بہر حال مصنف نے کس طرح سنہ ۱۲۶۱ھ نکالا ہے اس کی تصریح ضروری تھی۔
(۷) آہ افسوس ذاکر حسین (ص ۴۷) اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۲ھ برآمد ہوتے ہیں ۱۲۱۲ھ نہ کہ ۱۲۱۲- بادی النظر میں یہاں قرأت یا کتابت کی غلطی ہے اس لیے کہ مصرعہ خارج از وزن ہے۔ حسنین پڑھنے سے مصرعہ موزوں ہو جاتا ہے اور صحیح سنہ بھی برآمد ہوتا ہے۔ یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔
(۸) هذا البیت للہ حقا (ص ۹۳) مصرعہ کی موجودہ صورت میں سکتہ پڑتا ہے اور مطلوبہ سن تاریخ ۱۲۳۹ھ حاصل نہیں ہوتا۔ بظاہر صحیح قرأت 'ہذا بیت اللہ حقا' ہے۔
(۹) حاجی محمد علی خان بدار جنان ۱۱۷۸ھ (ص ۱۰۶)۔ اس مادۂ تاریخ سے ۱۱۸۶ھ حاصل

ہوتا ہے ۱۱۷۸ھ نہیں۔ غالباً کاتب نے 'جای' کی جگہ 'حاجی' لکھ دیا جس سے مادۂ تاریخ میں آٹھ عدد زیادہ ہو گئے۔ پتھر پر بھی 'جای' ہے (کارپس، پلیٹ C67)

اسی کتبہ میں عربی عبارت 'الصانع (کذا=الصانع دایم البقا لایموت ابدا ۱۱۷۸) کے مادۂ تاریخ ہونے کا نہ بلخی صاحب نے نوٹس لیا نہ قیام صاحب نے۔ پتھر پر ۱۱۷۸ اس کے نیچے کندہ ہے۔

ایک اور چیز جو قاری محسوس کرے گا وہ یہ ہے کہ مادۂ تاریخ کے صحیح ہونے کی صورت میں تعمیہ وتخرجہ وغیرہ سے تاریخ کے اعداد برآمد ہونے کی وضاحت کرنے کا التزام نہیں کیا گیا۔ ایسے کئی مقامات ہیں جو تصریح طلب ہیں (مثلاً صفحات ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۴۰، ۵۱، ۵۳، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۶۱، ۶۵، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۸۸، ۹۰، ۹۵، ۱۰۳، ۱۰۸، وغیرہ) ایسے بھی مقامات ہیں جن کا اچھی خاصی استعداد والے قاری کے لیے حل کرنا آسان نہیں۔ مثال کے طور پر شیش محل کی مسجد کے دو کتبے لیجئے (ص ۴۰) ایک کتبہ میں مادۂ تاریخ ''در ابجد مسجد ابراہیم از عنایات کریم آباد باد ۱۱۹۰ھ'' ہے۔ یعنی از روئے ابجد اس کے اعداد شمار کرنے چاہیں۔ اس میں 'عنایات' قرأت یا کتابت کی غلطی ہے۔ 'عنایت' چاہیے (دیکھیے کارپس' پلیٹ B70) دوسرے کتبہ میں تاریخی مادے دو ہیں: (۱)'' در بیانات' (کذا= بینات ہونا چاہیے) ذالک (کذا= ذلک) المسجد کمسجد الحرام ۱۱۹۰ھ' اور (۲) در ابجد و بیانات (کذا) 'مسجد ابراہیم درجہ دار دبکعبہ' ابراہیم ۱۱۹۰ھ' مطلب یہ کہ پہلے مادۂ تاریخ میں از روئے بینات (جو فن تاریخ گوئی کا ابجد کی طرح ایک طریقہ ہے) حساب لگانا چاہیے جب کہ دوسرے میں ابجد اور بینات دونوں سے کام لینا چاہیے۔ بہت کم لوگوں نے بینات کا نام سنا ہوگا۔ بلخی صاحب نے ان مادۂ ہائے تاریخ کے بارے میں نہ کوئی صراحت یا وضاحت کی نہ کچھ اظہار خیال فرمایا۔ یہاں 'بیانات' بلخی صاحب یا کاتب کی غلطی ہے۔ صحیح لفظ 'بینات' ہے۔ پتھر پر بھی اسی طرح کندہ ہے (کارپس' پلیٹ C70)۔ بینات کے طریقہ تاریخ گوئی پر قیام صاحب نے کارپس کے ضمیمہ امیں تفصیل وتشریح سے لکھا ہے (کارپس' صفحات ۳۶۷ تا ۳۷۴)۔ قیام صاحب کا خیال ہے کہ بینات والا طریقہ صرف پٹنہ کے دو کتبوں، ایک مندرجہ بالا اور دوسرا غلام یحییٰ صاحب کی

مسجد کے کتبہ میں استعمال ہوا ہے (کارپس ص ۳۸۲)۔ خود پٹنہ میں ہی تیسرا کتبہ موجود ہے جس میں مادۂ تاریخ سے بینات سے اخراج سال کرنا مقصود ہے۔ اس کا ذکر 'پٹنہ کے کتبے' میں صفحہ ۶۵ پر موجود ہے۔ اس کتبے کی تاریخ زبر و بینہ وصوری ومعنوی کے طریقہ سے نکلتی ہے:

نظم ہو تاریخ آں مرحوم کی اس طور سے

ہوے زبر وبینہ بھی اور صوری معنوی

بلخی صاحب نے شاعر کے اس اشارہ کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور انھوں نے مادۂ تاریخ سے کس طرح مطلوبہ سنہ حاصل ہوتا ہے، اس کی بھی وضاحت نہیں کی۔ بلخی صاحب نے مذکورہ بالا غلام یحییٰ کی مسجد کے کتبہ کی عبارت میں دو الفاظ' در بینات' چھوڑ دیے ہیں (ص ۷۶)۔ اسی طرح دو ایک جگہ انھوں نے کتبوں کی عبارت میں صوری ومعنوی کے طریقہ سے حساب لگانے کے شاعر کے اشارہ کا نوٹس نہیں لیا۔ اس کی تصریح بھی ایک عام قاری کے لیے ضروری تھی۔ ایک ہی مادۂ تاریخ سے صوری اور معنوی طور پر تاریخ نکلنے کے یہ معنی ہیں کہ صوری میں سنہ مطلوب الفاظ میں دیا ہوتا ہے اور معنوی میں انہی الفاظ سے ازروئے ابجد سنہ برآمد ہوتا ہے۔ مولوی نور علی کی قبر کے کتبہ کا مادۂ تاریخ والا شعر یوں ہے:

عقل تاریخ وصالش صوری وہم معنوی

گفت سال یکہزار ودوصد شصت ودوآہ ۱۲۶۲ھ (ص ۶۷)

مادۂ تاریخ سال الخ ہے جس کے نیچے لکیر نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس جگہ الفاظ میں ۱۲۶۲ھ دیا ہے جو صوری حساب سے ہے۔ اسی مادۂ تاریخ سے ابجد سے حساب لگانے سے بھی ۱۲۶۲ حاصل ہونا چاہیے تھا لیکن کاتب نے دوصد اور شصت کے درمیان واوعطف چھوڑ دیا ورنہ ان الفاظ سے سن ۱۲۶۲ھ ہی حاصل ہوتا۔ دوسری مثال فیض النسا بیگم کی قبر کے کتبہ کی ہے (ص ۸۷)۔ کئی جگہ تخرجہ تعمیہ حروف منقوط وغیرہ سے سال برآمد ہونے کے شاعر کے اشارے کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ ان پر اظہار خیال کرنا ضروری تھا (دیکھیے صفحات ۶۵ (منقوط)، ۶۷، ۷۳، ۸۷، ۹۰، ۱۰۳ وغیرہ)۔ کم از کم ایک جگہ شعر میں مصرع اول میں مادۂ تاریخ کی طرف کوئی اشارہ نہ ہونے کے باوجود مصرعہ دوم سے تاریخ نکالی گئی اور ہندسوں میں بھی ۱۲۲۱ھ ہی لکھا

ہے (ص ۵۷)۔ اس کتبہ کی عبارت یہ ہے:

ذاکر وصابر عابد وزاہد شاہ وارث علی ولی خدا
روز دوشنبہ ودویم ذیقعدہ کہ 'فنا رفتہ سوے دار بقا' ۱۲۲۱ھ

اگر پتھر پر سنہ ہندسوں میں بھی کندہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قطعۂ تاریخ کا چوتھا اور پانچواں مصرع مصنف سے یا کاتب سے قلمبند ہونے سے رہ گیا ہے۔ ویسے بھی دوسرے شعر میں 'کز' بے محل ہے۔ 'از' ہونا چاہیے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس کتبہ کا کوئی شعر چھوٹ گیا ہے جس میں مادۂ تاریخ ہوگا اور اس سے شاہ وارث علی کی وفات کا سنہ نکلتا ہوگا۔

کتاب کی اشاعت سے پہلے اگر ان امور کی طرف توجہ دی جاتی تو یقیناً کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا۔ کتاب مزید مفید اور کارآمد ہو جائے اس کے لیے بیدار صاحب (ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ) نے ایک ضروری اشاریہ کا اضافہ کرایا ہے۔ اشاریہ برائے نام ہے۔ فہرست مندرجات کو مساجد، قبریں، مقامات، عمارتیں اور مندر کے ذیل میں گویا ازسرنو ترتیب دی گئی ہے۔ اس سے اشاریہ کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا۔

ایک اور چیز جس کی ایک عام قاری یا متخصص بھی کمی محسوس کرے گا وہ یہ ہے کہ مصنف کے حالات زندگی، ان کی تصانیف کی تفصیلات، کتبہ شناسی میں ان کو دلچسپی کب اور کیسے پیدا ہوئی اور اس کے لیے انھوں نے کیا کیا جدوجہد اور کاوشیں کیں، ان سب سے بخوبی واقف نہیں ہو پاتا۔ نادؔم صاحب نے مقدمہ میں اپنے والد صاحب کے بارے میں جو لکھا ہے اور ان کی تصنیفات کا برسبیل تذکرہ، ذکر کیا ہے وہ تشنہ اور ناکافی ہے۔ ان کا بلخی صاحب مرحوم کے لیے یہ کہنا کہ وہ ایک بڑے محقق، ناقد اور مورخ تھے، اسے محض ایک سعادتمند فرزند کے حسن ظن پر محمول کرنا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ ان کی 'تاریخ مگدھ'، اور دوسری کتابوں کے علاوہ 'پٹنہ کے کتبے'، کا ہر ورق اور ہر سطر بلخی صاحب کے فیلڈ ورک، ان کے وسیع مطالعے، بلیغ تحقیق، ناقدانہ نظر، تاریخ دانی، تاریخ نویسی وغیرہ کی شاہد ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کتبہ نویسی کے ہر اصول کو انھوں نے اپنی کتاب میں پابندی سے برتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کی مستند حیثیت ایک کارنامہ سے کم نہیں۔ ان کے پڑھے ہوئے کتبوں کی عبارتیں، بہت بڑی حد تک صحیح ہیں۔ جہاں

کہیں کچھ الفاظ نہیں پڑھے گئے اس میں کتبوں کے پتھر میں کندہ حروف کی شکستہ حالی کو دخل تھا۔

ایسے شخص کے بارے میں 'پٹنہ کے کتبے' کے عام وخاص قاری کو ان کے مفصل حالات کو جاننے کے لیے جو اشتیاق پیدا ہوگا، وہ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے ان کے سوانحی حالات وغیرہ کا مفصل ذکر مقدمہ میں کرنا چاہیے تھا۔ ان کو پٹنہ کے کتبوں کو جمع کرنے کا شوق کس طرح پیدا ہوا، اس کام میں ان کو کس سے رہنمائی یا مدد ملی، اس نہایت مشقت طلب شوق کو پورا کرنے میں ان کو کتنا وقت لگا اور کیسے پاپڑ بیلنا پڑے وغیرہ امور کو جاننے کے لیے کم از کم راقم سطور کو اشتیاق تھا۔

کتاب کے آخر میں مصنف کی یادداشت کے مطابق انھوں نے اس کتاب کی تالیف سے ۲۰ مئی ۱۹۵۱ء میں فراغت پائی۔ جیسا کہ انھوں نے ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں پروفیسر سید محمد پٹنہ کے قدیم کتبے انگریزی میں شائع کر چکے تھے۔ ٹھیک انھی دنوں یا اس کے کچھ دنوں بعد پروفیسر سید حسن عسکری صاحب مرحوم بھی بہار کی تاریخ پر کام کر رہے تھے اور اس سلسلے میں دیگر ماٰخذ کے ساتھ بہار کے عربی فارسی کتبوں کی تلاش وتحقیق ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی۔ عسکری صاحب کے مرحوم بلخی صاحب سے گہرے تعلقات تھے۔ قیام صاحب کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ عسکری صاحب اور بلخی صاحب بہار کے عربی فارسی کتبوں کی تلاش میں ایک دوسرے کے رفیق تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں دونوں نے مل کر ضلع گیا کے موضع بلسہ میں درگاہ حضرت جمن جتی کے کتبہ کا سراغ وہاں کے ایک شراب کے ٹھیکیدار کی دوکان میں لگایا تھا (کارپس، ص ۱۸۰)۔ اسی طرح عظیم آباد کے کتبے کے مسودہ کی تکمیل کے بعد یا ہوسکتا ہے اس سے کچھ سال قبل سے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں (عربی فارسی مخطوطات) ریسرچ افسر کی حیثیت سے ان کا تقرر غالباً عسکری صاحب کی کوششوں سے ہو چکا تھا۔ اسی دوران ۱۹۵۲ء میں جب وہ اپنے ایک اور رفیق ریسرچ اسسٹنٹ پنڈت وی۔ شاستری کے ساتھ شمالی بہار کے چمپارن ضلع کے سیدی بن میں سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے تب انھوں نے وہاں ایک ایسے فارسی کتبہ کا سراغ لگایا جو عرصہ ہوا گم شدہ خیال کیا گیا تھا۔ ان کو یہ پتھر سیدی بن کے ایک مندر میں ملا جہاں اس کی پرستش بھگوان کے چرن پد (نقش قدم) کے طور پر کی جارہی تھی (کارپس، ص ۳۰)۔

سطور بالا میں قیام صاحب اور ان کی انگریزی کتاب' کارپس آف دی عربک پرشین انسکرپشنز آف بہار، کا بار بار ذکر آیا ہے۔ قیام الدین احمد جو بعد میں ڈاکٹر قیام الدین احمد اور صدر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی ہوئے، پٹنہ شہر کے ایک معزز علمی خاندان کے ہونہار چشم و چراغ، پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور و معروف عربی کے پروفیسر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کے پوتے اور اردو کے صف اول کے ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کے برادر زادہ تھے۔ جب پروفیسر عسکری صاحب مرحوم کے۔ پی جائسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کے ڈائرکٹر تھے تب قیام الدین صاحب کا تقرر وہاں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ہوا۔ عسکری صاحب کی ایما پر انھوں نے بہار کے عربی و فارسی کتبوں کی تلاش اور تحقیق پر کام شروع کیا اور بہار کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے انھوں نے تقریباً دو سو کتبوں کو مع متن، انگریزی ترجمہ، تاریخی حالات اور عکس کتابی صورت میں شائع کیا۔ جسے مذکورہ انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۷۴ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ قیام صاحب نے بلخی صاحب کی کتاب کے غیر مطبوعہ مسودے سے استفادہ کرنے کا اپنی گرانقدر کتاب میں اعتراف کیا ہے بلکہ ایک جگہ انھوں نے نئی سڑک پٹنہ میں واقع میر قطب الدین کے کتبہ کی عبارت جس کا پتھر انھیں نہیں ملا بلخی صاحب کے مسودے سے نقل کی ہے (کارپس، ص ۳۳۸)۔

قیام صاحب کی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ شہر کے کچھ کتبے بلخی صاحب سے نظر انداز ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے مثلاً محلہ خواجہ کلاں میں ایک مقبرے کا حاجی محمد علی شوستری کی وفات (سنہ ۱۱۹۱ھ) کا کتبہ۔ اس نسبتاً طویل عربی کتبہ کی عبارت زیادہ تر نظم میں ہے اور اس کا خط بھی اگرچہ اچھا خاصا دیدہ زیب ہے لیکن عبارت پیچیدہ طور پر لکھی گئی ہے (ص ۱۷۴، پلیٹ ۱۷)۔ اسی طرح محلہ حمام کی شکستہ ریختہ مسجد کا کتبہ جسے مرزا احمد علی خاں نے ۱۱۹۲ھ میں تعمیر کیا تھا (ایضاً کتبہ نمبر ۱۷۶)۔ تیسرا کتبہ قیام صاحب کو شاہ علیم اللہ کے مقبرہ کے پاس قبرستان میں ملا تھا (ایضاً کتبہ نمبر ۱۷۷)۔ کسی بڑی لوح کے ایک ٹکڑے پر کندہ اس خوش خط مختصر عبارت کے آخری لفظ کے دو تین حروف غائب ہیں۔ قیام صاحب نے اسے اس طرح پڑھا ہے: کان عندہ فاضلاً وصا [دقا]۔ وہ اس کتبہ کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکے۔ اس لیے انھیں اس کی عبارت کے عین مفہوم کے بارے میں تردد ہوا۔ نہ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ عبارت مادۂ تاریخ

وفات ہے۔ کم از کم عبارت کے نیچے ہندسوں میں سنہ کندہ ہونے کی صورت میں ان کی توجہ اس طرف منتقل ہوجانا چاہیے تھی ورنہ انھیں خود اندازہ ہوتا کہ انھوں نے آخر لفظ کو 'صادقاً' پڑھا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس مادۂ تاریخ سے ۱۱۹۴ھ برآمد نہیں ہوتا۔ کتبہ کا عکس (کارپس، پلیٹ ۶۵ A) بہ غور دیکھنے سے صحیح مادۂ تاریخ 'کان عبدہ فاضلاً صا [لحا]، پڑھا جائے گا۔ یعنی 'عندہ' کی جگہ 'عبدہ' واو عطف کے بغیر اور 'صادقاً'، کی جگہ 'صالحاً'۔ اور کتبہ کا ترجمہ ہوگا، وہ (اللہ کا) ایک فاضل صالح بندہ تھا۔' اب کتبہ کی عبارت کے معنی صاف ہیں اور اس سے سنہ وفات ۱۱۹۴ھ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مالک قبر کا نام ہوسکتا ہے لوح کے گم شدہ ٹکڑے کے کتبہ میں ہو۔

ایک جگہ (ص ۹۹) بلخی صاحب نے کتبہ کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی عبارت پتا نہیں کیوں نقل نہیں کی۔ اسی طرح ان کو 'باؤلی، لفظ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں سہو ہوا ہے (ص ۱۰۶)۔ یہ لفظ اصل میں واو (= باؤ) کا اسم تصغیر ہے جو سنسکرت زبان کے لفظ 'واپی' کا مخفف ہے اس کے معنی سیڑھی دار مربع بڑے حوض نما کنویں کے ہیں۔ یہ لفظ گجراتی زبان میں آج بھی 'واوڈی' کی صورت میں مستعمل ہے۔

کہیں کہیں قیام صاحب نے کتبہ کو اپنی دریافت بتایا ہے مثلاً شاہ علیم اللہ صاحب کی قبر کا کتبہ (کارپس، ص ۳۱۸)۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کتبہ کا 'پٹنہ کے کتبے'، کے صفحہ ۱۰۱ پر نہ صرف ذکر اور عبارت موجود ہے بلکہ بلخی صاحب نے شاہ علیم اللہ کو سیر المتاخرین کے مصنف سید غلام حسین طباطبائی کا جد اعلا ہونا بھی بیان کیا ہے۔ اسی طرح پیار النسا بنت نور النسا کی قبر کے کتبہ کے بارے میں قیام صاحب کہتے ہیں کہ اسے ان سے پہلے کسی شخص نے نہیں دیکھا تھا (کارپس، ص ۳۵۷)۔ اس کتبہ کا بھی ذکر اور عبارت بلخی صاحب کی کتاب میں موجود ہے (ص ۹۷)۔ بلخی صاحب نے بھی قیام صاحب کی طرح پیار النسا کی ولدیت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ بلخی صاحب نے اس کے مادۂ تاریخ کے نیچے ہندسوں میں ۱۱۹۹ھ دیا ہے جو صحیح ہے لیکن انھوں نے تخرجہ کے حساب سے مادۂ تاریخ سے حاصل شدہ عدد سے ایک عدد کم کرنے کی صراحت نہیں کی۔ اس کے برعکس قیام صاحب نے مادۂ تاریخ کے نیچے ۱۱۹۶ لکھا ہے جبکہ مادۂ تاریخ سے ۱۲۰۰ برآمد ہوتے ہیں جس میں سے 'سرآہ' یعنی الف کا ایک عدد کم

کرنے سے تاریخ ۱۱۹۹ حاصل ہوتی ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ کتبہ کے عکس (کارپس، پلیٹ A ۶۸) سے صاف ظاہر ہے۔ اسی طرح قیام صاحب نے محلہ ڈھولپورہ میں واقع شیر شاہ کی مسجد کے کتبے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی عمارت کے غیر معمولی نقشہ (پلان) کا تو ذکر کیا ہے (کارپس ص ۱۳۰) لیکن وہ اسے مسجد کی اصل عمارت ہی مانتے ہیں۔ اس کے برعکس بلخی صاحب کا خیال ہے کہ یہ عمارت اصل میں اس کے بانی نے اپنے مقبرہ کے لیے بنوائی تھی مگر مدت مدید سے اس سے مسجد کا کام لیا جارہا ہے (پٹنہ کے کتبے، ص ۸۴) مسودے کی یہ عبارت غالباً قیام صاحب کی نظر سے نہیں گذری۔

سطور بالا میں راقم نے مطبوعہ کتاب کی فروگزاشتوں کو اپنی توجہ کی عمداً مگر نیک نیتی سے آماجگاہ بنایا ہے محض اس غرض سے کہ آیندہ جب بھی اس کی طبع جدید عمل میں آئے اور جلد عمل میں آنا چاہیے، وہ اِن فروگزاشتوں سے پاک ہو۔ وما توفیقی الا باللہ۔

فصیح الدین بلخی کے دو تذکرے

(۱) تذکرہ نسوانِ ہند

فصیح الدین بلخی کا تالیف کردہ تذکرہ نسوان ہند غیر منقسم ہندوستان کی ۴۹۶ شاعرات، مصنفات، کاملات، شہیرات اور مقدسات کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان میں ۲۸۶ شاعرات، ۵۴ مصنفات اور ذی علم خواتین، ۱۶ کاملات (جنھوں نے کسی خاص فن میں کمال حاصل کیا) ۱۰۱ شہیرات (جنھوں نے سیاسی، تمدنی اور اخلاقی حیثیت یا کسی ذاتی وصف کے سبب شہرت حاصل کی) اور ۴۱ مقدسات (یعنی وہ خواتین جن کو مذہبی تقدس کے سبب شہرت وعظمت حاصل ہے) کے احوال مذکور ہیں۔ خواتین کے ان پانچ طبقوں کے لحاظ سے کتاب کے پانچ حصے کیے گئے ہیں۔ ہر حصہ کے صفحات بھی الگ الگ ہیں۔

تذکرہ نسوان ہند شمسی پریس پٹنہ سیٹی میں طبع ہوا۔ سال طباعت ۱۹۵۶ء ہے۔ مولف کا مقدمہ ۶ر جولائی ۱۹۵۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ لیکن یہ کتاب دراصل ۲۵ سال قبل مرتب ہو رہی تھی جس کی وضاحت مولف نے اپنے مقدمے کے صفحہ 'ج' پر کر دی ہے۔ کتاب کے سال طباعت اور عرض مولف کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ تذکرہ نسوان ہند کی تالیف کا آغاز ۱۹۳۰ء میں ہی ہو گیا تھا۔

مولف کے دیباچہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاہیر ہندوستان کا ایک تذکرہ مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس مقدمے کے حصول کے لیے انھوں نے مطالعہ وتحقیق بھی کی اور کافی مواد فراہم کر لیے۔ ان کے پاس مشاہیر کی تعداد ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ جن میں پانچ سو

خواتین تھیں۔ یہ خواتین تذکرہ نسوان ہند کے نام سے منظر عام پر آ گئیں مگر مرد مشاہیر کے حالات شاید تلف ہو گئے۔

تذکرہ نسوان ہند کی زبان اردو ہے۔ اس میں صرف شاعرات ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے مختلف طبقوں کی معروف خواتین ہیں۔ ان کی ترتیب یوں ہے۔ (۱) شاعرات (۲) مصنفات (۳) کاملات (۴) شہیرات (۵) مقدسات۔ یہ خواتین بہ اعتبار حروف تہجی پیش نہیں کی گئی ہیں بلکہ انھیں عمر و عہد کے لحاظ سے رقم کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی بزرگی اور خوردی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

تذکرہ نسوان ہند کی تالیف میں مولف کو جن کتابوں سے مدد ملی ہے ان کی ایک فہرست شروع کے اوراق میں دے دی گئی ہے۔

(۲) تذکرہ ہندو شعرائے بہار

تذکرہ ہندو شعرائے بہار فصیح الدین بلخی مرحوم کا دوسرا تذکرہ ہے۔ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں بہار کے صرف ہندو شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد اس تذکرہ میں ۱۲۹ ہے ان کو تین ادوار میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پہلا دور متقدمین کا ہے جس میں ۱۲۰۰ھ تک کے بیس شعرا ہیں۔ دوسرا دور شعرائے متاخرین کا ہے، اس میں ۴۸ شعرا شامل ہیں جن میں سے آخری گیارہ دور حاضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شعرا صرف ریختہ میں فکر سخن نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی موزونی طبع کی جولانگاہ فارسی شاعری بھی تھی۔ دور متقدمین کے شعرا بالخصوص اپنی فارسی شاعری کی وجہ سے ہی اہم ہیں۔

تذکرہ ہندو شعرائے بہار کی تکمیل ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔ اور اس کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔ مولف نے اس جانب اشارہ کر دیا ہے۔

> ...ور دور متاخرین میں وہ شعرا ہیں جنھوں نے ۱۳۰۰ھ سے اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت تک یعنی ۱۳۸۰ھ تک شعر و سخن کا بازار گرم رکھا ہے۔

۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء کے ہے۔ اس تذکرہ کا مقدمہ مولف نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو

فصیح الدین بلخی کی سوانح "دلچسپ کہانی اُن کی" مؤلفہ نادم بلخی کا سرورق

لکھا۔ افسوس ہے کہ یہ تذکرہ مولف کی حیات میں شائع نہ ہوسکا۔ مولف کی موت ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو واقع ہوئی۔ وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند نادم بلخی نے نیشنل بک سنٹر ڈالٹین گنج پلاموسے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں اس تذکرہ کو شائع کیا۔ تذکرہ کی زبان اردو ہے اور ترتیب زمانی۔

اس تذکرہ سے فصیح الدین بلخی کے مطالعہ و چھان بین اور تحقیق و جستجو کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے دور قدیم و متوسط کے ہندو شعرا کے احوال متعدد تذکروں سے فراہم کیے ہیں اور زیادہ سے زیادہ معلومات دینے کی کوشش کی ہے۔ شعرائے متاخرین، جو بلخی مرحوم کے عہد میں باحیات تھے، ان کے احوال و کلام خود انہیں سے حاصل کیے ہیں۔ اس لیے اس تذکرہ کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ فکر رسا اور موزونیٔ طبع کی آزمائش میں بہار کے مسلم شعرا سے ہندو شعرا کبھی پیچھے نہیں رہے۔ اردو کے قدیم تذکرے ان کی شعری خدمات کے اعتراف سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن فصیح الدین بلخی سے قبل کسی تذکرہ نگار نے ان کی جانب پوری توجہ نہیں دی تھی۔ مرحوم کی یہ کوشش گراں قدر اور لائق ستائش ہے۔

یہ تذکرہ دراصل بہار میں اردو شعر و شاعری کی رفتار میں ہندو شعرا کے تعاون کی نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن چند فارسی گو شعرا بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں نند لال گویاؔ، اجاگر چند الفتؔ، مہاراجا رام نرائن موزوںؔ، منشی سب سکھ خاکسترؔ، منشی بلاس رائے رنگینؔ، لالہ رام چند فرحتؔ، لالہ جیون رام تحقیقؔ، راجا پیارے لال الفتیؔ، کنور ہیرا لال ضمیرؔ، منشی ہری ہر ناتھ محنتیؔ، اور گنگا پرشاد بدرؔ کے اسماء خاص طور پر۔ لیے جاسکتے ہیں۔

اس تذکرہ میں ۱۲۹ شعرا ہیں۔ لیکن مولف نے اپنے مقدمے میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ ہندو شعرائے بہار کی تعداد بس اسی قدر نہیں ہے۔ کچھ شعرا کے احوال خاطر خواہ فراہم نہیں ہوئے اور بعض کے نمونہ ہائے کلام ہی نہ مل سکے۔ ان ۱۲۹ شعرا میں بیشتر کے حالات بہت مختصر ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مولف نے ان کے حالات جمع کرنے کی کوشش میں کوتاہی کی۔ فاضل محقق نے اس مختصر تذکرہ کی تالیف میں جتنی محنت صرف کی ہے اور مطالعہ و چھان بین کا جیسا شغف دکھایا ہے، وہ شعرائے ریختہ کے بہت کم تذکرہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ اس کی تالیف میں مولف نے مطبوعہ اور قلمی پچاسوں کتابوں اور گلدستوں کو پڑھ ڈالا ہے۔

مولف نے نند لال گویاؔ، اجاگر چند الفتؔ، مہاراجا رام موزوںؔ، مہاراجا کلیان سنگھ عاشقؔ، لالہ رام چند فرحتؔ، کنور باج شوکتؔ، موہن لال پانڈے، کامتا پرشاد ہوشؔ، رام پرشاد کھوسلا ناشادؔ، رامیشور پرشاد گلوارؔ اور رائے گوپال کرشن کے حالات بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ تذکرۂ ہندو شعرائے بہار سے قبل ہندو شعرا کے کئی تذکرے لکھے گئے ہیں مگر بیان احوال میں یہ تذکرہ ان سبھوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

مولف میں تحقیق کا ذوق و شوق کتنا تھا، اس کا اندازہ تذکرۂ ہٰذا سے جا بجا ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ عزیز الدین بلخی نے تاریخ شعرائے بہار میں اجاگر چند الفتؔ کے تخلص کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے غربتؔ تخلص کرتے تھے۔ لیکن پروفیسر سید حسن عسکری نے ۱۹۵۳ء میں لکھا کہ الفتؔ پہلے غریبؔ تخلص کرتے تھے۔ فصیح الدین بلخی نے اس امر کی تشفی کے لئے انشائے غریبؔ اور دیوان الفتؔ دونوں کو بغور پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ پروفیسر سید حسن عسکری کا ہی خیال درست ہے۔ عزیز الدین بلخی کے لیے انھوں نے یہ تاویل پیش کی ہے:

> ''مولف تاریخ شعرائے بہار نے جس تذکرہ کو دیکھ کر تخلص بجائے غریبؔ کے غربتؔ قیاس کیا۔ اس میں لفظ غریبؔ کے آخری دو حروف کے نقطے نہ ہوں گے۔ دونوں لفظوں میں تجنیس خطی ہے۔ نقطہ نہ ہونے کی صورت میں غریبؔ اور غربتؔ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''

فصیح الدین بلخی نے مواد فراہم کرنے کے جدید اصولوں سے حتی الامکان مصرف لیا ہے اس تذکرہ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں:

(۱) لالہ رام چند فرحتؔ کا حال اور کلام مولانا عبدالرشید نورانی ابن شوق نیموی نے فصیح الدین کو ارسال کیا۔

(۲) کامتا پرشاد ہوشؔ نے اپنے احوال خود لکھ کر روانہ کئے۔

(۳) امرناتھ اثرؔ نے کلام بھیجا۔

(۴) منشی چھیدن لال رنگینؔ کے احوال و کلام سید عابد امام ولد سید امداد امام اثرؔ سے حاصل

ہوئے۔ رنگینؔ امداد امام اثرؔ کے شاگرد تھے۔

(۵) پروفیسر شیام نرائن لال کے احوال ان کے صاحبزادوں سے حاصل کیے۔ مولف نے شعرا کے کلام پر رائے زنی نہیں کی ہے۔ بلکہ خالص محققانہ اور مورخانہ انداز میں احوال بیان کر کے نمونۂ کلام دے دیے ہیں۔

اپنی ان گونا گوں خصوصیات کی بنا پر تذکرہ ہند و شعرائے بہار شعرائے ریختہ کے تذکروں میں اہم مقام کا مستحق ہوجاتا ہے، بالخصوص صوبۂ بہار میں لکھے گئے تذکروں میں اس کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اس سے عظیم آباد کی قدیم ادبی دلچسپیوں اور مشاعروں کے رواج کا خاصہ اندازہ ہوتا ہے۔ مولف نے ان گلدستوں سے بہت زیادہ مدد لی ہے جو مشاعرہ منعقد ہونے کے بعد شرکائے بزم کی غزلوں پر مشتمل شائع کیے جاتے تھے۔ اکثر شعرا کی پوری پوری غزلیں شائع کرنے میں مولف کو اسی لیے کامیابی ہوئی ہے۔

(بہار میں تذکرہ نگاری سے ماخوذ، ص ۱۲۰-۱۱۸؛ ۱۸۴-۱۸۲)

☆☆☆

تذکرۂ نسوان ہند

فصیح الدین بلخی

فصیح الدین بلخی اردو ادب کی ان چند مغتنم ہستیوں میں ہیں جن کے دم سے تحقیق وتدقیق کی شمع روشن ہے۔ موصوف کوان کی تالیف ''تاریخ مگدھ'' کے باعث کافی شہرت حاصل ہوچکی ہے جسے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کیا تھا۔ ابھی حال میں ان کی ایک اور تالیف ''تذکرۂ نسوان ہند'' منظر عام پر آئی ہے، جس میں انھوں نے زمانہ قدیم سے لے کر دور حاضر تک کی نامور ہندوستانی اور پاکستانی خواتین کے مختصر کوائف درج کردیئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری خواتین زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دینے کی اہل ہیں۔ اس میں ۲۸۶ شاعرات، ۵۴ قلم کار اور ذی علم خواتین کے علاوہ ایسی مشاہیر کے احوال بھی درج ہیں جنھیں سیاسی، تمدنی یا اخلاقی نقطہ نظر سے فضیلت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ ۱۶ کاملین (یعنی جنھوں نے موسیقی، رقص یا اس طرح کے دوسرے فنون میں کمال حاصل کیا۔) کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں پورے ۴۸۹ شہر یافتہ خواتین کا تعارف پیش کردیا گیا ہے۔ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ طبقہ نسواں کے لیے اس میں خاص طور پر دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

فصیح الدین بلخی کی محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بلاشبہ انھوں نے متعدد تواریخ اور تذکروں کی ورق گردانی کی ہوگی۔ لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی اور محنت کتاب کی قدرو قیمت میں مزید اضافے کا موجب ہوتی۔ بعض خواتین کا تذکرہ صرف ایک سطر میں ختم کردیا گیا ہے۔ اکثر تذکروں میں غیر ضروری باتیں دے دی گئی ہیں جن سے ان خواتین کی

شخصیت اور کردار کے بارے میں کوئی خاص رائے مرتب نہیں ہو پاتی۔ ترتیب میں بھی خوش سلیقگی کا فقدان ہے۔ کاغذ، کتاب اور طباعت کتاب کے شایان شان نہیں۔ غالباً زوال عمر کے باعث موئف کتاب کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ ''تذکرۂ نسوان'' اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود، بہر حال، ایک سرکردہ محقق کی جانب سے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ ہر لائبریری اور تعلیمی ادارے میں اس کتاب کی ایک جلد ضرور ہونی چاہیے۔

(ماہنامہ 'سہیل' گیا، ستمبر ۱۹۵۷ء/ نگاہ طائرانہ ص ۹۴)

ڈاکٹر شعیب راہی

فصیح الدین بلخی کا طرز و اسلوب

فصیح الدین بلخی کی نثر کا بھی یہی حال ہے۔ اردو نثر نگاری کی باضابطہ ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی۔ اگر چہ نثر نگاری کے چند منتشر اور بے ربط نمونے اردو کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مذہبی کتابوں میں مل جاتے ہیں پھر بھی ہم انھیں باضابطہ اور آراستہ نثر نہیں کہتے۔ وہ نثر جس میں تہ داری اور باضابطگی ہو، جس میں پیچیدگی اور دبازت ہو، فورٹ ولیم کالج ہی کی پیداوار ہے۔ اردو نثر نگاری کے یوں تو مختلف خاکے اور گوشے ہیں لیکن ان سب کو زیر بحث لانے کا موقع نہیں، یہاں صرف اس بھاری بھرکم نثر سے غرض ہے جو انسانی زندگی کے بیشتر تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

تہذیب وتمدن کی نشوونما میں داستان گوئی کا بڑا دخل رہا ہے۔ داستان طرازی ہماری معاشرتی زندگی کا جزو رہی ہے۔ اسی طرح ارتقاے حیات کے ساتھ ساتھ داستان گوئی ترقی کرتے کرتے داستان نویسی کی منزل تک پہنچی چنانچہ اردو نثر کی باضابطہ وسیع اور متنوع ابتدا یہیں سے ہوئی اور میر امن پہلے نثر نگار ہیں جنھوں نے اردو نثر کو اتنی وسعت کے ساتھ استعمال کیا اور پھر ان کے ہم زبان دوسرے فن کاروں کے بھی یہی احسانات ہیں۔

فورٹ ولیم کالج میں اصول فنکاری کی جو دہلوی روایتیں پرورش پا رہی تھیں، ان کے نتائج مستقبل میں بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ اور انھیں اصول کو برت کر ڈپٹی نذیر احمد، ذکاء اللہ اور سر سید وغیرہ نے اردو نثر نگاری کو تہذیب وتمدن سے قریب کرتے ہوے اسے زندگی کے دوسرے مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔ ان میں بیشتر حضرات دلی کالج کی پیداوار ہیں۔ دلی کالج میں اردو نثر دوسرے اصناف ادب کے لیے استعمال کی گئی جس کا بیشتر حصہ تذکرہ نویسی، تاریخ گوئی

(نویسی)، مقالہ نگاری اور بیرونی زبانوں سے ترجموں پر مشتمل ہے۔ گویا فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی اجتماعی کوششوں سے اردو نثر، مسائل حیات کے تقریباً تمام پہلوؤں کی عکاسی کرنے کے قابل ہو چکی تھی۔ آزاد، حالی، شبلی اور عبدالحق نے ادبی تحقیق اور تنقید کے لیے اردو نثر کو استعمال کر کے اس کو ایسی وسعت عطا کردی، جو ہر تہذیبی اور ادبی زبان کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ذکاء اللہ، سرسید، حالی اور عبدالحق طرز و اسلوب کے اعتبار سے نذیر احمد، آزاد اور شبلی سے مختلف ہیں۔ میرامن نے اپنے سلوب کیلیے جو صفائی، سادگی اور پرکاری اختیاری کی تھی وہ دہلوی روایت تھی جو بڑی گراں قدر تھی۔ نثر نگاری کی یہی روایت آگے چل کر ذکاء اللہ، سرسید، حالی اور عبدالحق کے ہاتھوں پروان چڑھی اور ہمہ گیر صورت اختیار کر گئی۔ فصیح الدین بلخی نے اسی روایت کو اپنایا۔ فرق یہ ہے کہ ان کا میدان میرامن کی طرح داستان طرازی نہ تھا اور (نہ ہی) انھوں نے ناول نویسی اور افسانہ نگاری کو اپنی فکر کی جولان گاہ بنایا۔ وہ دنیا میں مورخ، محقق اور ناقد کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان ہی میدانوں میں ان کی پرکاری کے جوہر کھلتے ہیں۔

فنکار کی فنی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت جہاں ایک طرف ان مخصوص اصناف ادب کی روایتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جن سے فنکار متاثر ہوا ہو دوسری جانب اس کے گھریلو ماحول، خاندانی، نسلی اور جبلی روایات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فصیح الدین بلخی کا تعلق اس خاندان سے تھا جس میں تصوف اور روحانیت، فقر اور درویشی کا دور دورہ رہا ہے۔ جس خاندان کے فقرا اور درویشوں نے اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر روحانیت کا درس دیا ہے اور سلوک کی منزلیں طے کی ہیں۔ جہاں صوفیت، فقر اور درویشی زندگی کا مسلک رہی ہے۔ جہاں تصنع اور ظاہر داری، بے جا نمود و نمائش اور بے محل تکلفات کا کوئی گزر نہیں۔ سادگی اور صفائی زندگی کے ہر شعبے میں برتی جاتی ہے۔ یہی سادگی اور صفائی، تازہ کاری اور شگفتگی ان کے اسلوب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا اسلوب فقر اور درویشی کی طرح ظاہر داری اور تکلفات سے پاک ہے۔ ان کے اسلوب میں ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ شخصیت جس کا خمیر ان کے خاندانی تصوف، روحانیت، فقر اور درویشی کی خاک سے اٹھا تھا۔

طرز و اسلوب کا تعلق موضوعات سے بھی ہے۔ تحقیق و تنقید کی زبان میں افسانے یا

ناول نہیں لکھے جا سکتے۔ ناول یا افسانے کا اسلوب تحقیق و تنقید کے لیے موزوں [نہیں] ہے۔ انتخاب موضوع کا تعلق صرف فنکار کی مرضی سے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جہاں فنکار کے فکری رجحان کو دخل ہے وہیں ادبی روایت، ادبی ارتقا اور ماحول کا بھی ہاتھ ہے۔

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ فصیح الدین بلخی جس ادبی روایت سے متاثر ہوے وہ میر امن کی تھی جو سرسید گروپ سے ہوتی ہوئی زیادہ بالیدہ اور شستہ ہو کر ان تک پہنچی تھی۔ ان کی خاندانی روایت بھی ایسی نہ تھی جو انھیں ناول نویسی یا افسانہ نگاری کی طرف مائل کرتی۔ ان کی افتادِ طبع بھی ایسی نہ تھی جو انھیں اصناف ادب کی جانب جھکاتی۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ان کا سنجیدہ، بسیط اور گہرے موضوعات کے انتخاب کی طرف مائل ہونا فطری تھا۔ یہی سبب ہوا کہ انھوں نے تاریخ، تحقیق اور تنقید کو موضوعات کی حیثیت سے منتخب کیا۔

فصیح الدین بلخی کی ادبی دنیا بہت وسیع تھی۔ اس چھوٹے سے مضمون میں ان تمام وسعتوں کا احاطہ کرنا ذرا مشکل ہے تاہم تاریخ، تحقیق اور تنقید میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے، اس کا مختصر جائزہ لیا جاے گا۔

تاریخ، موضوع کے اعتبار سے نہایت خشک ہے۔ اس موضوع کے لیے جس قدر ٹھوس حقائق، تاریخی شواہد اور تحریری ثبوت کی ضرورت پڑتی ہے کسی دوسرے موضوع میں ان کی اتنی اہمیت نہیں۔ اس حیثیت سے ایک مورخ اپنے بیان کی صداقت کو پہلے مدنظر رکھتا ہے۔ اس جہت سے تاریخ نویسی کے لیے جو طرز و اسلوب مورخ استعمال کرتا ہے اس میں ادبی لطافت اور داستانی دل چسپی کا پہلو مشکل سے ملتا ہے۔ عام طور پر تاریخ نگاروں کے یہاں موضوع کے اعتبار سے عبارت اور انداز بیان بھی خشک، بے کیف اور غیر دل چسپ ہوتا ہے مگر فصیح الدین بلخی نے تاریخ نگاری کے موضوع کے لیے جو طرز و اسلوب اختیار کیا اس میں ادبی لطافت بھی ہے اور داستانوی دل چسپی بھی۔ انھوں نے لطافت، سادگی، خوش رنگی اور دل چسپی کے پہلو کو بھی مدنظر رکھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تاریخ پڑھتے وقت لطف اور دلچسپی دونوں حاصل ہوتی ہے۔

''تاریخ مگدھ'' ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی جو اپنے موضوع کے اعتبار سے مگدھ کی خالص تاریخ ہے۔ عام طور پر مورخین اپنے بیان کو تقویت

پہنچانے کے لیے دوسرے مورخین کا حوالہ دیتے ہیں۔ حضرت فصیح الدین بلخی نے 'تاریخ مگدھ' میں دوسرے تاریخ دانوں کے علاوہ فارسی کی منظوم تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس طرز تحریر سے جہاں صداقت اور ثبوت کی فراہمی مقصود ہے وہیں تاریخ میں ادبیت وشعریت پیدا کر کے اسے زیادہ دل چسپ اور لطیف بنانے کا خیال بھی پیش نظر ہے۔

منیر کب فتح ہوا اور یہاں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم کب آئے؟ مختلف تاریخ کے حوالوں سے بحث کرتے ہوئے اسی کے ثبوت میں فارسی کے دو اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔

منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے پایا جاتا ہے کہ ۵۷۶ھ (۱۱۷۸ء) میں حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا۔ اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے، ان میں پچیس آدمی کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں۔ اس فتح کی تاریخ حسب ذیل ہے:

یافت چوں بر راجۂ منیر ظفر　　　داد امام از دین جہانی رانوی

ہست منقول از بزرگان سلف　　　سال آن 'دین محمد شد قوی'

(تاریخ مگدھ ص ۹۶-۹۷)

ان اشعار کے پیش کرنے کا مطلب صرف اپنے بیان کی تصدیق ہی نہیں بلکہ مسلسل تاریخی حوالوں سے انداز بیان میں جو ایک قسم کی یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہو رہی ہے، اس میں تفریح پیدا ہو سکے۔ شعر نثر کے مقابلہ میں بلاشبہ زیادہ موثر اور لطیف ہوتے ہیں اور حضرت بلخی اس نکتے سے واقف تھے۔ تاریخ مگدھ میں بھی ان کا اسلوب عام طور پر رواں، بے ساختہ اور پرکار ہے۔ ان کی نثر اس قدر غیر جانبدارانہ ہے کہ کہیں بھی لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ خواہ جاں بخشی ہو یا قتل کا مقام، ہر جگہ ضبط اور ٹھہراو ملتا ہے۔ مغیث الدین طغرل کے بیان میں لکھتے ہیں:

> اتفاقاً ایک دن سلطان کے مقدمۃ الجیش میں ملک محمد شیر انداز اور اس کا بھائی ملک مقدر، تیس چالیس سواروں کو ساتھ لے کر جنگل روانہ ہوا۔ چند بقال نظر آئے۔ شیر انداز نے ان بقالوں کو ملک باریک کے پاس روانہ کیا اور خود ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو طغرل (کے) لشکر کو

بالکل غافل پایا۔ اس کے ہاتھی گھوڑے بھی چرائی میں مشغول تھے۔
اس فرصت کو غنیمت جان کر تیس چالیس سواروں سے جو اس وقت
موجود تھے، اچانک طغرل کی خیمہ گاہ پر حملہ کر دیا۔ ان واروں نے نعرہ
بلند کیا کہ سلطان بلبن کا اقبال قائم رہے۔ طغرل نے جو سلطان کے
پہنچنے کا گمان کیا، گھبراہٹ میں طہارت خانے کی طرف سے نکل کر بغیر
زین کے گھوڑے پر سوار ہو کر ندی کو عبور کرنا چاہا۔ اسی وقت ملک
مقدر نے ایک تیر سے اس کا کام تمام کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر رکھ لیا۔
بعد میں ملک باریک کا لشکر بھی پہنچ گیا اور طغرل کے ساتھیوں
کو گرفتار کر کے سلطان بلبن کے پاس لے گیا۔ سلطان بلبن نے ملک
مقدر کو 'طغرل کش' کا خطاب دیا اور لکھنوواپس آ کر بازاروں میں دور
تک سولیاں کھڑی کرائیں اور طغرل کے تمام اہل و عیال اور اعیان
و انصار کو مجرم قرار دے کر قتل کرایا۔

اس پوری عبارت میں کہیں بھی اکتاہٹ اور پھیکا پن نہیں محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مصنف کے مزاج میں خود بھی ٹھہراو ہے۔ فصیح الدین بلخی کے اسلوب کا یہی کمال ہے۔ تاریخ کے موضوع کو بھی واقعہ نگاری اور جزویات نویسی سے پر کشش بنا دیتے ہیں۔ انھوں نے اس تاریخ میں صرف سلاطین کے واقعات اور مقامات کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ کچھ مواقع پر لوگوں کی نفسیات بھی پیش کر دی ہے اور ہر جگہ ان کا انداز تحریر اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ یہ تصویریں واقعات اور کیفیات کی مناسبت سے کہیں تو بڑی ہیں، ان کا کنیوس بڑا ہے اور کہیں مختصر۔ لیکن اختصار ہو یا طوالت، ہر جگہ تصویر بالکل صاف اور نمایاں ہے۔ پوری تاریخ میں واقعات کی تحقیق و تفتیش علاوہ طرز تحریر کے دو خصوصیتیں بے حد نمایاں ہیں۔ ایک داستانوی انداز، دوسری ادبی و شعری لطافت اور چاشنی۔ ان دو خصوصیتوں کے علاوہ کہیں کہیں قاری کے انسانی نفسیات کی جلوہ گری بھی ملتی ہے۔ نفسیات ایک موضوع ضرور ہے لیکن تاریخ میں افراد کی نفسی کیفیت کی عکاسی، الفاظ کے انتخاب اور اس کی ترتیب و تنظیم سے

پیدا ہوتی ہے۔ فصیح الدین بلخی کے طرز نگارش اور اسلوب تحریر کی ان خصوصیتوں نے 'تاریخ مگدھ' کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ 'تاریخ مگدھ' میں جا بہ جا داستانوی انداز اور واقعات میں داستانوی رنگ آمیزی چھلکی پڑتی ہے۔ چند بے حد دل چسپ مقاموں پر اکتفا کرتا ہوں۔

شہزادہ سلیم اور مہر النسا کی عشقیہ حکایت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ۱۰۰۸ھ میں شہزادہ سلیم نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف الہ آباد آ کر خود مختارانہ حکومت شروع کی۔ صوبہ بہار قطب الدین خان (نواسہ حضرت سلیم چشتی) کی جاگیر قرار پایا۔ یہ وہی قطب الدین ہے جو ۲/صفر ۱۰۱۵ھ کو بردوان میں علی قلی شیر افگن شوہر مہر النسا کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس واقعہ کے متعلق بہت کچھ فسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قطب الدین خاں نے جہانگیر بادشاہ کے ایما سے شیر افگن کو یہ صلاح دی تھی کہ مہر النسا کو طلاق دے کر فوراً آگرہ بھیج دے۔ واقعہ کی اصلیت جو کچھ ہو بظاہر بات کی بات میں قطب الدین خاں اور شیر افگن میں ایسی بگڑ گئی کہ آناً فاناً تلوار چل گئی اور دونوں مقتول ہوے۔

سلطان غیاث الدین اور حافظ شیرازی، قارئین کی دل چسپی کے لیے یہ پوری حکایت بیان کی جاتی ہے:

> ایک مرتبہ غیاث الدین اعظم شاہ مشرقی بنگال کی طرف گیا ہوا تھا۔ اتفاقاً اس سفر میں کوئی مرض ایسا لاحق ہوا کہ زیست سے یاس ہوگئی۔ اس وقت اس کی تین بیویاں بھی ساتھ تھیں جن کے لقب سرور محل، گل محل اور لالہ محل تھے۔ اس نے ان کو وصیت کی کہ میرے مرنے پر نعش کو تم اپنے ہاتھوں سے غسل دینا لیکن غیاث الدین اعظم شاہ نے شفا پائی تو اس کی اور بیویوں نے ازراہ طعن ان تینوں محلوں کو غسالہ کہنا شروع کیا۔ انھوں نے موقع پا کر اعظم شاہ سے شکایت کی۔ اس وقت عالم انبساط میں اعظم شاہ کی زبان پر برجستہ یہ مصرعہ آیا: ساقی حدیث

سرو وگل ولالہ می رود لیکن اس کے برابر کا دوسرا مصرعہ ذہن میں نہیں آیا
اور دربار کے شعرا بھی حسب دلخواہ مصرعہ نہ لگا سکے۔ اعظم شاہ نے یہ
مصرعہ طرح ایک قاصد کی معرفت کچھ تحائف کے ساتھ حضرت شمس الدین
حافظ شیرازی کے پاس روانہ کیا۔ اور حضرت حافظ کو بنگالے آنے کی
دعوت دی۔ حضرت حافظ بھی بنگالے آنے کے شائق تھے لیکن کبرسنی
اور صعوبت سفر کا اندیشہ مانع ہوا۔ تاہم ایک غزل کہہ کر روانہ کیا جس
کے تین اشعار کو ہمارے بیان سے خاص تعلق ہے۔ اس لیے اس جگہ
نقل کیے جاتے ہیں۔

پوری غزل، دیوان میں موجود ہے:

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ می رود
این بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظؔ زشوق مجلس سلطان غیاث دین
خامش مشوکہ کار تواز نالہ محارود

اس واقعہ کو مختلف تاریخی شواہد کے ساتھ انھوں نے صرف تاریخ کو ہی اپنے بیان کی صداقت وتقویت کے لیے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کیا بلکہ اشعار سے بھی اس کی تصدیق کی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فن تاریخ نویسی کو ادب وشاعری کی لطیف بلندیوں تک لے جانے کے قائل تھے اور تاریخ نویسی میں افسانہ طرازی کے محل نکال ہی لیتے تھے۔ تاریخ صرف ملک کی نہیں ہوتی بلکہ انسان کی بھی ہوتی ہے۔ تاریخ میں انسان کی بدلتی کیفیتوں اور ارتقائی حالتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں انسان کے بعض خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کیفیات کی عکاسی بھی کی جاتی ہے۔ داخلی کیفیات کی ترجمانی کا مسئلہ خاص نفسیاتی ہے تاہم انسانی زندگی سے وابستہ ہر تصنیف میں ان نفسی کیفیتوں کی تصویر پیش کی جاتی

ہے۔صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ شہزادہ محمد عظیم کے بیان میں لکھتے ہیں:

شہزادہ اپنی شہزادگی کے سبب نخوت کرتا تھا اور مرشد قلی خاں کو بادشاہ کا معتمد ہونے کے سبب اپنے اعزاز کا خیال تھا۔ (تاریخ مگدھ ص ۱۲۸)

حضرت فصیح الدین بلخی کے تحقیقی کارنامے یوں تو بہت ہیں لیکن 'تذکرہ نسوان ہند' اس سلسلے کی بے حد قیمتی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں مشاہیر خواتین پانچ حصوں میں منقسم ہیں: شاعرات۔ مصنفات۔ کاملات۔ مشتہرات اور مقدسات۔ ان میں ان کے حالات زندگی اور ان کی حیثیتوں کو نمایاں کرنے کے لیے محققانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ محقق ہمیشہ انداز بیان اور طرز و اسلوب میں محتاط رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتا ہے کہ کوئی لفظ، کوئی جملہ یا کوئی عبارت ایسی نہ لکھی جائے جو اس کے محققانہ طرز تحریر کو کم وقعت، کم وزن اور غیر معیاری ثابت کرے۔ بعض مشہور شخصیتوں سے متعلق عوام الناس میں کچھ ایسے افسانے مشہور ہو جاتے ہیں کہ جب تک محققانہ طور پر ان کی جانچ نہ کی جائے۔ ان کی تصحیح یا تغلیط کے متعلق رائے قائم کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ان مشہور عام افسانوں کے متعلق محقق کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ قاری کسی نہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ جائے۔ فصیح الدین بلخی نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے۔ ان کا طرز ہمیشہ فیصلہ کن ہوتا ہے اور اسلوب میں کہیں بھی لغزش یا کوتاہی نہیں ہوتی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النسا مخفی کی نسبت عام طور پر جو داستانیں مشہور ہیں، ان کے متعلق صرف یہی لکھ کر ان کا بے بنیاد ہونا ثابت کر دیتے ہیں:

لوگوں نے بہت سے لطیفے اور ہزلیات بھی اس کی طرف منسوب کیے ہیں لیکن اس کے کلام کی پاکیزگی کو دیکھ یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ تمام تر لطیفے اور ہزلیات لوگوں کے من گھڑت ہیں۔

یہ عبارت بہ ظاہر بہت مختصر ہے لیکن اس اختصار کے باوجود اس کا طرز و اسلوب اس قدر قطعی اور فیصلہ کن ہے کہ مخفی کی شخصیت کا وقار سامنے آجاتا ہے۔ اس میں دو الفاظ 'پاکیزگی' اور 'فیصلہ' بڑی معنویت اور گہرائی کے حامل ہیں۔ ہر بڑا باشعور اور بالغ فکر اہل قلم الفاظ کی قدر و قیمت سے واقف ہوتا ہے۔ الفاظ شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ الفاظ کے صحیح یا غلط استعمال پر نہ صرف شخصیت کی

سیرت نگاری کا انحصار ہے بلکہ محققانہ بیان میں وزن اور قطعیت کا دار ومدار بھی انھیں پر ہے۔

تذکرہ نسوان ہند، میں خصوصاً شاعرات کے تذکرے میں فصیح الدین بلخی نے کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی ہے۔ ان کے نزدیک اصل معیار فن ہے۔ اس اصول کے پیش نظر ان تمام خواتین کا ذکر ہے جو شاعرات تھیں، جنھیں شعر وشاعری کا ذوق تھا اور فکر سخن کرتی تھیں خواہ وہ فعل شہزادی کا ہو یا ادنی درجہ کی کوئی طوائف کا۔ لیکن ہر طبقہ کی شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے مرتبہ کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں۔ مرتبہ کے اعتبار سے کسی شاعرہ کی تعریف یا تضحیک نہیں بلکہ اس کی زندگی کے حالات کو منظر عام پر لانا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا انداز بیان منضبط اور ٹھہرا ہوا رہتا ہے۔ کہیں کہیں تو صرف ایک لفظ یا جملے سے کسی مخصوص شاعرہ کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ یہی نقاشی ان کا کمال فن ہے۔ ان کے طرز تحریر کا جادو چھوٹی چھوٹی تصویروں میں زیادہ جاگتا ہے۔ بنّو کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بنّو دہلی کی ایک زن خانگی کا نام اور تخلص تھا جو حسن وادا میں مشہور تھی۔ دہلی کا رہنے والا گلاب سنگھ کھتری آشفتہ تخلص، اس پر آشفتہ ہوا اور اس کے فیض سے بنّو نے شاعری کو اپنا شعار بنایا۔ آشفتہ نے کسی آن پر آشفتہ سری سے ایک دن اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیا۔ بنّو کو ایسا قلق ہوا کہ تپ دق میں مبتلا ہو کر چھ مہینے کے اندر ہی مر گئی۔

اس عبارت میں اگرچہ تفصیل نہیں تاہم بنّو کی سماجی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی وفاداری اور جاں نثاری کا بھی علم ہوتا ہے۔ آشفتہ کے تخلص کو معنوی اعتبار سے مختلف حیثیتوں سے استعمال کیا گیا ہے جس سے عبارت میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت پیدا ہوگئی ہے۔ جس طرح بنو کے حال میں 'زن خانگی' کا لفظ استعمال کرکے اس کے سماجی مرتبے اور حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس میں ذم کا پہلو نہیں۔ اس طرح آرائش کا ذکر کرتے ہوئے صرف ایک چھوٹا سا جملہ لکھا گیا ہے: ''اوائل عمر میں کسی قدر آوارہ حال تھی۔''

فصیح الدین بلخی الفاظ کے انتخاب میں اس قدر چابک دست اور باشعور تھے کہ کوئی لفظ بھی غیر شعوری طور پر ان کے قلم سے نہیں نکلتا تھا۔ آرائش ہی کے ذکر میں آگے لکھا ہے کہ ''بعد کو

اس نے ایک نیک مرد سے عقد کرلیا اور باقی عمر نہایت سلامت روی سے گزاری۔'' آرائش کو انھوں نے آوارہ حال لکھا ہے۔ آوارہ حال اور آوارگی میں فرق ہے۔ مزاج کی آوارگی بڑی مشکل سے اصلاح پذیر ہوتی ہے۔ حال کی آوارگی صورت حال بدل جانے کے بعد بحال ہوجاتی ہے۔ یہی سبب ہوا کہ آرائش میں ''سلامت روی'' آگئی۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کی نشست و برخاست کے ذریعہ شخصیتوں اور ان کے حالات کی صحیح عکاسی کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ شخصیتوں کی خارجی تصویر گری بھی وہ الفاظ اور جملوں کے سہارے بڑی خوبی ۔سے کیا کرتے تھے۔ یہ تصویریں بڑی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔ ان میں سادگی کے ساتھ ساتھ پرکاری اور پاکیزگی ہے۔

صنم جو اسداللہ خاں غالبؔ، خواجہ غلام غوث بے خبرؔ اور مرزا حاتم علی مہرؔ کی ہم جلیس اور ہم عصر تھی، اس کے حالات میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں درگا (صنم) نوعمر تھی، خوبصورت تھی اور پیشانی پر قشقہ لگا رہتا تھا۔''

یہ صنمؔ کی خارجی تصویر کا کتنا صاف عکس ہے۔

عام طور پر فصیح الدین بلخی کی تحریروں میں طنز و ظرافت کا رنگ نہیں ملتا۔ ان کا طرز و اسلوب تاریخ، تحقیق یا تنقید ہر صنف ادب میں بے حد سنجیدہ، متین اور پروقار ہے۔ لیکن کہیں کہیں حالات و کیفیات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ہلکا تبسم قاری کے لبوں پر نمودار ہوجاتا ہے اس تبسم میں طنز کی بجائے خلوص کا پہلو ہوتا ہے۔ وہ خلوص جو نیک نیتی اور غیر جانبداری کی دلیل ہے۔ ہاجرہ مسرور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گھر میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد ۱۹۲۶ء میں اسکول میں داخل ہوئیں جہاں سوائے حساب کے ہر مضمون میں تیز ثابت ہوئیں۔

یہاں ہاجرہ کی شخصیت کے کسی کمزور پہلو کی نمائش مقصود نہیں بلکہ اس جملے سے ایک لطیف قسم کی خوش دلی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر مسکراہٹ کا فعل احساسی ہے تو احساس تبسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس جملہ کا جو رکھ رکھاو ہے وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ موضوع کے اعتبار سے تحقیق بھی تاریخ کی طرح خشک موضوع ہے لیکن مورخ اور محقق کا انداز بیان اور

اسلوب نگارش اسے دلچسپ اور لطیف بناتا ہے۔

تاریخ کی طرح تحقیق کو بھی فصیح الدین بلخی نے اپنے طرز کے ذریعے نہ صرف دلچسپی اور لطافت عطا کی بلکہ ادبیت اور شعریت بھی بخشی ہے۔ اپنی تحقیق کو زیادہ وقیع اور صحیح ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اشعار کے حوالوں سے بھی کام لیا ہے۔

ماہم بیگم (ہمایوں بادشاہ کی ماں) نے ۹۴۹ھ میں ایک مدرسہ اور ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کے سن تعمیر کی صحت کے لیے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے:

به دور آن جلال الدین محمد — که باشد اکبر شاہان عادل

چو ماہم بیگم عصمت پناہی — بنا کرد این بنا بہر افاضل

ولی شد ساعی این بقعہ خیر — شہاب الدین احمد خان باذل

زہے خیریت این بقعہ خیر — کہ شد تاریخ او 'خیر المنازل'

ان اشعار کے پیش کرنے کا مقصد صرف اپنی تحقیق کو تقویت پہنچانا ہی نہیں بلکہ عبارت میں جو ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، اسے دور کرنا بھی ضروری ہے۔ مناسب حال اشعار کی موجودگی سے عبارت اور انداز بیان میں شادابی اور رعنائی آجاتی ہے۔ طرز تحریر میں شادابی، شگفتگی اور رعنائی پیدا کرنے کے اس فن سے وہ خوب واقف ہیں۔ دراصل ان کے مزاج ہی میں شاعرانہ لطافت موجود تھی۔ بعض حالتوں میں انھوں نے واقعات کی کچھ ایسی تفصیل پیش کی ہے جس سے حالات کا بھی علم ہوتا ہے اور ان کے انداز بیان کی سلاست وسادگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ممتاز محل کے بیان میں لکھتے ہیں:

> جہانگیر خود بیٹے (شاہجہان) کی برات لے کر دلہن (ممتاز محل) کے گھر گیا تھا۔ مہر پانچ لاکھ روپیہ قرار پایا تھا اور دولہا نے موتیوں کا بیش بہا ہار دلہن کے گلے میں ڈالا تھا۔

اس عبارت میں تحقیق کے ساتھ افسانوی انداز بیان پایا جاتا ہے۔ تحقیق و افسانے کا یہ امتزاج بھی بڑا خوشگوار ہے۔ اس طرح تحقیق میں حد درجہ تاثر اور اثر انگیزی پیدا کرنے کے لیے ادنی اور معمولی واقعات کو بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان میں اثر ونفوذ کی کیفیت پیدا

ہوگئی ہے۔ تحقیق میں تاثراتی طرزِ تحریر بھی فصیح الدین بلخی کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف ہے۔
زوجۂ داود خاں کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

اس عورت (زوجۂ داود خاں) کی خودکشی کا واقعہ دنیا کے عجیب وغریب واقعات میں ہے۔ اس کا شوہر داود خاں والی گجرات حسین علی خاں امیر الامرا کے مسلح اور زرہ پوش سپاہیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو اس عورت نے زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی کی ٹھان لی۔ لیکن سات مہینے کی حاملہ تھی اور بچہ کو اپنے شوہر کے نام ونسل کی یادگار چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے خنجر سے اپنا پیٹ بہت احتیاط کے ساتھ چاک کیا اور بچے کو پیٹ سے نکال کر بطور امانت ورثا کے سپرد کیا اور خود عدم کی راہ لی۔

تحقیق میں طرزِ تحریر کا یہ تاثراتی رنگ بھی ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ تحقیق میں تاثر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے انداز بیان میں جملوں کی مناسبت سے الفاظ منتخب کیے ہیں۔ الفاظ موقع ومحل کے اعتبار سے عبارت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ الفاظ، فن کار کے خیالات کے ترجمان۔ خیالات وواقعات کے پس منظر میں ابھرتے ہیں۔ انھیں واقعات کی مناسبت سے عبارت میں زیادہ تر جانداری اور جذباتی کیفیت پیدا کرنے کے لیے فصیح الدین بلخی نے جابہ جا اشعار پیش کیے ہیں۔ یہ اشعار ہمیشہ واقعات کی تہوں کے ساتھ خیالات کے دریچوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی اس نمود میں بے ساختگی کو زیادہ دخل ہے۔ اسی بے ساختگی کے سبب انداز بیان میں دل کشی اور اثر انگیزی پیدا ہوگئی ہے۔

جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی تھی، بادشاہ زادی ہونے کے باوجود تصوف سے خاصہ شغف رکھتی تھی۔ اس کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

جہاں آرا نے سترہ برس کی عمر میں ۱۰۹۲ھ میں انتقال کیا اور حسب وصیت حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کے احاطہ میں مدفون ہوئی مدفن پر یہ کندہ ہے:

بغیر سبزہ نپوشند کسی مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

جہاں آرا کے پورے حالات کی روشنی میں یہ شعر اس قدر جذبی کیفیت کا حامل ہے کہ قاری کے دل میں داخلی تاثرات کی لہریں موجزن ہو جاتی ہیں۔

عام طور سے تحقیق کی عبارتوں میں طرز تحریر میں سنجیدگی کے علاوہ ایک نوع کی خشکی اور ثقالت پائی جاتی ہے۔ گنجلک عبارت ادبی فن تحقیق کی ایک بڑی خامی ہے۔ تحقیق بہ ذات خود ایک خشک موضوع ہے، اس پر عبارت اگر پیچیدہ، نامانوس اور غیر لطیف ہو تو یہ محقق کے اسلوب کی خامی کی نمایاں دلیل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریسرچ اسکالر یا Ph. D کی تھیسیس تیار کرنے والے طلبا جبراً قہراً کسی طرح مضمون کو پڑھنے اور پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عام ادبی مذاق رکھنے والے اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے۔

فصیح الدین بلخی کے اسلوب کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ خشک سے خشک تحقیقی موضوع کو بھی اس سادہ اور دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قارئین کو موضوع کی خشکی کا احساس برائے نام بھی نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ بعض تحقیقی مضامین موضوع کے اعتبار سے اگر چہ زیادہ اہم نہیں ہوتے تاہم فصیح الدین بلخی نے ایک صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے اسے اہم بنا دیا ہے۔ اس نوع کے غیر اہم یا نیم اہم تحقیقی مقالوں میں بھی ان کا انداز بیان اس قدر دلچسپ، شگفتہ اور دل نشیں ہے کہ قارئین کو اکتاہٹ نہیں محسوس ہوتی۔ ان کے طرز و اسلوب نے ان خشک، غیر اہم اور نیم ادبی تحقیقی مقالوں کو قابل توجہ ہی نہیں بنایا بلکہ عام ادبی مذاق رکھنے والے لوگ بھی اسے بہ آسانی پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی واقفیت میں اضافہ کرتے ہیں مثلاً ’امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں، میں لکھتے ہیں:

> میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان دونوں (امیر اور داغ) کی قبریں بھی کسی مشہور درگاہ کے احاطہ میں ہوں گی۔ اس قیاس کی بنا پر سیدھا حضرت یوسفین کی درگاہ پہنچا۔ وہاں حسن اتفاق سے مجھے ایک خضر سیرت مل گئے اور انھوں نے اس درگاہ کے احاطہ میں دونوں قبریں

بتا دیں۔ مذکورہ بالا قبریں پختہ اور اب تک درست حالت میں ہیں لیکن
نہایت کس مپرسی کی حالت میں رہنے کے سبب ان پر حسرتین برس رہی
ہیں۔ اگر یہی صورت رہی تو شاید آئندہ نسلوں کو ان کا سراغ نہ ملے گا
بس نامور بزیر زمین دفن کردہ اند کز ہستیش بروے زمیں یک نشان نماند۔

تحقیق کا یہ موضوع کس قدر خشک ہے مگر عبارت اور انداز بیان کی سادگی اور صفائی، سلاست اور روانی نے موضوع کی خشکی اور سپاٹ پن کو دور کر دیا ہے۔ یہی طرز ایک اور مقالے 'عظیم آباد میں شعرا کے مزارات' میں انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی محقق کسی دوسرے محقق کی عدم واقفیت کو دائرۂ تحریر میں لانا چاہتا ہے تو اس کے اسلوب کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ واقفیت کا حامل محقق اس کی نشان دہی پر برہم نہ ہو بلکہ اس کا شکر گزار ہو۔ فصیح الدین بلخی کے اسلوب میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اختر اورنیوی صاحب اپنی گراں قدر تصنیف 'بہار میں اردو زبان اور ادب کا ارتقا' میں صفحہ ۳۷۷ پر شجاع الدین علی بہاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ حال معلوم نہیں۔ اختر اورنیوی صاحب کی تصنیف کو دیکھنے کے بعد فصیح الدین بلخی نے مولوی شجاع الدین علی بہاری سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جو 'صبح نو' اپریل ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں لکھتے ہیں:

> اس تحریر میں مجھے ان کے (اختر صاحب) بارے میں کچھ لکھنا مقصود نہیں بلکہ ایک حقیقت سے اپنی لاعلمی کا اقرار وانکشاف کے بعد مزید حالات کا اظہار مدنظر ہے۔

اس کے بعد مولوی شجاع الدین بہاری کے حالات، جو کچھ انھیں علم تھا، تحریر کرتے ہیں۔ اس تحریر میں کہیں بھی کوئی جملہ یا لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اختر صاحب کی ادبی شخصیت پر حرف آتا ہو بلکہ خود ہی لکھا ہے:

> اختر صاحب سپہر ادب کے ایسے تابندہ ستارہ ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ان کے طرز اسلوب میں ان کی شخصیت کا اتنا گہرا رچاو، عکس اور چھاپ ہے کہ ان کے قلم سے کہیں بھی لغزش نہیں ہوتی۔

علم وواقفیت کی وسعت نے ان کے اندر عجز وانکساری کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ شاید وہ خود اپنی شخصیت کو بھول گئے تھے۔ اپنی شخصیت کو گم کر دینا معرفت کی منزل ہے اور یہی صوفی کے لیے راہ سلوک کا مقام۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

> مجھے افسوس ہے کہ مولوی شجاع الدین علی کے اس اردو رسالہ سے (جس کے انکشاف کا فخر اختر صاحب کو حاصل ہے) اپنی ناواقفیت کے سبب مندرجہ بالا گیتوں کی طرف وہ التفات نہ کیا جن کے وہ مستحق تھے اور ان کے ساتھ اوراق پارینہ کا سلوک کر کے شجاع الدین علی رضوی کے ذاتی اور خاندانی حالات کو روشنی میں لانے سے قاصر رہا۔

ان کے انداز بیان کی یہ خوبی بڑی ریاضتوں کی حامل ہے جو نہ جانے نفس کشی کی کتنی منزل طے کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہوگی، پھر بھی:

> ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ فصیح الدین بلخی کا اسلوب ادبی و تحقیقی میدان میں بھی عام روش سے قدرے الگ اور مختلف ہے۔ تاریخ و تحقیق میں مورخ اور محقق جو انداز بیان اور اسلوب نگارش اختیار کرتا ہے، اس کا تعلق عقل وخرد سے زیادہ ہے۔ ہر ہر نکتہ اور ایک ایک لفظ کا عقل کی روشنی اور خرد کی کسوٹی پر پورا اترنا شرط ہے۔ واقعات کی چھان بین اور تحقیق میں اس قدر دلائل سے کام لیا جاتا ہے کہ عبارت میں پیچیدگی اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ فصیح الدین بلخی نے اس طرز تحریر سے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کا طرز و اسلوب، عقل و جنون کا امتزاج ہے۔ ان کے انداز بیان میں عقل کی ہوشیاری بھی ہے اور جنون کی وارفتگی بھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں صحت واقعات کے ساتھ ساتھ طرز تحریر میں تغزل کی کیفیت ملتی ہے۔

'مقدسات' کے اذکار میں ان کا انداز بیان عقل سے زیادہ جنون کے قریب ہے۔ زندگی میں خود ان کی شخصیت پر بھی جنون کا غلبہ رہا ہے جو تصوف اور روحانیت اور سلوک کا فیضان ہے۔ یہی سبب ہے کہ مقدس شخصیتوں کے ذکر میں ان کے انداز بیان میں تقدس اور پاکیزگی کے پہلو بہ پہلو جذبی اور روحانی کیفیات کا رنگ غالب ہے۔ الفاظ کے انتخاب

اور جملوں کی ساخت میں ٹھہراو اور ضبط و نظم ہے۔ عبارت کی اٹھان، ترتیب اور اختتام کچھ ایسا ہے کہ شخصیت کی بزرگی، تقدیس اور مرتبہ کا پورا اندازہ اور احساس ہو جاتا ہے۔ حضرت قاسم خاتون (والدۂ محترمہ حضرت فریدالدین گنج شکر) کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> انھیں (حضرت قاسم خاتون) کے فیض پرورش سے حضرت گنج شکر اس پایہ پیر طریقت ہوئے کہ ان مریدوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ جب حضرت گنج شکر نے اجودھن میں توطن اختیار کیا تو اپنے بھائی حضرت نجیب الدین متوکل کو ان کے (اپنی والدہ) لانے کے لیے بھیجا۔ وہ ان کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ راہ میں پانی کی ضرورت ہوئی تو ان کو ایک درخت کے سائے میں بٹھا کر پانی کی تلاش میں نکلے۔ واپس آئے تو ان کو نہ پایا۔ ادھر ادھر دیکھنے پر کچھ ہڈیاں نظر آئیں۔ ان کو ایک تھیلی میں جمع کرلیا۔ لیکن وہ ہڈیاں پراسرار طور پر غائب ہوگئیں۔

فصیح الدین بلخی نے کہیں بھی حضرت قاسم خاتون کے متعلق بھاری بھرکم الفاظ نہیں استعمال کیے۔ صرف سادہ طور پر واقعات کا ذکر کر دیا اور ان کی فضیلت خود بہ خود ابھر کر نمایاں ہوگئی۔ یہی انداز بیان انھوں نے حضرت زلیخابی بی (والدۂ ماجدہ حضرت نظام الدین اولیا) کے تذکرے میں اختیار کیا ہے۔ محض واقعات کی پیش کش ملاحظہ ہو۔

> دوسرے مہینے نظام الدین اولیا قدم بوسی کو حاضر ہوئے تو ان کی والدہ نے فرمایا کہ آئندہ مہینے میں تم کس کی قدم بوسی کرو گے۔ حضرت نے مضطرب ہو کر پوچھا کہ مجھے کس کے سپرد کرتی ہیں۔ ماں نے جواب دیا کہ آج کی شب تم اپنے بھائی کے ساتھ رہو۔ کل تمہارے سوال کا جواب دوں گی۔ حضرت نے حسب حکم بھائی کے گھر میں رات گذاری اور صبح کو حاضر ہوئے تو ماں نے کہا کہ اپنا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ حضرت نے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو ماں نے کہا اے خدا! اسے تیرے سپرد کرتی ہوں۔ اسی وقت بی بی زلیخا کی روح پرواز کرگئی۔

یہ کس قدر سیدھی سادھی لیکن دل نشین اور پر اثر عبارت ہے۔ اس میں نہ تو ثقیل الفاظ ہیں، نہ غیر مانوس تشبیہیں اور استعارے، نہ فارسی کی عبارت واضافت، نہ قرآن وحدیث کے حوالے۔ دراصل یہ واقعات ہیں جن سے خود حضرت فصیح الدین بلخی متاثر تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے تاثراتی رنگ میں۔ روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والے جذبات وخیالات اور تاثرات کی عکاسی کے لیے الفاظ کے گورکھ دھندے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سیدھی عبارت میں بھی اپنا رنگ، دکھا جاتے ہیں۔

فصیح الدین بلخی کے اسلوب کا ایک میدان تنقید ہے۔ ان کی چند تنقیدی مثالوں کی روشنی میں ان کے طرز واسلوب کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تا کہ انداز بیان کے اعتبار سے ان کی نثر کی مختلف خصوصیتیں پورے طور پر منظر عام پر آسکیں۔

تنقید کا معاملہ افہام وتفہیم کا معاملہ ہے۔ ناقد کا انداز بیان اور طرز واسلوب سمجھ میں آنے والا چاہیے۔ اگر یہ خوبی اس کے طرز تحریر میں نہیں تو تنقید بے اثر اور کار باطل ہو کر رہ جائے گی۔ تنقید میں فصیح الدین بلخی کا طرز تحریر موضوع سے ہم آہنگ ہے اور موضوع کے اعتبار سے اس میں سنجیدگی، گہرائی، وسعت اور معنی خیزی پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین بھی عام طور پر تحقیقی ہیں مگر ان میں کہیں کہیں تنقید کے جملے بھی مل جاتے ہیں جن سے ان کے تنقیدی اسلوب کا پتا چلتا ہے۔ ضیا عظیم آبادی کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس کلام، محض کلام تخیل نہیں بلکہ اپنے ذاتی جذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی ہے۔

یہ جملہ بظاہر بہت مختصر ہے مگر معنوی اعتبار سے ضیاؔ کے تقریباً تمام کلام پر محیط ہے۔ جن لوگوں نے ضیا کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان ہے۔

فصیح الدین بلخی کے چھوٹے چھوٹے تنقیدی جملوں میں بڑی جامعیت ہوتی ہے۔ ضیاؔ مرحوم کے برادر نسبتی حافظ عبدالغنی مرحوم نے ایک تقریظ لکھی تھی جو دیوان ضیا کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس تقریظ میں کھٹکنے والی نمایاں کمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تقریظ اور قلمی مسودہ میں ضیاؔ کی خوش روئی اور جامہ زیبی کا ذکر ہے مگر
ان کا حلیہ نہیں بیان کیا گیا۔ تقریظ میں ضیاؔ کے فقیرانہ وضع اختیار کرنے
کا ذکر ہے مگر اس کا سبب نہیں بتایا گیا ہے۔ اس فروگذاشت نے
ساری تقریظ کو بے اصل اور لاحاصل بنادیا ہے۔

ان کے طرز تحریر سے ان کی صفائی طبع کا پتا چلتا ہے۔ بے لاگ انداز سے جو چیز کھٹکی اسے بیان کردیا۔ ان کا یہی طرز بیان ان کی اکثر تنقیدی عبارتوں میں ملتا ہے۔ عزیز الدین بلخی (رازؔ) عظیم آبادی پر مقالہ لکھتے وقت جب ان کی شاعری کا ذکر آیا تو لکھتے ہیں:

اردو میں اکثر مشکل زمین ایجاد کر کے طبع آزمائی کرتے تھے اور محاورہ
بندی کا بھی خیال رکھتے تھے۔

مشکل زمین ایجاد کرنا اور محاورہ بندی کا لحاظ رکھنا گویا رازؔ عظیم آبادی کے کلام کی بنیادی خصوصیتیں ہیں جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس اشارہ میں بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ وہ اظہار خیال میں کہیں بھی تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیتے۔

ان کے تنقیدی کارنامے جو اب منظر عام پر آچکے ہیں، ان میں سب سے اہم 'انشاد شاد' ہے جس میں شادؔ عظیم آبادی کے کلام پر فنی اور اصولی تنقید کی ہے۔ اس سلسلے میں کئی چیزیں قابل غور ہیں۔

فصیح الدین بلخی نے کلام شادؔ پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

کفر است درشریعت ماکینہ داشتن
آئین ماست سینہ چوآئینہ داشتن

ولیؔ صاحب اور حمید صاحب پرکار کی طرح ہر پھر کر دائرہ تلمیذ ہی میں
گردش کرتے ہیں اور میں آزادانہ قلم اٹھاتا ہوں۔ اس لیے میری اور
ان کی سرحدیں بالکل جداگانہ ہیں۔ میں فن کے معیار پر جانچ کر دکھانا
چاہتا ہوں کہ فنی حیثیت سے شادؔ کا کلام کیا ہے۔

میں نے قبل میں عرض کیا کہ تنقید کا معاملہ افہام وتفہیم کا معاملہ ہے۔ لہٰذا تنقید میں

دلیلوں خصوصاً روشن دلیلوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تنقید میں فصیح الدین بلخی کا انداز مدلل، موثر اور بے باک ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں روشن دلیلوں کے ساتھ کہتے ہیں:

شتر گربہ اور ضمائر کی عدم مطابقت قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے

عجب ہے کہ شاد صاحب فرماتے ہیں ؎

چلے جائیں گے ہم جو محفل سے تیری
کوئی اور میری جگہ آ رہے گا

ہم اور میری کیا۔

تنقیدی کا یہ انداز کس قدر مدلل، سادہ اور بے باک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے قاری کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل ان مسائل پر چوں کہ ان کا ذہن خود بہت صاف تھا اس لیے جو بات وہ کہتے تھے انتہائی صاف ستھرے انداز میں کہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے چند عنوانات قائم کر کے کلام شاد سے مثالیں پیش کی ہیں جن میں ''عامیانہ مذاق''، ''سوقیانہ انداز بیان''، ''زبان اور محاورہ کی غلطیاں'' تناقض، شتر گربہ، حشو وزواید، ردیف کا چسپاں نہ ہونا، زبان اور فن سے نا آشنا ہونا، سرقہ ... اہم عنوانات ہیں۔ انھیں کے ذیل میں کلام شاد کے فنی نقائص کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ تنقید اور طریقۂ تنقید کہاں تک درست ہے مجھ، ے صرف یہ دیکھنا ہے کہ تحریر کا انداز اور پیشکش کا طریقہ کتنا مدلل اور دل نشیں اور جاذب ہے۔ اور اس طریقے میں ان کے اسلوب کا کیا رنگ ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

شب آخر ہے ذرا غنچوں کو دیکھ اور خوش ہو اے بلبل
ترے نالوں سے کم بختوں کی چھاتی پھٹتی جاتی ہے (شادؔ)

یہ شعر شاد کے مایۂ ناز اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں کہ شاد نے اس کو نہایت شد و مد سے پڑھا تھا اور وہ خود اس کے مقابلہ میں غالبؔ کا شعر نقل کر کے فرماتے ہیں کہ غالبؔ کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا ہے مگر انصاف یہ ہے کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

غنچوں کو کم بخت کہنے کی کوئی وجہ نہیں اور 'چھاتی پھٹتی جاتی ہے، کی جگہ چھاتیاں پھٹتی ہیں، کہنا چاہیے تھا۔ اس شعر سے شاگردوں کی عقیدت مندی اور شاعر کی زبان دانی اور استادی کا بھرم کھل گیا۔''

پڑھے منکر بھی کلمہ دیکھ کر طرز رقم میرا
عصا موسیٰ نبی کا تیغ حیدر کی قلم میرا (شاد)

اس محل پر 'پڑھے' سے 'پڑھنے لگے' زیادہ فصیح ہوتا ہے اور موسیٰ نبی یا داؤد نبی شاید دیسی پادری بولتے ہوں اور اردوے معلی کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مطلع کا مضمون داغ کے مطلع دیوان سے اڑایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عدوے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصاے موسوی ہے حمد خالق میں قلم میرا

تعجب ہے کہ وحی صاحب، داغ کے مطلع کے متعلق فرماتے ہیں کہ شاد کے شعر کو نہیں پہنچتا۔ نبی کا لفظ محض بیکار اور مانع فصاحت ہے۔''

کھلا ہے بام پر جوڑا کسی کے جعد مشکین کا
کہ مجھ تک بوے گیسو کا رواں در کارواں پہنچی

بام اور جوڑا اور جعد اور گیسو اور کارواں در کاروں محض الفاظ ہیں۔ الفاظ میں حقیقتاً شاعر نے وحید الہ آبادی کے شعر کو غارت کیا ہے۔ قادر الکلام شاعر نے اپنے مضمون کو کس خوبی سے نظم کیا تھا۔ مقابلہ کرنے سے ناقص اور کامل کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

معطر ہے اسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی
کہاں کھولی ہیں زلفیں یار نے خوشبو کہاں تک ہے

'انشاد شاد' میں اس قسم کی بہتیری مثالیں ہیں۔ یہ طرز واسلوب نہ صرف یہ کہ مدلل ہے، قابل قبول اور قریب الفہم بھی ہے۔

تنقید نگاری میں فصیح الدین بلخی کے طرز بیان کی ایک خوبی یہ ہے کہ جا بہ جا فنی اور شعری بحث بھی آگئی ہے۔ ان فنی اور اصولی نکتوں کو انھوں نے بڑی خوبی سے ذہن نشین کرانے کی

کوششیں کی ہیں۔ ایسی عبارتیں اگرچہ بہت کم اور بہت مختصر ہیں۔ ان کی صفائی، سادگی اور جامعیت بڑی قابل قدر چیزیں ہیں۔ لکھتے ہیں:

> فنی بلاغت سے واقفیت رکھنے والا جانتا ہے کہ تشبیہ و استعارہ کی خوبی ولطافت وجہ تشبیہ یا وجہ جامع کے لوازمات ومناسبات ملحوظ رکھنے پر منحصر ہوتی ہے۔ سکا کی کا قول ہے کہ جس شعر کے معنی بیان کرنے میں تاویل کی حاجت ہو، وہ بے معنی ہے۔" اصلاح کے اعتبار سے کلام میں قریب المخرج حروف کے جمع ہونے سے تلفظ میں جو کراہیت ہوتی ہے اس کو تنافر کہتے ہیں۔

'انشاد شاد' میں اس قسم کے جملے جن سے کوئی نہ کوئی فنی اور اصطلاحی واقفیت ہوتی ہے، بہ کثرت ہیں۔ فنی اور اصطلاحی بحثیں عموماً خشک ہوتی ہیں، پڑھنے کے بعد سمجھ میں فوراً نہیں آتیں۔ ان بحثوں میں بعض مصنفین کا انداز بیان اس قدر ثقیل اور دیر فہم ہوتا ہے جیسے یہ تحریریں سمجھنے سمجھانے کے لیے لکھی ہی نہیں گئی ہیں۔ فصیح الدین بلخی کا اسلوب سمجھنے سمجھانے کا اسلوب ہے۔ ان کا طرز بیان مقصدی ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ قاری کو ان کے بیانات سے جو مدلل ہوتے ہیں، مطمئن ہونا پڑتا ہے۔

> وہ (حمید صاحب) صفحہ (ک) میں فرماتے ہیں کہ جہاں تک زبان کا علق ہے ان کا (یعنی شاد کا) طرز ادا میر انیس سے کسی طرح کم نہیں۔ کیا اس بیان سے میر انیس کی توہین نہیں ہوتی ہے؟ شاد ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشق شاعر تھے، ان کو استاد فن میر انیس کا ہمسر کہنا یا بلاغت میں غالب سے برتر اور سلاست زبان میں داغ سے بہتر قرار دنیا، سراسر لغو و مضحکہ خیز بات۔

'انشاد شاد' میں فصیح الدین بلخی نے شاد کے کلام پر جتنی بھی فنی تنقیدیں کی ہیں، وہ سب مدلل، بے باک، صاف اور سمجھ میں آنے والی ہیں۔ ادبی تنقید کے لیے فنی نکات سے گہرے طور پر واقف ہونا ناقدین کے لیے ضروری ہے مثلاً اردو شاعری یا اردو کے کسی شاعر کے کلام کو

دائرۂ تنقید میں لینے کے لیے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ شاعری کے موضوعات سے بحث کی جائے یا نظریاتی بحث چھیڑی جائے بلکہ فن عروض اور فن بلاغت سے گہری واقفیت بھی اس ضمن میں ناقد کے لیے شرط اولین ہے۔ آج کل عام طور پر تنقید نگار ان فنون سے ناواقف ہیں جس کے نتیجے میں ادبی تنقید محض ذاتی پسند وناپسند، ادبی نظریات یا کسی مخصوص فن کار کی تنقیص ہوکر رہ جاتی ہے۔ فصیح الدین بلخی نے کلام شاد پر قلم اٹھاتے وقت واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ ان کی مراد شاد کی تحقیر نہیں، بلکہ ان نکات کی عقدہ کشائی ہے جن کی عدم واقفیت کے سبب بڑے سے بڑا فن کار بھی قدم قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ ان کے طرز واسلوب کا یہ کمال ہے کہ وہ فنون بلاغت وعروض کی خشکی کے احساس سے قاری کے ذہن کو دور رکھتے ہیں۔ وہ کلام کی برمحل اصلاح کر کے اس کے ذہن کو اپنی تحریر کی جانب متوجہ کر لیتے ہیں اور اپنی جادو بیانی سے قارئین کو عروض وبلاغت کی اصطلاحوں کا واقف کار بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

”کرے کیا کہ انسان مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے (مثنوی شوق)

غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا
زمین کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا (شادؔ)

مضمون اڑا لینے پر بھی شعر مہمل کہا ہے۔ فلک تو دور ہے اس کے لیے ’دور ہو جانا‘ کیا۔“

”ادھر سے بھی کسی دن وہ سراپا ناز آ نکلے
کبھی ہم سے غریبوں کے بھی دل کا حوصلہ نکلے

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں لفظ ’سے‘ وزن پورا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔“

”جو اپنے شاد کو ڈھونڈے گا تو تو وہ بھی وہیں
غزل سرا کسی گوشے میں قبلہ رو ہوگا

لفظ ’وہیں‘ سے کون سا مقام مراد ہے، شعر سے پتا نہیں چلتا۔“

”آئے تھے دم نزع وہ اے روز قیامت
اس روز زیارت ہوئی یا آج کی تاریخ

’کی تاریخ‘ حشو قبیح ہے اس سے مصرع مہمل ہو گیا۔‘‘

’’اسی کے واسطے چنتا پھروں تنکے زمانے میں
کڑکتی گر پڑے بجلی الٰہی آشیانے میں

مصرعۂ ثانی کی ردیف غلط ہے ’آشیانے پر بجلی گر پڑے‘، بولتے ہیں۔‘‘

اس قسم کی اور مثالیں جا بہ جا مضمون کے درمیان سے ضرورتاً پیش کی جا چکی ہیں، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

فصیح الدین بلخی نے طرز و اسلوب کے معاملے میں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور سرسید تحریک تینوں مراکز ادب کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے۔ ان کے انداز بیان میں بے باکی، صفائی اور انصاف پسندی، پاکیزگی اور لطافت اپنے خاندان کی صوفیانہ، درویشانہ اور روحانی روایتوں سے پیدا ہوئی۔ ان کے طرز و اسلوب میں ان کی شخصیت کی پوری جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں جس قدر صاف گو، پاکیزہ اور لطیف تھے، ان کی نثر بھی اسی قدر صاف، پاکیزہ اور لطیف ہے۔ ان کی تحریر میں جو صوفیانہ گداز اور روحانی تابندگی ہے وہ ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ان کی شخصیت کا مادی وجود اگرچہ اس خاکدان ہست و بود میں نہیں تاہم:

تا حشر نمیرند شہیدان زتمنا
آبِ دَم شمشیر تو تاثیر دگر داشت

☆☆☆

فصیح الدین بلخی کی کتاب ''فارسی ٹرانسلیشن و کمپوزیشن'' کا سرورق

فصیح الدین بلخی کا تصوف

فصیح الدین بلخی (۱۸۸۵- ۱۹۶۲ء) ایک مستند مورخ اور بالغ نظر تذکرہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنی علمی اور تحقیقی کارکردگی کا لوہا دور دور تک منوایا۔ ادب، تنقید، کتبہ شناسی اور تاریخ پر ان کی وقیع اور گراں قدر تالیفات وتصنیفات ہیں۔ ان کی رنگارنگ صلاحیتوں میں شعری قدرت کلام کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی غزلیں بہت کم ہیں بلکہ ان کا شعری سرمایہ ہی بہت کم ہے لیکن جو کچھ ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ وہ روایتی شاعر تھے اور اساتذہ کا تتبع اپنے فن کا انتہائی کمال سمجھتے تھے۔ وہ خود اپنی شاعری کو کسی کی جوٹھی شراب سے تعبیر کرتے ہیں:

مجھ کو ملی شراب وہ دور اخیر میں
جوٹھی کسی کی بچ کے جو ساغر میں رہ گئی

ان کی غزلوں میں حسن تغزل بھی ہے اور عصری معیار کے اعتبار سے وسیع تر تغزل کا میدان بھی:

کس کس طرح سے ہم نے چھپایا ہے راز دل
داد اس کی تجھ سے پردہ نشیں مل ہی جائے گی

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز
پابند وہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی

کٹوائیں سر کہ دل کو کریں نذر امتحاں
گردن کو ہم جھکائیں کہ سینہ سپر کریں

کیا لطف زندگی کا کوئی آرزو نہ ہو
پہلو میں دل تو دل میں تمنا بھی چاہیے

رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترچھی نگاہ سے
الٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا

زندہ ہمیں سے نام ہے فرہاد وقیس کا
اب ان کے بعد ذکر ہمارا بھی چاہیے

کبھی کبھی وہ اپنے حسن تغزل کی زمین کو آسمان سے ملا دیتے ہیں:

یوں خاک میں جو چاند سی ملتی ہیں صورتیں
اک روز آسماں سے زمیں مل ہی جائے گی

لیکن فصیح الدین بلخی کا فکری دھارا بنیادی حیثیت سے تصوف کی طرف مائل ہے۔ وہ اپنے تغزل میں قناعت وتوکل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے:

راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

ان کا تصوف خشک اور بوسیدہ بھی نہیں ہے بلکہ توازن حیات کے لیے لذت دنیا سے بہرہ مند ہونا ضروری سمجھتے ہیں:

مانا کہ زہد وطاعت وتقوا بھی چاہیے
دنیا میں کچھ تو لذت دنیا بھی چاہیے

بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر وسیع تر جدوجہد کا میدان خود ہی متعین کرتے ہیں خواہ وہ جوابی اقدام ہی کیوں نہ ہو۔

سیدھی طرح نہ مانیں گے ہرگز دغاشعار
کچھ مکر بھی فریب بھی دھوکا بھی چاہیے

تمام ارباب تصوف نے اپنا سلسلہ حضرت علی (ع) تک منتہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اہم مشایخ نے اپنے اقوال وملفوظات میں حضرت علی کے ارشادات کی خوشہ چینی کی ہے خاص طور سے دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں ارباب تصوف کی باتیں حضرت علی ہی سے اکتساب فیض معلوم ہوتی ہیں۔آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا ہے:

(ترجمہ) ''میں اس دار دنیا کی حالت کیا بیان کروں جس کی ابتدا رنج ہے اور انتہا فنا ہے۔جس کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عقاب ہے۔ یہاں جو غنی ہے اسے فتنوں سے واسطہ ہے اور فقیر ہو تو حزن وملال سے سابقہ ہے جو دنیا کے لیے سعی وکوشش سے ہاتھ اٹھالیتا ہے تو دنیا خود ہی اس سے سازگار ہوجاتی ہے۔ جو شخص دنیا کو عبرتوں کا آئینہ سمجھ کر دیکھتا ہے تو وہ اس کی آنکھوں کو روشن اور بینا بنا دیتی ہے اور جو صرف دنیا ہی پر نظر رکھتا ہے تو وہ اسے بالکل اندھا بنا دیتی ہے۔''

(نہج البلاغہ خطبہ ۸۰)

اس کے علاوہ بھی حضرت علی نے دنیا کے بارے میں رونگٹے کھڑے کردینے والے بیان کے ذریعہ دنیا پرستوں کو چونکایا ہے۔ظاہر ہے کہ ارباب تصوف کا مرجع حضرت علی اوران کے ارشادات تھے۔وہ انھیں کیسے نظر انداز کرسکتے تھے۔فصیح الدین بلخی کہتے ہیں:

کیا عمر جاوداں کی تمنا خضر کریں   دو دن کی زندگی بھی ہمیں تو وبال ہے
میری طرف بھی اہل نظر اک نظر کریں   میں بھی نگاہ شوق کا آئینہ دار ہوں

حضرت علی نے ایک خطبے میں موت سے عبرت دلاتے ہوئے نصیحت فرمائی ہے کہ:

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ موت کو یاد رکھو اور اس سے اپنی غفلت کو کم کرو اور آخر کیونکر تم اس سے غفلت میں پڑے ہو جو تم سے غافل نہیں... تمہیں عبرت دلانے کے لیے وہی مرنے والے کافی ہیں کہ جنھیں تم دیکھتے رہے ہو۔انھیں کندھوں پر لاد کر قبروں پر لے جایا گیا حالانکہ وہ خود سوار نہیں ہوسکتے تھے اور انھیں قبروں میں اتار دیا گیا حالانکہ خود اترنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے...''

فصیح الدین بلخی کا یہ شعر بھی اس کے بعد ملاحظہ ہو:

گھر سے اٹھا کے لاتے ہیں احباب دوش پر
منزل سے حسیں راہگذر ہی زیادہ ہے

وہ تصوف کی جن وادیوں میں گرم خرام ہوتے ہیں وہ تعمیری ہیں خواہ وہ فکری ہوں یا عملی، داخلی ہوں یا آفاقی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے ملفوظات کا غائر مطالعہ کیا ہے جنھوں نے طریقت و شریعت کے امتزاج کی بات کہی ہے اور طریقت کے ملحدانہ تصورات کو مسترد کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار لائق توجہ ہیں:

مثل حباب غرق ہوئے بحر عشق میں ۔۔۔ پانی کی بوند مل کے سمندر میں رہ گئی
چھٹتا ہے کوئی عالم بالا سے واسطہ ۔۔۔ خاکی نژاد خاک کے اندر ہی کیوں نہ جائے
مشق فنا سرشت میں اپنی ازل سے ہے ۔۔۔ عمر ابد بھی ہو تو یہی عمر بھر کریں
تیری گلی کی سیر بھی ہے لامکاں کی سیر ۔۔۔ رستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک سفر کریں
سیری نہ ہوگی عالم ہستی کی سیر سے ۔۔۔ اپنا سفر مکان سے تا لامکاں رہے
کیوں جائیں کوہ طور پہ دیدار کے لیے ۔۔۔ دل میں نہ دیکھ لیں گے ہم اس کا جمال کیا؟
وہ کیا جانے سیر چمن کی حقیقت ۔۔۔ جسے لطف صحرا بھی حاصل نہیں ہے

فصیح الدین بلخی کی متصوفانہ شاعری میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے ان کے صفائے نفس کا ثبوت ملتا ہے بلکہ تصوف کے مختلف گروہوں پر ان کے تلخ تبصرے بھی نظر آجاتے ہیں۔ 'عشاقیہ' پر ان کا طنزیہ شعر ملاحظہ ہو:

میں انجمن میں شمع کا پروانہ کیوں بنوں
کیوں اس سے لو لگاؤں جو صورت حرام ہے

☆☆☆

ڈاکٹر مظفر بلخی

فصیح الدین بلخی بہ حیثیت شاعر

فصیح الدین بلخی مرحوم نے ادبی دنیا میں شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ادب میں شعری صنف سے زیادہ نثری صنف کی طرف توجہ کی بلکہ یوں کہئے کہ انھوں نے دنیائے ادب میں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کی لیکن بلخی صاحب مرحوم نقد شعر و سخن کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کے تمام رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ فن عروض اور فن بلاغت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں خود بھی شعرا کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم کے تینوں بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم، جناب عزیز الدین بلخی رازؔ عظیم آبادی مرحوم اور جناب نظام الدین بلخی مرحوم داغؔ دہلوی کے اچھے شاگردوں میں تھے۔

آج کے مرحوم عظیم آباد میں کل کا بخشی محلہ علم و ادب کا گہوارہ تھا، بخشی محلہ میں شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں، غالبؔ دہلوی کے شاگرد جناب فخر الدین سخنؔ ثم دہلوی عظیم آبادی یہاں آکر اس طرح مقیم ہوئے کہ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ گویا اس ادبی ماحول میں بلخی صاحب مرحوم نے آنکھ کھولی۔ جناب عبدالرؤف ندوی مرحوم نے بلخی صاحب مرحوم کی شاعری سے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:

> آپ کو شعر گوئی سے بھی مذاق تھا اور پاکیزہ مذاق تھا مگر اصناف شاعری میں قطعات اور تاریخی قطعات پر طبع آزمائی کرتے میں نے پایا ہے...
>
> آپ کے مذاق شاعری اور نقد شعر و سخن کا اندازہ آپ کے کتابچہ 'انشاد شاد' سے ہوسکتا ہے کہ استاد الشعر، شادؔ عظیم آبادی کی ظاہری و باطنی، معنوی معائب و محاسن کی جزوی گرفت کی گئی ہے۔ اس کے معیار' پر اساتذہ

سخن کے کلام بھی نہیں اترتے ہیں۔ (۱)

اس کے علاوہ بلخی صاحب مرحوم نے عظیم آباد کی شعری محفلیں دیکھیں۔ انھوں نے شادؔ عظیم آبادی اور 'لپینچ' کے جھگڑے دیکھے۔ شعرا کی معاصرانہ چشمکیں دیکھیں، عظیم آباد کے نامی گرامی مشاعروں میں شرکت کرنے کے موقعے انہیں ملے، چنانچہ یہ شاعرانہ فضا بلخی صاحب مرحوم کو شاعر کی حیثیت سے ابھرنے میں کارآمد اور کارساز ثابت ہوئی۔

فصیح الدین بلخی مرحوم نے شاعری میں اپنے ابتدائی دور میں کس سے اصلاح لی، یہ کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں کسی سے بھی اصلاح نہ لی ہو۔ بہر کیف ان کے کلام میں داغؔ دہلوی اور میر انیس کی گہری چھاپ ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم غالبؔ کے رنگ میں شعر کہتے تھے اور منجھلے بھائی رازؔ بلخی ناسخ کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے، جہاں تک ان کے سنجھلے بھائی کا تعلق ہے جناب نظام الدین بلخی مرحوم باضابطہ طور پر داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔

بلخی صاحب مرحوم کا کلام بہت ہی مختصر ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ تلف ہوگیا۔ تلف ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی بیاض محلہ گذری پٹنہ سیٹی کے مکان سے چوری ہوگئی۔ ان کا کلام جو کچھ بچا ہے وہ ان کی یادداشت کا نتیجہ ہے۔

جناب مہجورؔ شمسی اور جناب کیول کرشن شرما کی بدولت ان کا کلام تھوڑا بہت محفوظ ہوسکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات سے ایک سال پیشتر اپنے صاحبزادے (نادم بلخی) کے یہاں ڈالٹن گنج تشریف لائے تھے۔ چنانچہ ان دونوں حضرات کے بارہا اصرار پر ان کی یادداشت میں جو کچھ محفوظ تھا، وہ کلام آج موجود ہے۔ بہرحال بلخی صاحب مرحوم کے مختصر سے کلام کی روشنی میں ان کے کلام کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

بلخی صاحب مرحوم کے کلام کی جہاں تک خصوصیت ہے، ان کا کلام ابتذال مضامین اور سوقیانہ پن سے بالکل پاک ہے۔ جہاں تک ان کے کلام کا تعلق ہے ان کے کلام میں میر انیسؔ اور داغؔ کی فصاحت نمایاں طور پر موجود ہے یعنی بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا بہترین نمونہ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز ‏ پابند وہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی

اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن ‏ مٹتی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی

دل پر ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے ‏ تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے

بہتر ہے صاجی سے قناعت کی زندگی ‏ گوشہ میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں

شعرائے عظیم آباد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے میر کے رنگ وآہنگ کو بھی اپنے کلام میں برتا ہے۔ راسخ، جوشش، تپاں اور سجاد ان شعرا نے میر کے کلام کے گہرے رنگ کو قبول کیا۔ ضیا عظیم آبادی تو بالکل میر ثانی ہیں اور آج بھی ان کے مشہور شعر کو میر کے شعر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شعر یہ ہے:

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

یہاں تک کہ شعرائے متاخرین کے کلام میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر ملتی ہے۔ بلخی صاحب مرحوم کا جس دور سے تعلق ہے، اس دور کے بھی شعرا نے میر ہی کے رنگ کو اپنے کلام میں نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور شاد عظیم آبادی، ضیا عظیم آبادی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، مشرقی منیری، باقر عظیم آبادی، اکبر داناپوری، مرزا یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ شعرا کے کلام میں میر کا رنگ موجود ہے۔ بہرحال بلخی صاحب مرحوم نے بھی میر کے رنگ کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں دل کی آرزو دل مضطر میں رہ گئی ‏ آندھی سی اٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی

حکمت میں گرچہ ہم بھی فلاطوں سے کم نہیں ‏ کیا کیجئے کمی جو مقدر میں رہ گئی

یہاں تک کہ شاعر کی بھی خواہش ہے کہ مرنے کے بعد اس کا نام ونمود دنیا میں برقرار نہ رہے چنانچہ بلخی صاحب مرحوم نے کس قدر سلیس شعر کے ڈھانچے میں ڈھالا ہے:

اس کی کسے ہوس ہے کہ نام ونشاں رہے

دنیا میں میں رہوں نہ میری داستاں رہے

انسان کو مرنے ہی کے بعد چین وسکون نصیب ہوتا ہے کیونکہ اس دنیا میں راحت

نصیب نہیں ہوتی اور مرنے کے بعد انسان کو دوگز زمین بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔
اس مضمون کو بلخی صاحب مرحوم نے یوں پیش کیا ہے:

راحت ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دوگز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

بلخی صاحب مرحوم کے کلام میں بے ثباتی عالم کا بھی حال ملتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کا شاعر بے ثباتی عالم کا رونا روتا ہے چنانچہ اردو شاعری میں میرؔ یا غالبؔ یا آتشؔ یا اقبال جیسے شعرا کے کلام میں بے ثباتی عالم کا حال ملتا ہے۔ بہر حال بلخی صاحب مرحوم کی بھی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی۔ اس خاک نے بڑے بڑے شاہان نامور کو اپنی آغوش میں سلادیا۔ آج نہ شہنشاہ اکبر کی سطوت ہے نہ شاہجہاں کی امارت۔ بہر حال شاعر اس مضمون کو یوں پیش کرتا ہے:

کیا کیا ملے ہیں خاک میں شاہان نامور
اکبر رہے جہاں میں نہ شاہجہاں رہے

چنانچہ مرنے کے بعد لحد میں کسی انسان کا استخواں بھی باقی نہیں رہتا خواہ کسی کا مقبرہ تاج محل جیسا کیوں نہ ہو بقول شاعر:

روئے زمین پہ تاج محل بھی بنا تو کیا
باقی نہ جب لحد میں کوئی استخواں رہے

موت کے سامنے رستم جیسے مشہور پہلوان کا بھی زور نہیں چلتا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو بہت عاجزی وانکساری کی زندگی گذارنی چاہئے:

پیک اجل کے سامنے رستم کا زور کیا
میں یوں رہوں کہ جیسے کوئی ناتواں رہے

اس دنیا میں انسان بہت کچھ کمال حاصل کرتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا زوال بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے:

دور فلک میں کیجئے حاصل کمال کیا
ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا

بلخی صاحب مرحوم کی بعض غزلوں کے اشعار ایسے بھی ہیں جن میں نظم ونثر کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر:

دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف — دشمن ہمارے کر گئے سب انتقال کیا

پیری میں کیا کروں ہوس عشق و عاشقی — بجھتے ہوئے چراغ کو دوں اشتعال کیا

رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترچھی نگاہ سے — الٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا

خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے — آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

بلخی صاحب مرحوم اپنے دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی مشاعروں میں بھی اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے۔ اس کی دو مثالیں پیش ہیں۔

محمڈن اسکول کے ہڈ ماسٹر جناب سید انوار کریم علم دوست انسان تھے۔ ان کی علم دوستی کا حال یہ تھا کہ محمڈن اسکول پٹنہ سیٹی میں برابر محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی لہٰذا بلخی صاحب مرحوم نے اپنی ایک طرحی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی تھی، اس غزل کا مطلع یہ ہے:

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں
اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے:

دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیحؔ
پیش نظر ہو عیب جو عرض ہنر کریں

دوسری مثال یہ ہے کہ بلخی صاحب مرحوم اپنی وفات کے ایک سال پیشتر اپنے صاحبزادے پروفیسر نادم بلخی کے یہاں تشریف لائے تھے۔ چنانچہ حلقۂ شعر وسخن ڈالٹین گنج کے پچیسویں طرحی مشاعرہ میں دو طرحی غزلیں بلخی صاحب نے پڑھی تھیں اور یہ دونوں غزلیں بلخی صاحب مرحوم کی آخری غزلیں ہیں۔ یہ مشاعرہ بلخی صاحب مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا اور یہ دونوں طرحی غزلیں بلخی صاحب مرحوم نے جناب مجبور شمسی کے اصرار پر کہی تھیں۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا
اپنے کئے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا

اور اس غزل کا مقطع یہ ہے:

دور فلک میں عیش میسر ہو گر فصیحؔ
اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہ وسال کیا

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے:

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو
پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو

اس غزل کا مقطع یہ ہے:

اپنی زبان پہ حرف نہ آئے کبھی فصیحؔ
روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

بلخی صاحب مرحوم فن شاعری کے رموز ونکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شادؔ عظیم آبادی جیسے مشہور شاعر کے کلام کی فنی خامیاں اپنے کتابچہ 'انشاد شادؔ' میں پیش کی ہیں۔

بلخی صاحب مرحوم سے اکثر معتقدین شعرا مشورہ سخن کرتے تھے۔ چنانچہ دور جدید کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم کا خود قول ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں بلخی صاحب مرحوم سے مشورہ سخن کیا تھا اور حسن نعیم کا یہ بھی قول ہے کہ آج اردو شاعری میں جو انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے وہ بلخی صاحب کی دین ہے۔

جناب وفاؔ براہی بھی اکثر ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مثال کے طور پر داغؔ دہلوی کے نامور شاگرد جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی اپنی کوئی غزل بھی بغیر بلخی صاحب مرحوم کو دکھائے ہوئے نہیں پڑھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی صحبت کے باعث بلخی صاحب مرحوم نے داغؔ کی شاعری کا گہرا رنگ قبول کیا اور بلخی صاحب مرحوم کا ہر شعر بالکل داغؔ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، اردو شاعری میں میر انیسؔ اور داغ دہلوی فصاحت کے بادشاہ ہیں، بلخی صاحب کی غزلوں کا ہر شعر فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے' بہر حال بلخی صاحب مرحوم نے اپنی شاعری میں میر انیسؔ اور داغؔ دہلوی کے رنگ کو قبول کیا۔

بلخی صاحب مرحوم فن شاعری میں تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے، جہاں تک کہ صوبہ

بہار میں شاعری میں تاریخ گوئی کا سوال ہے، اس فن میں جناب بسمل سنسہاروی مرحوم اور نواب محمد تقی جان قمر گیادی مرحوم اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ لہٰذا بلخی صاحب مرحوم کے کچھ حاصل شدہ تاریخی قطعات درج کئے جاتے ہیں۔ بلخی صاحب مرحوم نے اپنے بڑے بھائی جناب حفیظ الدین بلخی مرحوم کے لوح مزار کے کتبہ کا تاریخی قطعہ کہا تھا، یہ تاریخی قطعہ فارسی زبان میں ہے، جو درج ذیل ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات برائے لوح مزار حضرت حفیظ الدین بلخی مرحوم

سرہانہ: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

جاں بجاں آفریں سپرد آخر — آں کریمے کہ بود مرد سخن

رونق خاندان حفیظ الدین — صاحب فضل بلخی نامی

زآنکہ از نسل براہیم بود — نسل ظاہر شرافت نسبی

کان احسان معدن اخلاص — شمع فیض ومجمع خوبی

ذی مروت، خلیق، دریا دل — صاحب جود ہمت عالی

نکتہ دان وادیب دانشمند — ماہر علم وفن فہیم وذکی

قائل لا الہ الا اللہ — پیروِ دین حق، محب نبی

مسجد کہنہ در وطن نوکرد — از برائے رضائے رب قوی

رفت از مرگ او سر ور دلم — گم شد از دل نشان زندہ دلی

زور بازوی من اجل بشکست — دور ماندم زبے پر وبالی

سال فوتش دل حزین فصیح

گفت: فردوس آشیاں بلخی

۱۳۵۴ھ

قطعۂ تاریخ وفات برائے لوح مزار جناب سید جمال الدین بلخی وکیل

عزیز ما جمال الدین بلخی — لئیق وحق شنا وفیض گستر

حلیم نیکخو، پاک طینت — فہیم وصاحب ادراک جوہر

پئے گلگشت جنت رفت ازیں جا — بفردوس بریں از دار ششدر

زمرگ او دل احباب پژمرد | چو گل درگلستاں از بادِ صرصر
بجست از دل چو تاریخ وفاتش | فصیحؔ عاجز و غمگین و مضطر
بقصر الخلد شد گفتا سن فوت | 'غم ایں مرگ' ہم تاریخ دیگر

۱۳۶۱ھ

جناب سید عبدالرؤف ندوی مرحوم نے اپنے مقالہ ''فصیح الدین بلخی کی عظیم شخصیت'' میں بلخی صاحب مرحوم کے دو تاریخی قطعات کو درج کیا ہے۔ اول الذکر تاریخی قطعہ ان کے براور اکبر سید حفیظ الدین بلخی مرحوم کا اور دوم قطعہ تاریخ جامع مسجد اورنگ آباد کا ہے۔

سرنامہ قطعہ ان المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا

درزمان سید حامی دیں | شاہ اورنگ زیب عالمگیر
خان والا گہر فدائی خاں | از برائے رضائے رب قدیر
برسر راہ مسجد جامع | ساخت بہر نمازیان کثیر
دل 'عبادت گہہ خدا' گفتا | پئے سال بنائے ایں تعمیر

۱۰۷۷ھ

جناب مولوی احمد اللہ ندوی مصنف تذکرہ مسلم شعرائے بہار نے جلد سوم میں فصیح الدین بلخی مرحوم کا ذکر شدومد کے ساتھ کیا ہے۔ موصوف نے نادم بلخی کے مجموعہ کلام'' آغاز سحر'' کے مقدمہ کے حوالے سے کیا ہے، اس مقدمہ کو حضرت مہجور شمسی مرحوم نے سپرد قلم کیا ہے۔ احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کے ضمن میں یوں لکھا ہے:

> فصیح الدین نام فصیح تخلص نسبی نسبت ہے، والد ماجد کا نام ڈاکٹر غیاث الدین بلخی ہے۔ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے اور اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ۱۸۸۵ء سال ولادت ہے اور ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء بہ عمر ۷۷ سال داعی اجل کو لبیک کہا۔

جناب فصیح الدین بلخی مرحوم تاریخ نگاری، تذکرہ نویسی اور تخلیق زبان وادب کے کمال کی بدولت نہ صرف صوبہ بہار بلکہ پورے پاک وہند میں متعارف تھے۔

موصوف کی تصنیفات میں 'تاریخ مگدھ' مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہے ۶۴۲ ق م سے ۱۹۴۳ء تک کی کامل تاریخ میں ہے۔ دوسری کتاب 'تذکرہ نسوان ہند' ہے جس میں متحدہ ہندوستان کی پانچ سو خواتین یعنی شاعرات، مصنفات، کاملات، شہیرات اور مقدسات کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ ہندو شعرائے بہار، اور ان کے علاوہ بعض کتابیں موسوم بہ دستور سخن اور رسالہ تذکیر و تانیث کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عنقریب شائع ہونے والی ہیں، ایک تنقیدی رسالہ انشاد شاد بھی شائع ہو چکا ہے، حکومت پاکستان کے ایما سے پنجاب یونیورسٹی نے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ترتیب دیا ہے اس میں غلام یحیٰ بہاری اور نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے حالات یونیورسٹی نے آپ ہی سے لکھوائے ہیں۔

اس کے بعد مولوی احمد اللہ ندوی نے بلخی صاحب مرحوم کی غزلوں کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ مختصر یہ کہ بلخی صاحب مرحوم کے کلام کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک روایتی شاعر تھے اور اساتذہ کی قدیم روایت کو اپنے کلام میں بحسن و خوبی پیش کیا کرتے تھے۔

غزل

(۱)

یوں دل کی آرزو دل مضطر میں رہ گئی — آندھی سی اُٹھ کے گنبد بے در میں رہ گئی

مجھ کو ملی شراب وہ، دور اخیر میں — جوٹھی کسی کی بچ کے جو ساغر میں رہ گئی

مجھ سخت جاں پہ چل نہ سکی تیری تیغ تیز — پابندوہ بھی حلقۂ جوہر میں رہ گئی

مثل حباب غرق ہوئے بحر عشق میں — پانی کی بوند مل کے سمندر میں رہ گئی

حکمت میں گرچہ ہم بھی فلاطوں سے کم نہیں — کیا کیجئے کمی جو مقدر میں رہ گئی

اس فتنہ گر سے بڑھ کے قیامت نہ چل سکی — اٹھ اُٹھ کے وہ بھی ایک ہی ٹھوکر میں رہ گئی

دل امتحان بوئے وفا میں تو جل گیا — خوشبو کسی کی زلف معنبر میں رہ گئی

گل ہائے رنگ رنگ سمجھتے تھے لاجواب — دیکھا تو اک نہ ایک کمی ہر میں رہ گئی

اب تک ہے نقش دل پہ ترے غیر کا سخن — مٹتی نہیں لکیر جو پتھر میں رہ گئی

کھلتی نہیں فصیح حقیقت جہان کی — مانند چرخ عقل بھی چکر میں رہ گئی

(۲)

وہ بے وفا کہیں گے کوئی مر ہی کیوں نہ جاے
الفت جتائے جائیں گے ہم سر ہی کیوں نہ جاے

جاتی ہے جان مال کے جانے کا ذکر کیا
لعل و زمرد وزروگوہر ہی کیوں نہ جاے

معراج ہے اسیر قفس کے لیے یہ سیر
صحن چمن میں اڑ کے کوئی پر ہی کیوں نہ جاے

نقل مکاں نہیں یہ قیامت کا ہے سفر
اِس گھر کو چھوڑ کر کوئی اُس گھر ہی کیوں نہ جاے

چھٹتا ہے کوئی عالم بالا سے واسطہ
خاکی نژاد خاک کے اندر ہی کیوں نہ جاے

واعظ کو ذکر کوثر وتسنیم سے ہے کام
ہر چند آبرو سرمنبر ہی کیوں نہ جاے

سنتا ہے کون سحر بیانی وہاں فصیح
ہر چند سیکھ کر کوئی منتر ہی کیوں نہ جاے

(۳)

راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جاے گی
دوگز کسی گلی میں زمیں مل ہی جاے گی

میں شوق جبہ سائی میں در تک پہنچ تو لوں
اُس سنگ آستاں سے جبیں مل ہی جاے گی

یوں خاک میں جو چاندسی ملتی ہیں صورتیں
اِک روز آسماں سے زمیں مل ہی جاے گی

کس کس طرح سے ہم نے چھپایا ہے رازِ عشق
داد اس کی تجھ سے پردہ نشیں مل ہی جاے گی

ہاں اپنے دل میں حوصلۂ عشق چاہیے
صورت کوئی حسیں سے حسیں مل ہی جاے گی

راحت ملی نہ روئے زمیں پر کہیں فصیح
کیوں کر کہیں کہ زیر زمیں مل ہی جاے گی

(۴)

دل پر ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے
تھوڑا بھی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے

کیا کم یہ فائدہ تھا کہ دشمن نہ تھا کوئی
نقصان عیب سے بھی ہنر میں زیادہ ہے

راحت بھی میرے حق میں جراحت سے کم نہیں
جب دل میں درد کم ہے جگر میں زیادہ ہے

اچھے رہے جو عشق میں بے خانماں ہوئے
ایسوں کی قدر آپ کے گھر میں زیادہ ہے

گھر سے اٹھا کے لاتے ہیں احباب دوش پر
منزل سے چین راہ گذر میں زیادہ ہے

عمر گذشتہ کو ہمیں رونا ہے عمر بھر
آنسو بھی سے دیدۂ تر میں زیادہ ہے

انسان اس جہاں میں برابر ہیں سب فصیحؔ
کم ہے نہ کوئی اپنی نظر میں زیادہ ہے

(۵)

طول شب فراق کا شکوہ اگر کریں
اک رات ہی میں عمر ہم اپنی بسر کریں

بہتر ہے صاحبی سے قناعت کی زندگی
گوشے میں چھپ کے عمر ہم اپنی بسر کریں

کٹوائیں سر کہ دل کو کریں نذر امتحان
گردن کو ہم جھکائیں کہ سینہ سپر کریں

میں بھی نگاہ شوق کا آئینہ دار ہوں
میری طرف بھی اہل نظر اک نظر کریں

دیکھا ادھر تو شکر کیا اس نگاہ کا
دل خوش نہ ہو تو سیر جہاں اک وبال ہے
قائل ہیں یوں تو ہم بھی کہ واعظ ہے خوش بیاں
مشق فنا سرشت میں اپنی ازل سے ہے
دو دن کی زندگی بھی ہمیں تو وبال ہے
تیری گلی کی سیر بھی ہے لامکاں کی سیر
دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیحؔ
کس منہ سے ہم شکایت درد جگر کریں
گذریں ہزار رنج جہاں ہم گزر کریں
باتیں وہ کام کی ہیں جو دل پر اثر کریں

عمرابد بھی ہوتو یہی عمر بھر کریں
کیا عمر جاودان کی تمنا خضر کریں
رستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک سفر کریں
پیش نظر ہو عیب جو عرض ہنر کریں

(۶)

اس کی کسے ہوس ہے کہ نام ونشاں رہے
دودن کی زندگی پہ بھروسہ ہوکس طرح
کیوں آرزوئے منصب ومال ومنال ہو
پستی میں ہے زمین بلندی پہ آسماں
تھوڑی سی زندگی ہے وفاکیا وفات کیا
کیا کیا ملے ہیں خاک میں شاہان نامور
روئے زمیں پہ تاج محل بھی بنا تو کیا
پیک اجل کے سامنے رستم کا اور کیا
ہاں خوگرستم کی تسلی اسی میں ہے
اتنی تو ہوں جہاں میں خانہ خرابیاں
کس طرح آئے راز حقیقت زبان پر
دنیا میں میں رہوں نہ مری داستاں رہے
دل مطمئن ہو عیش اگر جاوداں رہے
کیوں دل میں خواہش حشم عزوجاں رہے
کیوں خوبیوں کا اپنی کوئی قدرداں رہے
بہتر یہ ہے کہ اپنا قدم درمیاں رہے
یکساں ہے اعتماد ہو یا امتحاں رہے
اکبر رہے جہاں میں نہ شاہ جہاں رہے

میں یوں رہوں کہ جیسے کوئی ناتواں رہے
جب تک کہ یہ زمین ہے یہی آسماں رہے
باقی بتوں کا گھر نہ خدا کا مکاں رہے
پردے کی بات دل ہی کے اندر نہاں رہے
نحوست ہے آسماں میں کدورت زمین میں
ارباب دل کو چاہئے تھوڑی سی بیخودی
سیری نہ ہوگی عالم ہستی کی سیر سے
تھوڑی بھی ہوتو کم نہیں فرصت نشاط کی
صہبا ہو اور صحبت احباب زندہ دل
دل میں جگہ نہ دوں تو محبت کہاں رہے
کوچے میں اپنے پیر مغاں کی دکاں رہے
اپنا سفر مکان سے لا مکاں رہے
اتنی خوشی بہت ہے کہ دل میں نہاں رہے
پیری میں بھی فصیحؔ طبیعت جواں رہے

(۷)

مانا کہ زہد وطاعت وتقویٰ بھی چاہئے
کیا لطف زندگی کا کوئی آرزو نہ ہو
زندہ ہمیں سے نام ہیں فرہاد وقیس کے
کیا قدر حسن کی ہے اگر جلوہ عام ہو
اجڑے ہوے چمن میں بنے کیونکر آشیاں
سیدھی طرح نہ مانیں گے ہرگز دغا شعار
نرگس کو کیا ہوسوئے گل ولالہ التفات
یوں کس طرح کہوں مجھے مدنظر ہے کیا

دنیا میں کچھ تو لذت دنیا بھی چاہیے
پہلو میں دل تو دل میں تمنا بھی چاہیے
اب ان کے بعد ذکر ہمارا بھی چاہیے
بے مثل ہے جمال تو پردہ بھی چاہئے
ملتا نہیں اگر کوئی تنکا بھی چاہیے
کچھ مکر بھی فریب بھی دھوکا بھی چاہیے
ذوق نظر کو دیدۂ بینا بھی چاہیے
کچھ آپ کی طرف سے اشارا بھی چاہیے

(۸)

بے حکم کچھ کرے یہ کسی کی مجال کیا
اپنے کیے پہ پھر ہو مجھے انفعال کیا
ابرو و روئے یار کی ان سے مثال کیا
رتبہ میں بدر کیا ہے بھلا اور ہلال کیا
دور فلک میں کیجئے حاصل کمال کیا
ہوتا نہیں کمال کو آخر زوال کیا
دنیا میں دوست ہی نظر آتے ہیں ہر طرف
دشمن ہمارے کر گئے سب انتقال کیا
فرقت میں ایک روز بھی جینا محال ہے
گذریں گے اس طرح سے مرے ماہ و سال کیا
ہم ان کو دوست وہ ہمیں دشمن سمجھتے ہیں
ان کا گمان کیا ہے ہمارا خیال کیا
صرصر کا خوف، برق کا دھڑکا، خزاں کا ڈر
باغ جہاں آکے کوئی ہو نہال کیا

بھٹی کی ہو شراب کہ جام مئے طہور
رندوں کو امتیاز حرام وحلال کیا
پیری میں کیا کروں ہوس عشق وعاشقی
بجھتے ہوئے چراغ کو دوں اشتعال کیا
افسردہ خاطری کو بیاباں کی ہے تلاش
سیر چمن سے ہوگی طبیعت بحال کیا
بیمار ہوجو نرگس بیمار کی طرح
کوئی طبیب اس کی کرے دیکھ بھال کیا
مرہم کی جستجو ہے عبث تجھ کو چارہ گر
زخم جگر کو ہوگا مرے اندمال کیا
رہ رہ کے دیکھتے ہیں جو ترچھی نگاہ سے
الٹی چھری سے ہم کو کریں گے حلال کیا
کیوں جائیں کوہ طور پہ دیدار کے لئے
دل میں نہ دیکھ لیں گے ہم اس کا جمال کیا
اللہ نے مجھے دل بے مدعا دیا
آئے مری زبان پہ حرف سوال کیا
آتا نہیں جو رحم کبھی حال زار پر
دل کو مرے وہ مفت کا سمجھے ہیں مال کیا
اک کشمکش ہے دونوں طرف ہم نشیں نہ پوچھ
ان کا خیال کیا ہے ہمارا خیال کیا
سودائے خام اور طمع خام جانئے
دعویٰ عشق کیا ہے امید وصال کیا

جنت کو بھول جائے جو کوئی صنم ملے
زاہد ہے سبز باغ سے دل میں نہال کیا
دور فلک میں عیش میسر ہو گر فصیحؔ
اک روز بھی بہت ہے مجھے ماہ وسال کیا

(۹)

دنیا سرا ہے اس میں یہی اہتمام ہو
پیہم کسی کا کوچ کسی کا مقام ہو

جب تک نگاہ شوق کو لپکا ہے دید کا
ممکن نہیں کہ دل کی کوئی روک تھام ہو

دنیا ہے رہگذر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں
گھر کی طرح کسی کا یہاں کیا قیام ہو

اس عالم خراب کو جنت بنائیے
دنیا میں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کام ہو

آشفتہ سر ہوں مجھ کو غرض بوئے گل سے کیا
ہو زلف مشک بو تو معطر مشام ہو

میں انجمن میں شمع کا پروانہ کیا بنوں
کیوں اس سے لو لگاؤں جو صورت حرام ہو

موقوف حشر پہ نہیں کچھ بھی ہجوم خلق
تو جلوہ گر جہاں ہو وہیں اژدہام ہو

خواہاں جو خیر کا ہو وہ دنیا میں یوں رہے
آقا کسی کا ہو نہ کسی کا غلام ہو

دل پرشش گناہ سے گھبرائے کس لئے
اس کی رضا ہے عفو ہو یا انتقام ہو

کیا فاقہ مستیوں میں ملے لطف زندگی
یکساں ہے روز عید کہ ماہ صیام ہو

اپنی زبان پہ حرف نہ آئے کبھی فصیحؔ
روح القدس بھی ہم سے اگر ہمکلام ہو

ہیبت قضا کی دل میں سمائی ہوئی سی ہے
آئی نہیں اجل مگر آئی ہوئی سی ہے

دیکھ کر بھر دیدہ آنکھوں کو یہ ارماں رہ گیا
شوق پیدا ہو کے میرے دل میں پنہاں رہ گیا

عشق میں اس بت کے آخر لو لگی اللہ سے
شوق بن کر اک چراغ زیر داماں رہ گیا

رہنے والا تھا کوئی چکر مری تقدیر میں
بن کے تیرا حلقہ وہ زلف پریشاں رہ گیا

قتل ہو کر بھی مجھے حاصل سبکدوشی نہیں
سر کے بدلے تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا

اس نے اگر کرم بھی کیا تو غضب ہوا
کھینچا ستم سے ہاتھ تو جی جاں بلب ہوا

شکوہ بتوں کے جور کا بے جا ہے اے فصیحؔ
تجھ پر خدا کا قہر خدا کا غضب ہوا

جو بات چاہیے بھی وہ چاہی نہ جائے گی
اہل ہوس سے چاہ نباہی نہ جائے گی

بدلے ہزار رنگ زمانہ مگر فصیحؔ
بخت سیہ کی اپنے سیاہی نہ جائے گی

پوچھے کوئی تو عشق کا انجام کیا کہوں
تو ہی بتادے اے دل ناکام کیا کہوں

دعویٰ عشق اور تمنا وصال کیا
سودائے خام یا طمع خام کیا کہوں

شمع فجر کی طرح نہ کیونکر خموش ہوں
میں بھی ہوں آفتاب لب بام کیا کہوں

طوف حرم کے واسطے تقویٰ لباس ہے
دو چادروں کو جامۂ احرام کیا کہوں

درد اک صنم کا نام کئے جا رہا ہوں میں
اک عمر سے یہ کام کئے جا رہا ہوں میں

دنیا کا انتظام کئے جا رہا ہوں میں
یہ کار ناتمام کئے جا رہا ہوں میں

ناصح کی گفتگو کا خموشی جواب ہے
تقریر بے کلام کئے جا رہا ہوں میں

ناکامیوں سے عشق میں دل کامیاب ہے
کرنا نہ تھا جو کام کئے جا رہا ہوں میں

تری یاد میں زندگانی کا حاصل
کوئی لمحہ دل اس سے غافل نہیں ہے

مجھے کب ہے سجدہ سے انکار لیکن
جبیں آستانے کے قابل نہیں ہے

مروں کس لئے میں کسی فتنہ گر پر
مری زندگی اس کے قابل نہیں ہے

وہ کیا جانے سیر چمن کی حقیقت
جسے لطف صحرا بھی حاصل نہیں ہے

(ماخوذ از "فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے" تالیف ڈاکٹر مظفر بلخی)

☆☆☆

سید نقی عباس (کیفی)

'انشادِ شادؔ' اور نقدِ شعر

'انشادِ شادؔ'، علی محمد شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۷ء) کی شاعری پر فصیح الدین بلخی کا ایک مختصر ناقدانہ تبصرہ ہے 'جس میں شادؔ کے چیدہ اشعار کو زبان وفن کے معیار سے جانچ کر کلام کی حقیقت کھول دی گئی ہے' (سرورقِ کتابچہ)۔

۲۴ صفحات پر مشتمل فصیح الدین بلخی کی یہ تصنیف شاید اُن کے نگارشات میں سب سے مختصر تحریر ہے جس کا پہلا عنوان 'شادؔ عظیم آبادی کی شاعری ہے'۔ اس عنوان کو کتابچہ کا مقدمہ سمجھنا چاہیے جس میں فصیح الدین بلخی نے پہلے پیراگراف ہی سے شادؔ کی شاعری پر ایراد وانتقاد کے تیر برسانے شروع کر دیے ہیں اور شادؔ کی شاعری کے 'معائب' کی 'نشان دہی' کرتے ہوئے آخر میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ...شادؔ ایک اوسط درجہ کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کو استادِ فن یا میرانیسؔ کا ہمسر کہنا یا بلاغت میں غالبؔ سے برتر اور سلاستِ زبان میں داغؔ سے بہتر قرار دینا سراسر لغو اور مضحکہ خیز بات ہے جس کو سُن کر سخنور زبان کو دانتوں سے داب لیتا ہے، مگر جھنڈے پر چڑھانے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ممدوح کو اُس کے حقیقی رتبہ سے ہٹا کر ایسی مجلس عالی کی طرف لے چلے ہیں جہاں حاشیہ نشینوں کا پایہ بھی اُن کی معراج خیال سے بلند تر ہے:
>
> آہ آہ از دستِ صرّافانِ گوھر ناشناس
>
> ھر زمان خر مھرہ را با زر برابر می کنند
>
> (ص:۲۴)

انشادِ شاد

یعنی

شاد عظیم آبادی کے کلام پر اصولی تنقید اور تحقیقی تبصرہ

جس میں شاد کے پیچیدہ اشعار کو زبان و فن کے معیار سے جانچ کر کلام کی حقیقت
کھول دی گئی ہے

مرتبہ

فصیح الدین بلخی ریونیو افسر و مجسٹریٹ ریاست سرائیکلا

فصیح الدین بلخی کی کتاب ''انشادِ شاد'' کا سرورق

'انشادِ شادؔ' کے دیگر عناوین اس طرح ہیں: تناقض (ص:۱۱)، شتر گربہ (ص:۱۱)، حشو و زواید (ص:۱۲)، ردیف کا چسپاں نہ ہونا (ص:۱۳)، سرقہ کلام (ص:۱۸)، عروج کے وعوض ہبوط (ص:۱۹)، اصلاح وترمیم (ص:۱۹)، شاعری کا اشتہار اور شاعروں کی پکار (ص:۲۲)، شادؔ کا اختراع وتصرف (ص: ۲۲)، مقدمہ نگار کی تلاش (ص: ۲۳)، پچاس سال کی اب شاعری ہماری ہے (ص: ۲۴)۔

اگرچہ اپنے تمہیدی بیان میں فصیح الدین بلخی خود کہتے ہیں کہ 'تنقید سے کلام کے حسن وقبح کو واضح وروشن کرکے اس کو اصلی صورت میں رونما کرنا مقصود ہوتا ہے' لیکن اس مختصر سی تصنیف میں انھوں نے کلام شادؔ کے 'قبح' پر زور قلم صرف کرنے پر ترجیحاً اکتفا کیا ہے۔ لیکن اس مقالے میں نقدِ 'انشادِ شادؔ' مقصود نہیں ہے بلکہ ان نکات کی نشان دہی سے غرض ہے جنھیں فصیح الدین بلخی نے نقدِ کلام شادؔ کے لیے معیار بنایا ہے۔

فصیح الدین بلخی کے مطابق:

(۱) ردیف شعر کی جان ہے اور اگر ردیف شعر میں دست وگریباں اور پوری طرح چسپاں نہ ہو تو مضمون کتنا ہی عالی ہو، شعر مہمل اور لغو سمجھا جائے گا۔ (ص:۵)

(۲) شتر گربہ اور ضمائر کی عدم مطابقت قادر الکلامی کے خلاف ہیں۔ (ایضاً)

(۳) حشو وزواید کا خیال رکھنا... ہنر بلکہ شاعر کے لیے ضروری ہے۔ (ایضاً)

(۴) فصیح الدین بلخی شاعری میں دہلی اور لکھنو میں رائج محاوروں کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں اور شادؔ کے کلام میں مستعمل محاورات کو طنزاً 'صوبۂ بہار' کے محاورات کہتے ہیں۔ (ص:۶)

(۵) زبان کی خامی، محاورے اور روز مرہ کی غلطی، بندش کی سستی اور مضمون کی بے ربطی۔ (ایضاً)

(۶) اشکال وزن۔ (ص:۱۰)

(۷) اظہارِ خیال: اگر ادائے مطلب کے لیے مناسب الفاظ صحیح ترتیب کے ساتھ نہ لائے جائیں تو خیال کتنا ہی عالی ہو کلام لغو اور مہمل سمجھا جائے گا اور داد کا مستحق نہ ہوگا۔ (ص:۱۴)

(۸) سرقہ۔ (ص:۱۹)

(۹) اصلاح وترمیم۔ (ص:۲۰)

فصیح الدین بلخی نے مذکورہ بالا معیاروں پر شادؔ کے کلام کو بقول خود 'جانچنے' کا کام کیا ہے لیکن لہجہ قدرے تند اور زبان اند کے تُرش ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ آ گئی یاد تری چشم کی گردش ساقی جب چھلکتا ہوا آگے مرے مینا آیا

چشم اور گردش اور چھلکتا ہوا، ان میں سے ہر ایک لفظ بتا رہا ہے کہ بجائے مینا کے 'ساغر' ہونا چاہیے۔ جو شخص بلاغت سے کچھ بھی واقف ہے ہرگز ایسی غلطی نہ کرے گا۔ (ص:۱۱)

۲۔ یوں تو ہر ایک شاعر سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن ایک ایسا شاعر جس کو کہنہ مشق اور استادِ فن ہونے کا دعویٰ ہو ہر قدم پر ٹھوکریں کھایا کرے اور نادانوں کی سی غلطیاں کرے تو یقینا قابل اعتراض ہے کیوں کہ ایسے کلام کی اشاعت سے ملک کے ادبی وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔ (ص:۷)

۳۔ اہل زبان ہونا تو اور بات ہے معمولی درجہ کا زبان داں شخص بھی اپنے کلام میں زبان اور محاورات کی غلطیاں نہیں کرتا، تعجب ہے کہ شادؔ فرماتے ہیں:

ہم سے وہ اڑ چلے جسے اپنی خبر نہ ہو مشہور سچ مثل ہے کہ چیونٹی کو پر نہ ہو

'کو پر نہ ہو' غلط فرمایا، 'کے پر نہ ہو' ہونا چاہیے اور لفظ مثل سچی کہاوت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کی صفت کے لیے لفظ سچ کی حاجت نہ تھی، یہ لفظ مصرعہ کا وزن پورا کرنے کے لیے ٹھونس دیا گیا ہے۔ (ص:۸)

۴۔ وہ میری باتوں کو اوروں پہ ڈھال دیتے ہیں زباں ہلاؤں تو ہنس ہنس کے ٹال دیتے ہیں

بات کو ٹال دینا تو صحیح ہے لیکن 'اوروں پہ ڈھال دینا' جُہلا بولتے ہیں جس کی کوئی سند نہیں۔ (ص:۹)

۵۔ شادؔ کے کلام کی غلطیاں اور خامیاں ثابت کر دی جاتی ہیں اور تلامذہ جواب سے عاجز آتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ استاد اسی طور پر فرمایا کرتے تھے... شادؔ کو اختراع و تصرف کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اردو کا رواج عظیم آباد کے ایک محلہ یا حلقہ تلامذہ شادؔ تک محدود نہیں۔ یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصہ میں بولی جاتی ہے، اختراع و تصرف ایسے اہل زبان کو زیب دیتا ہے جس کی زبان سارے ملک میں مستند تسلیم کر لی گئی ہو۔ ہر کس

وناکس کا آپ کو اہل زباں اور زبان کا محقق تصور کرنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔ (ص: ۲۳)

دراصل 'انشادِ شادؔ' کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ اس کی تالیف کا سبب نہ تو فصیح الدین بلخی کی کلامِ شادؔ سے شخصی دلچسپی ہے اور نہ نقدِ واقعی۔ فصیح الدین بلخی صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ شادؔ کی شکل میں جس شاعر کو اُن کے تلامذہ زبان دانی اور مرتبہ میں میر انیسؔ سے ملاتے ہیں ایک 'اوسط درجہ' کا شاعرِ محض ہے۔ غالباً وہی تحریک جو 'موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ' کی تالیف کا پیش خیمہ ہوئی، 'انشادِ شادؔ' کی نگارش میں بھی کارفرما تھی۔ فصیح الدین بلخی بھی علامہ شبلی کی طرح حلقہ ارادتمندان وتلامذہ کے دعووں کا جواب لکھنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنے نظریات کو استحکام دینے اور اپنے موقف کو اثبات تک پہنچانے کے لیے کم ازکم انیسؔ و دبیرؔ کے کلام سے اچھی خاصی مثالیں جمع کردیں جس سے 'موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ' کے پڑھنے والے کے پاس اُن کی باتوں سے اختلاف یا اتفاق کے معروضات فراہم ہیں۔ لیکن ایک ۲۴ صفحے کے کتابچہ بلکہ مقالہ سے متعلق جس میں پچاس ساٹھ شعروں میں ضعفِ کلام کی اساس پر ایک پُرگو سخنور کو 'اوسط درجہ' کا شاعر اور سارق قرار دیا گیا ہو کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ بھی بعید نہیں کہ صرف معائب کی نشان دہی کے لیے بعض ضعیف شعروں کا انتخاب کیا گیا ہو۔ جبکہ یہ بھی واقعیت ہے کہ ہر پُرگو شاعر کے کلام میں حشو و زواید، بندش کی سستی یا مضمون کی بے ربطی وغیرہ جیسے معائب مل جائیں گے۔

تنقید کا تقاضا طنز وطعن کے نشتر چلانا نہیں بلکہ کلام کے محاسن اور معائب کو مناسب مثالوں کے ساتھ اس طرح پیش کرنا ہے کہ پڑھنے والا بھی کسی نتیجے تک پہنچ سکے۔ تنقید، ناقد کا قاری پر اپنی بات تھوپنے کا عمل نہیں ہے۔

ارادتمندوں اور تلامذہ کو جواب دینے کے علاوہ 'انشادِ شادؔ' کی تالیف کی ایک اور وجہ جو اس کے مطالعے سے سمجھ میں آتی ہے وہ شادؔ عظیم آبادی کی تعلّی اور استادی کے دعوے ہیں جس نے فصیح الدین بلخی کو اس کام کے لیے مہمیز (بلکہ مشتعل) کیا۔ خود شیفتگی یا نارسیسزم (Narcissism) طبعِ شاعر کا محور ہے۔ ہر بڑے چھوٹے اور بقول فصیح الدین بلخی 'اوسط درجہ' کے شاعر کے ہاں اس کا وجود طبعی ہے۔ اب، میرؔ ہوں، غالبؔ ہوں، میر انیسؔ ہوں، مرزا دبیرؔ ہوں، داغؔ ہوں کہ

خود جنابِ بلخی، سب کے ہاں فطرتاً تعلّی کے عناصر پائے جائیں گے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خود 'انشادِ شادؔ' کی تالیف بھی اسی تعلّی کا نتیجہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

فصیح الدین بلخی ایک محقق، تذکرہ نگار، مؤرّخ اور شاعر و عروض داں کی حیثیت سے بے تردید ایک بڑے دانشمند ہیں لیکن اُن کی روش تنقید ('انشادِ شادؔ' کے حوالے سے) یک طرفہ اور تند و ترش ہے، بااین ہمہ، اس میں کسی ادبی نکتہ، اصطلاح، صنعت یا زبان و محاورہ سے متعلق اُن کی توضیحات اور تشریحات بے تردید مفید ہیں:

جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

'انشادِ شادؔ' مختصر سہی لیکن نقدِ کلام شادؔ کے باب میں اپنے وقت کے ایک بڑے دانشمند کی غیر جانبدارانہ آرا پر مبنی ہے۔ یہ تحریر ہم طالب علموں کے لیے اُن معیاروں کی نشان دہی کرتی ہے جن کی مدد سے ہم کسی شاعر کی شخصیت سے اپنی ارادت اور تعصب کو ایک طرف رکھ کے یا بہ الفاظ دیگر اس سے متاثر ہوئے بغیر اُس کے کلام کا تنقیدی جائزہ لینے کا درس پاتے ہیں۔

☆☆☆

فصیح الدین بلخی - حیات اور کارنامے

مصنفہ
ڈاکٹر مظفر بلخی

آپ کی کتاب 'فصیح الدین بلخی - حیات اور کارنامے' دیکھی۔ بہت پسند آئی۔ آپ نے محنت اور توجہ سے کتاب لکھی ہے۔ آپ اس قسم کا تحقیقی کام کرتے رہے تو کچھ دنوں کے بعد علمی دنیا میں اپنی جگہ بنا لیں گے۔ ابتدائی ابواب تو آپ کے بہت اچھے ہیں۔ مرحوم سے قاضی عبدالودود صاحب اور حسن عسکری صاحب کی وجہ سے بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور تحقیقی ذوق مشترک ہونے کی وجہ سے جب بھی میرا علی گڑھ سے پٹنہ آنا ہوتا تھا تو میں ان سے ملنے اور فیض اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان پر ایک کتاب لکھنے کی ضرورت تھی اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ کام بوجوہ احسن انجام دیا۔

اپنے مقالے پر جو ڈاکٹریٹ کے لیے آپ نے لکھا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نظر ثانی نہیں کی اور آپ کے اساتذہ نے بھی پوری توجہ سے کام نہیں لیا۔ مضامین کی تکرار ہے۔ اسے ختم کر دینا چاہیے تھا۔ سکسینہ، مالک رام اور نیاز کے خطوط نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نیاز صاحب کا یہ فقرہ، مقالہ مل گیا شکریہ، چھاپنا کیا ضرور تھا۔

نظام الدین بلخی سے کبھی ملاقات کی سعادت تو نہیں حاصل ہوئی۔ اس وقت میں بہت کم عمر تھا۔ لیکن پٹنہ کالج، سائنس کالج اور دوسرے مقامات کے مشاعروں میں انھیں بہت دیکھا اور سنا۔ پڑھنے کا انداز منفرد تھا۔ ان کی متعدد غزلیں بزم ادب اور بزم سخن کی رودادوں میں آپ کو مل جائیں گی۔ آپ نے اچھا خاصا کلام ان کا شائع کر دیا ہے۔ کیا مرحوم کا دیوان مرتب نہیں تھا؟

یوسف الدین بلخی مرحوم سے بہت گہرے تعلقات تھے میرے خاندان کے ۔ وہ والدی حضرت مولانا ظفر الدین صاحب قادری پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے رفیقوں میں تھے اور وہ ان (والد صاحب) کا بہت احترام کرتے تھے ۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی ۔ وہ کہتے تھے ان کی بیٹی رضیہ سلمہا حضرت مولانا کی دعاوں کی برکت سے پیدا ہوئی ہے ۔ نام بھی غالباً انھی نے رکھا تھا ۔ یورپ سے واپسی کے بعد بلخی صاحب سے ملاقاتیں رہیں ۔ ایک دو بار تو شدّ رجال کر کے میں بہار شریف محلہ محل پر خاص طور پر ان سے ملنے گیا تھا ۔ مرحوم نے میری مدح میں ایک نظم ایسی لکھ کر بھیجی تھی کہ پڑھ کر میں شرمندہ ہوا ۔ لیکن ان کی محبت کے نقوش دل پر ثبت ہو گئے ۔ اگر وہ نظم مل گئی تو اس کی نقل بھیجوں گا ۔ یہ آپ لوگوں کے پاس نہیں ہوگی ۔ ان کے کچھ خطوط بھی میرے پاس ہیں ۔ ان کے کچھ مزید حالات خاص طور پر مدرسہ شمس الہدیٰ سے جانے کے بعد کے مل جائیں تو ایک مضمون لکھنے کا ارادہ ہے ۔

ڈاکٹر اسحاق بلخی مجھ سے عمر میں بڑے تھے لیکن ان کی صحبت میں میرا بہت وقت گزرا خاص طور پر اس زمانے میں جب وہ بلخی صاحب کے ساتھ ایک ہی مکان میں پٹنہ میں مقیم تھے ۔

قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ معیار (۱۹۳۶ء) کے لیے سید یوسف الدین احمد بلخی مرحوم سے ایک مضمون 'ایک ایرانی مصنف آقای احمد بہبہانی کی کتاب 'مراۃ الاحوال جہاں نما' پر لکھوایا تھا اور بہار سے متعلق حصے کا ترجمے بھی انھوں نے شائع کیا تھا ۔ ان کے اور مضامین بھی ضرور ہوں گے ۔ تلاش کیجیے اور ایک مجموعہ چھاپ دیجیے ۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ ان سے ان کی رشتہ داری ہے ۔ آپ کی کتاب کے ص ۱۰۹ پر جو مادری نسب نامہ چھپا ہے اس میں ملا غلام یحییٰ ، قاضی کمال الحق ، قاضی امین الحق ، قاضی واعظ الحق وغیرہ کا ذکر ہے ۔ یہ ان کے بزرگوں میں تھے ۔ میں قاضی صاحب مرحوم پر ایک کتاب لکھنی چاہتا ہوں ۔ اس کا ابتدائی باب رسالہ غالب نامہ دہلی (جنوری ۱۹۸۷ء) میں شائع ہوا ہے ۔ معلوم نہیں آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں ۔ ان بزرگوں کے بارے میں کچھ معلومات آپ کے پاس ہوں تو لکھیے گا ۔

اک صفحے پر آپ نے مہجور شمسی کا ذکر کیا ہے ۔ یہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں میرے معاصر تھے لیکن مجھ سے سینیر ۔ عبدالقیوم صاحب سے جب وہ گیا میں مقیم تھے متعدد ملاقاتیں

ہوئیں۔ ان کا ایک بہت خوبصورت خط بھی میرے پاس ہے۔ ڈالٹن گنج منتقل ہونے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی موسیقی کا ذوق تو آپ کو معلوم ہے۔ بڑے دوست نواز آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

حکیم صوفی صاحب (ص ۱۱۱) اور ان کے مدرسہ پر کچھ مواد ملے تو ضرور لکھیے۔ بلخی صاحب کی کتاب، تذکرہ نسوان ہند، (ص ۱۱۲) ملے تو ایک نسخہ ضرور بھیجیے۔

اعظم علی خاں کی سرٹی فکیٹ کا اردو ترجمہ دے دینا کافی تھا۔ اصل انگریزی دینی تھی تو اس کی جگہ ضمیمہ تھی۔ اولاد یں (ص ۱۱۶) آپ کیوں لکھتے ہیں۔ اولاد تو خود جمع ہے۔ کپڑا سلواتے تھے (ص ۱۲۸) یہاں کپڑے سلواتے تھے، ہونا چاہیے۔ اچانک سادھ کا نہیں لکھا (ص ۱۲۹) سمجھ میں نہ آیا۔ اختر اورینوی کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کلیم الدین عاجز (ص ۱۳۰) اصل نام شاید یہی ہو۔ مشہور تو وہ کلیم عاجز کے نام سے ہیں اور آپ کو یہی لکھنا تھا۔ یہ عبارت پھر پڑھی تو معلوم ہوا یہ آپ نے نہیں، اختر مرحوم نے لکھا ہے۔

کتاب کے اغلاط میں کاتب صاحب نے مزید اضافے کر دیے ہیں۔ الی الفتح (ص ۲۲۱) صحیح ابی الفتح، مسجد اللہ (ص ۲۲۳) للہ کر دیجیے۔ (ص ۲۲۷) فاعبدو میں الف کا اضافہ کیجیے فاعبدوا۔ والمسجدوا سے ل نکال دیجیے واسجدوا بنا دیجیے۔ حضرت نافع کے کتبے میں ھوالگنبد کی جگہ ھذا صحیح ہے۔ کتبات کی نقل میں کچھ اور اغلاط بھی سرزد ہوئے ہیں۔

کچھ حوصلہ افزا نسخہ برآمد نہ ہوا (ص ۱۴۱) ''نتیجہ'' ہوگا۔ جعلسازی کے وقت (ص ۲۰۷) 'جلد سازی' بنا لیجیے۔ ص ۲۴۲ غلامی ابوالفضل نہیں، علامی۔ ص ۲۴۳ پر کاتب نے گیتی آرا کو گیتی آرہ کر دیا ہے۔ بود و باش اختیار کیا (ص ۲۴۴) بود و باش مونث ہے۔

باب چہارم جس میں آپ نے بہار میں اردو نثر کے ارتقا پر لکھا ہے، معلومات افزا ہے اور آپ نے توجہ سے لکھا ہے۔

سید ھا راستہ، کو آپ واقعی شاہ عماد الدین قلندر کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس رسالے کو آخر تک پڑھیے۔ آخر میں ایک جگہ ''زبان'' کا لفظ آیا ہے، یہ تو ''مدر ٹنگ'' کا ترجمہ ہے اور انگریزوں کی آمد سے پہلے فارسی/ اردو میں اس کا استعمال نہیں ملتا۔ پوری کتاب مولانا تمنا کی

لکھی ہوئی ہے جو ایک انتہائی ذہین انسان تھے۔ کم از کم آپ کو شبہے کا اظہار تو ضرور کر دینا تھا یا کم از کم اس کا اظہار کر دینا تھا کہ بعض اصحاب اس کتاب کو جعلی سمجھتے ہیں۔

عالم علی عظیم آبادی پر آپ کو میرا مضمون شاید نہیں ملا جو رسالہ ندیم گیا (جولائی ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ آپ نے اس کے قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے۔ اس کا چھپا ہوا نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں موجود ہے۔ میں نے اس کی اور کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

میں نے عرصہ ہوا بہار کی اردو نثر پر ایک مقالہ لکھا تھا اپنی کم عمری کے زمانے میں۔ بزم ادب پٹنہ کالج کے سالانہ جلسے کے ادبی مقابلے کے لیے۔ اسے پہلا انعام ملا۔ اختر اورنیوی مرحوم نے اپنی ایک کتاب میں اس کے حوالے دیے ہیں۔ قاضی محمد سعید کے پاس بھی یہ مضمون تھا۔ اب گم ہو گیا ہے۔ میرے پاس بھی اس کی کوئی نقل نہیں۔ عالم عظیم آبادی اور عالم علی عظیم آبادی دونوں ایک ہی ہیں۔ (۱) مختار صاحب نے عالم علی عظیم آبادی (م بعد از ۱۲۶۵ھ) کی دو تصانیف کا ندیم گیا، جولائی ۱۹۴۰ء میں تعارف کرایا تھا۔ (مرتب)

'خوان الوان' پر بھی میرا ایک مضمون ندیم (اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں چھپ چکا ہے شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ ص ۱۵۷ کے فٹ نوٹ میں آپ نے بہت قیمتی معلومات جمع کر دیے ہیں کوئی ان کی مدد سے پورا مقالہ لکھ سکتا ہے۔ ص ۱۵۸ ناسخ کو آپ بہار کے مصنفوں میں شمار کرنے پر کیوں مصر ہیں۔ ص ۱۵۹ بلخی مرحوم کے عہد کے مصنفوں میں آپ ان لوگوں کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں جو بہار کے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر متمکن ہیں۔ سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ)، نجیب اشرف ندوی (بمبئی)، سید ابوظفر ندوی (گجرات) وغیرہ۔ یہ سب بہار کے ہیں اور بلخی صاحب کے معاصرین ہیں۔ جبکہ آپ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی، شاہ مقبول احمد اور مولوی سید احمد اللہ ندوی کے اسماء گرامی درج کیے ہیں جنھوں نے علی الترتیب حیدر آباد، کلکتہ اور حیدر آباد۔ کراچی میں عمر کا بیشتر حصہ گزارا۔ ص ۱۵۹ پر آپ نے علامہ سید سلیمان ندوی کا ذکر کر دیا ہے۔ ص ۱۸۵-۱۸۶ اردو کتاب میں انگریزی عبارتیں بہت بری معلوم ہوتی ہیں اردو ترجمہ دینا چاہیے تھا۔

ص ۲۰۳ آپ پوچھتے ہیں کہ اگر مروجہ دیوان زیب النسا بیگم مخفی کا نہیں تو کس کا ہے؟

زیب النسا شاعرہ تھی۔ اس کا کلام تذکروں میں ملتا ہے۔ مروجہ دیوان جس کا ہے اس پر تو حافظ محمود شیرانی نے مستقل مضمون شائع کیا ہے۔ اوروں نے بھی لکھا ہے۔

(ص ۲۱۸) کتبہ مسجد جھتولی، کیا یہ اشعار موزوں ہیں؟ نادمؔ صاحب سے پوچھیے۔

میرے خیال میں بلخی صاحب مرحوم نے جو کتبات پر کام کیا ہے وہ ان کے بہت اہم کاموں میں شمار ہونا چاہیے۔ موقع ہو تو انھیں اڈٹ کر کے شائع کر دیجیے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگے۔ ہاں کتبات کی عبارت کی تصحیح قیام الدین احمد یا دوسروں سے ضرور کرا لیجیے۔ قدیم اور اہم کتبات کے عکس حکومت ہند کے رسالے EPIGRAPHIA INDICA میں جسے حال تک ضیاء الدین دیسائی شائع کرتے رہے ہیں، دیکھ لیجیے۔ یہ محنت طلب کام ہے لیکن ہے بہت اہم۔ کچھ کتبات قیام الدین احمد صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیے ہیں وہ آپ نے دیکھے ہوں گے۔

بلخی صاحب مرحوم کا دوسرا اہم کام میرے خیال میں مخطوطات وفرامین کی تلاش اور جمع آوری ہے اور اس پر جتنی ان کی تعریف کی جائے کم ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ یہ کام انھوں نے عمر کے آخری دور میں کیا ہے جب ان کی صحت غیر مستقیم تھی اور ضعیفی کا عالم تھا۔

(ص ۲۳۹) آپ نے دیوان منشا کو نایاب بتایا ہے۔ نایاب نہیں ہاں کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدا بخش میں محفوظ ہے اور میری نظر سے گزر چکا ہے۔ منشا، انشاء اللہ خاں انشا کے عزیز ہیں۔

(ص ۲۴۴) مکتوبات قتیل تلمیذ خواجہ... اصل یہ ہے کہ مرزا قتیل کا یہ مجموعۂ خطوط ان کے شاگرد خواجہ امانی نے مرتب کیا ہے۔ اس مکتوبات، ان، بنا لیجیے۔ تاریخ مرآۃ العام نہیں، مرآۃ العالم، سنجن سنگھ نہیں، سجن سنگھ صحیح ہے۔ یہ سب کاتب کی غلطی اور پروف ریڈر کی بے احتیاطی سے ہوا ہے۔ اسی طرح (ص ۲۴۵) پر 'تاریخ نیموی' غلط چھپا ہے یہ 'تاریخ تیموری' ہے۔ تذکرا السلاطین کو اپنے نسخے میں۔ 'تذکرۃ السلاطین' بنا دیجیے۔ خلاصۃ الاحوال منشی آشرم، یہ کیا ہے سمجھ میں نہ آیا۔

آپ نے دیوان ولی مکتوبہ ۱۲۴۶ھ کو دیوان کا سب سے پرانا نسخہ لکھا ہے۔ اس سال

سے پہلے کے لکھے ہوئے ولی کے دیوان کے نسخے ملتے ہیں۔ یہ بلخی مرحوم نے لکھا ہوگا لیکن آپ کو تصحیح کر دینی چاہیے تھی۔

(ص ۲۴۶) سلاست الرسل؟ یہ الرمل ہوگا۔ یہ فن رمل کا کوئی رسالہ ہوگا۔ آزاد بلگرامی کی کتاب کا نام 'شمات المرجان' نہیں، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' ہے۔ یہ پہلے بھی چھپ چکی ہے اوراب میرے ایک شاگرد نے سے اڈٹ کر کے دو جلدوں میں علی گڑھ سے شائع کر دیا ہے۔

فرخ سیر۔ کتاب کا نام پورا لکھیے اور مصنف کا بھی۔

(ص ۲۴۷) رجسٹرار کے انگریزی خطوں کا اندارج بالکل نامناسب ہے۔ دو سطروں میں لکھ دینا چاہیے تھا کہ صورت حال واضح ہو جائے۔ سہائے صاحب کون سے ادیب تھے کہ ان کی انگریزی تحریریں محفوظ کی جائیں۔

(ص ۲۵۱) کتاب نمبر ۴ کے بعد نقطے کیوں ہیں۔ کتاب اور مصنف کا نام کسی وجہ سے درج ہونے سے رہ گیا۔ (کتاب نمبر ۹) سلامۃ الذیب۔ ذیب تو بھیڑئے کو کہتے ہیں سلالۃ الذھب ہوگا۔

باب ہفتم (ص ۲۵۴) میں تذکروں پر طویل تمہید کی ضرورت نہ تھی صرف بلخی صاحب کے کاموں کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ سارے معلومات شائع ہو چکے ہیں۔

(ص ۲۵۷) خوب چند ذکا کے تذکرے کا نام 'معیار الشعرا' نہیں 'عیار الشعرا' ہے۔ قاسم کا تذکرہ 'مجموعۂ نغز' ہے۔ یہ دو بار شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح 'گلزار ابراہیم' کے مصنف ابراہیم خاں نہیں علی ابراہیم خاں ہیں۔

(ص ۲۵۶) پر 'مخزن نکات' کے مصنف کا نام قیام الدین قیام چھپا ہے۔ مصنف کا تخلص قائم ہے۔ (۲)

(ص ۲۵۸) تذکرۂ خاکسار معشوق علی چہل رسالہ محمد یار عرف کلن یا کلو؟؟

(ص ۲۵۸) عیار الشعرا ابھی شائع نہیں ہوئی ہے (۳)۔ اس کی ضخامت کا اندازہ آپ کو کیسے ہوا اور سب سے ضخیم تذکرہ تو کمالؔ کا تذکرہ ہے جو ۱۲۱۸ میں مرتب ہوا۔ اس کا نام مجمع الانتخاب ہے۔ اس کے نسخے لندن، کلکتہ اور حیدرآباد میں ہیں۔

(ص ۲۵۹) اسپرنگر، اس جرمن نژاد مستشرق کے نام کا صحیح تلفظ 'اشپرنگر' ہے۔

(ص ۲۶۰) فلین صاحب نہیں، فیلن صاحب۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ کریم الدین اور فیلن نے دتا سی کے تذکرے کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ تواب کراچی میں ایک فرانسیسی طالبہ نے کیا ہے
(ص ۲۶۱) امداد امام اثر کی کتاب کا نام کاشف الحائق چھپ گیا ہے۔ کاشف الحقایق بنا دیجیے۔
(ص ۲۶۲) آپ نے لکھا ہے کہ تذکرۂ شورش میں صرف 'س' تک کے شعرا کا ذکر ہے۔ پھر لکھا ہے کہ مطبوعہ نسخہ مکمل نہیں۔ آپ نے صرف پہلی جلد دیکھی ہے۔
(ص ۲۶۹) عبدالوہاب شرانی، صحیح 'شعرانی'۔
(ص ۲۷۸) آپ نے ایک شاعرہ جمیلہ کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے یہ خدابخش مرحوم کی بی بی تھیں۔ ان پر مقالے لکھے گئے ہیں۔

خط بہت طویل ہو گیا۔ آپ بھی پڑھتے پڑھتے گھبرا گئے ہوں گے اور شاید سوچنے لگے ہوں کہ آپ کی کوششوں کو سراہنے کے بجائے میں آپ کی کتاب پر تنقید لکھنے بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ کی کتاب مجھے پسند آئی اور اس کا ذکر میں نے خط کی ابتدا میں کر دیا ہے اور نادم بلخی صاحب کے خط میں بھی میں نے اس کی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور آپ کی نصف کتاب سے زائد میں نے اس توجہ سے پڑھی ہے کہ شاید آپ کے ممتحنوں نے بھی نہ پڑھی ہو۔ آپ کو تحقیق کا شوق ہے اور خاندانی ورثے میں آپ کو تالیف وتصنیف کا ذوق ملا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس سے زیادہ محنت کریں جس قدر آپ نے اس پہلی تصنیف میں کیا ہے اور آپ مطمئن نہ ہو جائیں۔ اور اپنے مقالات وتصانیف میں زیادہ دقت نظر اور سعی وتلاش سے کام لیں کہ اپنے ہم عصروں میں آپ ممتاز ہوں اور علمی وادبی دنیا میں آپ کی شہرت ہو۔ ورنہ میرے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ چار سطروں میں کتاب پر توصیفی کلمات آپ کو لکھ کر بھیج دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے جذبے کی قدر کریں گے اور اس تحریر کا برا نہ مانیں گے۔

کاموں کا ہجوم ہے۔ میں نے آپ کی کتاب کو سرسری طور پر پڑھ کر بہت عجلت میں یہ خط لکھا ہے۔ بدخط ہوں اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو بعض مقامات آپ سے پڑھے نہ جائیں۔ کچھ علیل ہوں یعنی نزلہ زکام کا اثر ہے۔ یہ خط بستر پر لیٹے لیٹے آپ کو لکھ رہا ہوں۔

امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے اور بدستور علمی کاموں میں مصروف۔ قاضی سید رضا

حسین پر کچھ معلومات آپ کے پاس ہوں تو بھیجئے۔ میں نے ان پر ایک مضمون لکھا ہے لیکن اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہاں ان کے سلسلے میں مواد بہت کم ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے بتایا تھا کہ کسی خاتون نے زبان وادب (پٹنہ) میں ان پر مضمون شائع کیا ہے۔ شہاب الدین دسنوی صاحب، ڈاکٹر سید حسنین اور متعدد اصحاب کو لکھا لیکن اب تک مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ اب خط تمام کرتا ہوں کاغذ بھی نبڑ گیا اور قلم کی سیاہی بھی۔

والسلام خیر طلب

مختار الدین احمد

حواشی:

۱۔ مختار صاحب نے عالم علی عظیم آبادی (م بعد از ۱۲۶۵ھ) کی دو تصانیف کا ندیم، جولائی ۱۹۴۰ء میں تعارف کرایا تھا۔ (مرتب)

۲۔ اسی صفحہ یعنی ۲۵۶ پر تحفتہ الشعرا کے مصنف کا نام افضل بیگ قاتشال چھپا ہے صحیح قاقشال ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ (مرتب)

۳۔ عیار الشعرا از خوب چند ذکا قومی کونسل دہلی سے شایع ہو گئی ہے۔ مرتبین: نورالحسن نقوی و طارق حسن

☆☆☆

وفا ملک ــــــ پوری

'صبح نو' کے پٹنہ سے اجرا کے بعد جن ارباب قلم سے میں نے ملاقاتیں کیں اور جن کا بھر پور تعاون مجھے حاصل ہوا ان میں جناب فصیح الدین بلخی کی شخصیت بھی ہے۔ ان کا مشفقانہ برتاو اور 'صبح نو' کے لیے قلمی تعاون میں بھول نہیں سکتا۔ علم کے ساتھ حلم، اخلاق کے ساتھ اخلاص، محبت میں شفقت اور تعلقات میں وضع داری ایسے ہی لوگوں کا حصہ تھا۔

ع اب تو ایسے لوگ ملیں گے تم کو فقط افسانوں میں

پورنیہ

۲۹/نومبر ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر نسیم اختر

فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے

(ایک تحقیقی جائزہ)

سید فصیح الدین بلخی (پ: ۱۸۸۵ء- و: ۱۹۶۲ء) کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جس کے علمی و روحانی فیوض و برکات کا سکہ بالعموم ہندوستان اور بالخصوص بہار پر تقریباً سات سو برس تک چلتا رہا۔ ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی ایک اعلیٰ پایہ صوفی گذرے ہیں جن کے احوال فارسی و اردو کی متعدد کتابوں اور رسائل و جرائد میں موجود ہیں۔ غالب نے حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوے کہا تھا:

ہر کجا رشتۂ شوقِ تو جراحت بارد   جز خراش بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
فیض تو ہر جا گل و برگ افشاند   جز نسیم بہ پرسش گہہ مرہم نرسد

حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کا سلسلہ چودہ واسطوں سے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے جو اس طرح ہے:

سید ابراہیم بن ادہم بلخی، بن امیر سلیمان، بن ناصرالدین، بن امیر سید یعقوب، بن امیر سید احد، بن امیر سید احمد، بن امیر سید اسحاق، بن امیر سید زید، بن امیر سید محمد، بن سیدنا امام قاسم، بن سیدنا امام علی اصغر، بن سیدنا امام زین العابدین، بن سیدنا امام حسین بن امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔

حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی کی پانچویں نسل میں ایک بزرگ سید شمس الدین محمد بلخی، محمد تغلق کے عہد میں بلخ سے دہلی آے جہاں دربار شاہی میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوے مگر وہاں کی ایک ذراسی ناپسندیدہ حرکت کو دیکھ کر ایسا متنفر ہوے کہ اس عہدۂ جلیلہ کو ترک

کر کے بہار شریف کا رُخ کیا اور شیخ احمد چرم پوش سے مرید ہو کر وہیں خانقاہ میں رہنے لگے۔
سید فصیح الدین بلخی کا تعلق اسی درِ نایاب کی سولہویں پشت سے ہے، جو یوں ہے:
سید فصیح الدین بلخی، بن سید غیاث الدین بلخی، بن قاضی سید طہارت التوحید بلخی، بن سید شاہ فہیم اللہ بلخی، بن فخر الاسلام بلخی، بن دیوان معمور شاہ بلخی، بن سید معین الدین بلخی، بن مخدوم جنید بلخی، بن مخدوم ابراہیم بلخی، بن مخدوم شاہین بلخی، بن مخدوم ابراہیم سلطان بلخی، بن مخدوم احمد المعروف بہ لنگر دریا بلخی، بن مخدوم نوشہ توحید بلخی، بن مولانا سید معز الدین بلخی، بن شمس الدین بلخی۔
سید فصیح الدین بلخی کا مادری نسب نامہ تیرہ واسطوں سے حضرت تاج فقیہ کی اولاد ملا رکن الدین منیری سے ملتا ہے۔
سید فصیح الدین بلخی کی ابتدائی تعلیم ان کے والد سید غیاث الدین بلخی (م: ۱۹۰۰ء) کی نگرانی میں ہوئی۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ محل، گذری بازار، پٹنا یونیورسٹی میں واقع حکیم صوفی کے مدرسہ میں زیر تعلیم رہے۔ محمڈن انگلو عربک ہائی اسکول پٹنا سیٹی سے (غالباً ۱۹۰۵ء) میں انٹرنس کیا۔ ۱۹۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے زیر نگراں داناپور کینٹ سے فوجی رجمنٹل منشی کا امتحان منعقد کرایا جس میں وہ کامیاب ہوے۔
تعلیم سے فراغت کے بعد سید فصیح الدین بلخی مختلف ملازمت سے وابستہ رہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۰ء میں شمالی بہار سٹلمنٹ میں قانون گو کی نوکری کی مگر بہت جلد اس سے مستعفی ہو کر ۱۹۱۱-۱۲ء میں ملٹری اسکول کُرکی میں معلم ہوے۔ مختصر مدت کے بعد وہاں سے سبکدوشی اختیار کر کچھ دنوں تک فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں معلم ہوے۔ اسی دوران جزیرۂ فی جی کے سپریم کورٹ میں ترجمان کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی جہاں وہ ۱۹۱۳-۱۴ء تک رہے۔ پھر اسے چھوڑ کر بہار کوآپریٹیو سوسائٹی نوادہ میں سپروائزر ہوے۔ پھر سیوان میں قانون گو کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں دوبارہ فوجی ملازمت سے وابستہ ہو کر مصر گئے جہاں فوجیوں کے لیے عربی، فارسی و اردو کے معلم مقرر ہوے۔ وہاں ملازمت کے دوران اسکندریہ، اسٹر، ریاض، دمشق، سیریا، فلسطین، بیروت، بیت المقدس وغیرہ کا سفر کرنے کے بعد ایک ہی سال میں وطن واپس ہوے۔ ۱۹۲۰ء میں مونگیر میں سرکل افسر مامور ہوے۔ مگر خلافت اور تحریک عدم تعاون

سے متاثر ہوکر اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ریاست سرائے کیلا میں ریونیو افسر کی خدمات انجام دیتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پٹنا یونیورسٹی میں بحیثیت ریسرچ اسکالر تقرری ہوئی جہاں ۱۹۶۰ء تک پٹنا یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کے انچارج رہے۔ جہاں انھوں نے مخطوطات کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔

اسی دوران ان کی صحت دن بہ دن خراب ہوتی گئی اور بالآخر ۱۴ر مارچ ۱۹۶۲ء کو انتقال ہوگیا۔ دوندی بازار، پٹنا سیٹی کے قبرستان میں آسودہ ہیں۔ یوں تو ان کی قطعۂ تاریخ رحلت بسمل سہنساروی، سریر کابری، جمیل مظہری، نواب نقی جان قمر گیاوی وغیرہ نے نکالی مگر مزار پر سید محمد یوسف وکیل کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

از بس کہ جہان است زشت و قبیح	جان داد و بگریختہ زیان مرد صبیح
این کتبہ بخوان کہ سالِ مرگ است ہمین	آسودہ بہ این تربتِ صاف است فصیح = ۱۹۶۲ء

ایک مورخ، محقق، ناقد، تذکرہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے سید فصیح الدین بلخی نے جو خدمات انجام دیں ہیں انھیں دنیائے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کے کتابچہ 'انشاد شاد' مطبوعہ ۱۹۳۹ء کے علاوہ 'تاریخ مگدھ' مطبوعہ ۱۹۴۴ء، تذکرہ 'نسوانِ ہند' مطبوعہ ۱۹۵۶ء، تذکرہ 'ہندو شعرائے بہار' مطبوعہ ۱۹۶۲ء اور انگریزی تصنیف Wahabi Movement in Bihar تنقید، تاریخ اور تذکرہ نگاری میں قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بے شمار ادبی، علمی و تحقیقی مقالات قلمبند کیے۔ سید فصیح الدین بلخی کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ادبی، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ بقول پروفیسر اختر اورینوی:

'حضرت بلخی مرحوم مورخ، محقق اور جامع الحقایق تھے۔ وہ صرف پیر تحقیق ہی نہیں بلکہ شیخ دست گیر بھی تھے۔'

سید فصیح الدین بلخی نے نثر کے علاوہ شاعری پر بھی توجہ دی مگر ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کے طور پر ان کے عزیز ڈاکٹر مظفر بلخی نے اپنی تصنیف 'فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے' (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) میں ان کے شعری سرمایہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مذکورہ کتاب کے ص ۳۳۸ پر یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ان کے مشہور شعر:

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

کو میرؔ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

'فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے' ڈاکٹر مظفر بلخی، ام اے فارسی و اردو، ریڈر و صدر شعبہ اردو جے ایس کالج ڈالٹین گنج (رانچی یونیورسٹی) کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر دانش گاہ رانچی نے انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی ہے اور جو بقول مولف 'ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع' کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ہوئی ہے۔ کتاب کی تعداد ایک ہزار بتائی گئی ہے، قیمت ایک سو روپے، طباعت دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنا – ۴ میں ہوئی ہے۔ یہ ڈیمائی سائز کے ۳۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بارہ ابواب ہیں۔ 'پیش لفظ'، 'عرضِ حال' اور 'فہرست کتابیات' ان کے علاوہ ہیں۔

'فصیح الدین بلخی: حیات اور کارنامے' کا 'پیش لفظ' ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ۲۲ دسمبر، ۱۹۸۸ء کا رقم کردہ ہے۔ اپنے ساڑھے چار صفحے کے 'پیش لفظ' میں مصنف نے ادبی تحقیقات کی تمہید پر دو صفحے سے زیادہ لیے ہیں، بقیہ میں فصیح الدین بلخی سے متعلق اپنے ان آٹھ سالہ پرانے خیالات کو دواوین میں نقل کر دیا ہے جو مصنف نے 'نمودِ ہستی' کے لیے ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا۔ یعنی جب فصیح الدین بلخی کے حیات اور کارنامے سے متعلق گوشے اور مواد اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے جسے ایک محقق نے ایک طویل پس منظر کے ساتھ ان پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر کے اس پر ان کی رائے جاننی چاہی تو بھی ڈاکٹر سید محمد حسنین کے پاس فصیح الدین بلخی کے حیات اور کارنامے سے متعلق از سر نو کہنے کو کچھ نہ تھا۔

اس 'پیش لفظ' کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے زیر بحث کتاب اور اس کے مصنف کی تحقیقی کاوشوں کے بارے میں ساڑھے چار صفحے کی تحریر میں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا:

'ڈاکٹر سید مظفر بلخی کا یہ شخصیتی مقالہ کا تا اور لے دوڑے کی مثال نہیں۔ اس سعی میں ان کی استعداد تحقیق کے علاوہ استعانت تنقید بھی ملتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے... کام انھوں نے نہایت محنت اور سلیقہ مندانہ کیا، انجام لازماً حسن کارانہ ہوا'۔ (ص ۷)

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اس مقالے کو پڑھ کر اپنا خیال ظاہر کیا ہوتا

تو شاید وہ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچتے کہ ڈاکٹر مظفر بلخی کا یہ مقالہ کاتنے سے پہلے دوڑ جانے کی مثال ہے لیکن انھیں یہ خیال دامن گیر رہا کہ:

'یہ پیش لفظ دو حقایق سے تعلق رکھتا ہے، اولاً اس کے مصنف میرے عزیز ہیں اور شاگرد بھی۔ دوم میں نے اپنے مقالہ تحقیقی کی تکمیل (۱۹۵۲ء) میں جن دو چار باکمالوں کے علم و فضل سے استفادہ کیا تھا، ان میں فصیح الدین بلخی پہلا نام تھا'۔ (ص ۷)

اسی کے ساتھ ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے 'پیش لفظ' میں ایک تحقیقی سروے کی رپورٹ درج کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

'کسی شخصیت (مرحوم/زندہ) پر ریسرچ سب سے آسان ہے'۔ (ص ۷)

لہٰذا ان کا مشورہ ہے:

'شخصیات پر کام کرانے میں سخت گیری کی ضرورت ہے'۔ (ص ۷)

ممکن ہے کہ موصوف کو اس آسانی کا اندازہ اسی وقت ہو گیا ہو گا جب انھوں نے خود مرزا فدوی پر اپنا تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا ہو گا۔ غالباً اسی شدتِ احساس نے انھیں اپنے ہی خیالات کی تردید پر بھی مجبور کیا جو ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے:

'کسی شخصیت پر کام کرنا بہت آسان ہے مگر اسی شخصیت کے وجود و نمود کے خد و خال یا فہم و فکر کے نقش و نگار کو صبح صادق بنا دینا دشوار ہے۔ اس سعی میں کامرانی اسی وقت ممکن ہے جب موضوع اور تحقیق دونوں کے ساتھ اندازِ عمل منصفانہ اور دیانت دارانہ ہو'۔ (ص ۷)

دراصل یہی بات درست بھی ہے اور اس کے ساتھ مزید یہ اضافہ ہونا چاہیے تھا کہ شخصیت کے انتخاب میں ہمیشہ ادب میں اس کے کارنامے اور معیار پر نظر رکھنی چاہیے اور یہی عمل منصفانہ اور دیانت دارانہ کسی کتاب کے 'پیش لفظ' لکھتے وقت بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اس 'پیش لفظ' میں (جو پیش لفظ کم اور رہنمائے تحقیق زیادہ ہے) تصنیفی، صنفی، علاقائی، لسانی اور نظریاتی مقالے کے مدمقابل 'شخصیتی مقالے' کو پانچ جگہ لکھا گیا ہے۔ نہ معلوم 'شخصیتی' مقالے کے بجائے 'شخصی یا شخصیاتی مقالے' کے استعمال میں انھیں کیا قباحت تھی۔ اس طرح موصوف نے Fieldwork کا ترجمہ 'جہد ارضی' کیا ہے جو توجہ طلب ہے۔

بہر حال، اب موضوع کی طرف آنا چاہوں گا۔ اس مقالے کے بارہ ابواب ہیں۔ باب اول، دوم اور چہارم تمہیدی کہے جا سکتے ہیں۔ باب سوم کا تعلق فصیح الدین بلخی کی سوانح حیات سے ہے۔ اگر محقق نے حسن ترتیب سے کام لیا ہوتا تو باب سوم میں ہی متذکرہ تینوں بات کو 'الف'، 'ب' اور 'ج' کی درجہ بندی کر کے ایک باب میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح بارہ ابواب کی طوالت بھی گراں بار نہ ہوتی۔

ضرورت تو تھی کہ اس مقالے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جاتی مگر یہاں چند کی نشان دہی مقصود ہے۔ مولف 'عرضِ حال' میں لکھتے ہیں:

'ہر معاملے میں حقائق کی چھان بین کی گئی ہے'۔ (ص ۱۱)

کتاب کے مطالعے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ انھیں اس دعوے کے بجائے یہ اعتراف کرنا چاہیے تھا کہ حقائق کی چھان بین کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح وہ مدعی ہیں:

'حصہ چہارم میں بہار میں اردو نثر کے ارتقا سے مختصراً بحث کی گئی ہے اور فصیح الدین بلخی مرحوم کے عہد تک کے تمام بہاری نثاروں کی تخلیقات کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے'۔ (عرضِ حال، ص ۱۱)

(الف) میرے خیال میں: یہ عبارت غیر ذمہ دارانہ بیان پر مشتمل ہے۔ کیونکہ محقق نے صرف چند ہی سطروں میں بہار میں اردو نثر کے ارتقا کے سلسلے میں لکھا ہے 'بحث' تو دور کی رہی۔

(ب) جہاں تک فصیح الدین بلخی کے عہد تک کے تمام بہاری نثاروں کی تخلیقات کے 'مختصراً تعارف' کا ذکر ہے وہ بھی بے بنیاد ہے۔ تمام نثاروں کی تخلیقات کا مختصراً تعارف تو درکنار، ان تمام میں بھی بعض اہم ترین کے نام تک نہیں گنائے گئے ہیں۔ مثلاً نصیر الدین خان، ریاست علی ندوی، ارشد کاکوی، مولانا شائق احمد عثمانی، عطاالله پالوی، ڈاکٹر نذر امام، ڈاکٹر مختار الدین احمد، صباح الدین عبدالرحمن، عبدالقوی دسنوی، غلام سرور، جمیل مظہری، پروفیسر ذکی الحق، پروفیسر سید حسن، بہاؤالدین احمد، شرف عظیم آبادی، غیاث احمد گدی، ذکی انور، شکیلہ اختر، نقی احمد ارشاد، ڈاکٹر شکیل الرحمن، بہزاد فاطمی، کلام حیدری وغیرہ وغیرہ (یہ نام جس طرح ذہن میں آتے گئے لکھ دیے گئے ہیں)۔

کتاب کے صفحہ ۱۴۱۔ ۲۰۴ پر مولف 'فصیح الدین بلخی...' نے ناول اور ناولٹ نگاری کے سلسلے میں جہاں ضمیر الدین عرش گیاوی کے 'ثمرہ نافرمانی'، اسلم عظیم آبادی کے ناولٹ 'فسانہ شیریں'،

اختر اورینوی کے 'حسرت تعمیر' اور سہیل عظیم آبادی کے 'بے جڑ کے پودے' کا ذکر کیا ہے وہیں سید حنیف فائز کے ناولٹ 'رفیق وانیس'، سید آل حسن معصومی کے 'کشتہ انفعال' المعروف بہ عبرت کے دو آنسو'، سید آل حسن عثمانی (دوسرے نام سے لکھے گئے) کے ناول 'چاند تازہ'، 'بڑی آپا'، 'دوست کی بیوی'، امداد امام اثر کے 'فسانہ ہمت' اور جمیل مظہری کے مشہور ناولٹ 'فرض کی قربان گاہ پر' معروف بہ 'شکست و فتح' کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جبکہ شین مظفر پوری کے پانچ ناول (ناولٹ سمیت) 'فرحت'، 'ہزار راتیں'، 'چاند کا داغ'، 'تین لڑکیاں ایک کہانی' اور 'کھوٹا سکہ' فصیح الدین بلخی کی حیات میں ہی منظر عام پر آچکے تھے۔ خود مجھے مولف کے والد پروفیسر نادم بلخی نے ذکی انور کے ناولوں کی ایک فہرست عنایت کی ہے جس کے مطابق ذکی انور کے ۲۳ میں سے ۱۴ ناول فصیح الدین بلخی کی زندگی میں شائع ہوئے لیکن اس کی بھی کوئی نشان دہی اس مقالے میں نہیں کی گئی ہے۔

مولف 'فصیح الدین بلخی...' کی تحریر اکثر مغالطے اور شک وشبہات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً، ص ۵۰ کا مطالعہ کریں:

'بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئے چنانچہ موصوف کا ایک مقالہ رسالہ نگار لکھنو میں شائع ہوا، اس ضمن میں ان کی اکثر خط وکتابت علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ہوتی تھی'۔

اس اقتباس کے دو پہلو ہیں:

(الف) احتیاط کا تقاضہ تھا کہ بلخی صاحب کے اکثر مقالات ملک کے مشہور رسالوں کے بجائے بہار کے مشہور رسالوں میں لکھنا چاہیے تھا کیونکہ ان کے مضامین 'معاصر'، 'مصور'، 'صنم'، 'صبح نو'، 'ندیم'، 'صدائے عام'، 'انسان'، 'اشارہ'، 'تہذیب'، 'سہیل' اور 'کوئل' وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔

(ب) یہ درست ہے کہ ایک مقالہ 'نگار' میں شائع ہوا۔ بقول مولف 'موصوف کا ایک مقالہ رسالہ نگار لکھنو میں شائع ہوا، اس ضمن میں ان کی اکثر خط وکتابت علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ہوتی تھی'۔ یعنی صرف ایک مقالے کی اشاعت کے لیے فصیح الدین بلخی کو نیاز سے اکثر خط و کتابت کرنی پڑی! انھوں نے نیاز کو کتنے خط لکھے اس کا علم نہیں البتہ فصیح الدین بلخی کے نام نیاز کے صرف ایک خط کا پتا چلتا ہے جس کا متن یہ ہے:

دفتر نگار   محترمی تسلیم

اپریل، ۱۹۵۳ء

مقالہ مل گیا، شکریہ۔   والسلام: نیازؔ

ان تمام امور سے قطع نظر، میرے نزدیک اس مقالہ علمی کے چار پہلو قابل ذکر ہیں:

۱۔ مشتبہ حقائق   ۲۔ مواد کی فراہمی

۳۔ زبان و بیان   ۴۔ نتیجے کا فقدان

(۱) مشتبہ حقائق:

چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

ص ۱۶: مولف سید عزیز الدین بلخی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ص ۱۷: 'موصوف (عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی) ۱۱۵۳ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوے، مدت تک شاہ محمد اعظم خلف اورنگ زیب کے دربار سے وابستہ رہے پھر دکن کی سیر کو نکلے بعدہٗ دہلی چلے آے جہاں ۱۱۲۳ھ میں بیدلؔ کا انتقال ہوا'۔ یعنی بیدلؔ اپنی پیدائش سے ۳۰ سال قبل رحلت کر چکے تھے!

ص ۱۷: (الف) سید عمادالدین پھلواروی نہیں بلکہ خواجہ عمادالدین ہونا چاہیے تھا۔ عمادالدین کو خود خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ عمادیہ کے لوگوں نے 'سید' نہیں لکھا بلکہ 'خواجہ' لکھا (رجوع بہ: اعیان وطن اور نقوش صبیح)۔

(ب) اعیان وطن اور نقوش صبیح کے مطابق خواجہ عمادالدین کی پیدائش ۱۰۶۵ھ ہے جبکہ مولف 'فصیح الدین بلخی... ' نے ۱۰۶۹ھ لکھا ہے۔

(ج) خواجہ عمادالدین کا اردو شعر الحاقی ہے (رجوع: مقالات قاضی عبدالودود)

(د) غلام نقشبند سجادؔ کا سال وفات (مولف نے ۱۱۷۲ھ لکھا ہے) ۱۱۷۳ھ ہے اور تپاںؔ کے مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے:

ہاے یوسف، طلعتِ محبوبِ ربّ العالمین = ۱۱۷۳ھ

(ز) شاہ نور الحق تپاں کا سال وفات مولف نے ۱۲۳۲ھ لکھا ہے جبکہ ۱۲۳۳ھ ہونا چاہیے تھا۔

(ہ) ضیاالدین دہلوی کا نام ضیاالدین حسین ہونا چاہیے۔ ص ۲۹: 'شادؔ عظیم آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ 'نالۂ شادؔ (۱۳۰۷ھ)، مثنوی 'چشمۂ کوثر' وغیرہ مطبوعہ...'

شاید انھیں خبر نہیں کہ 'نالۂ شادؔ' کا ہی دوسرا نام 'چشمۂ کوثر' ہے اور یہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع سیدی، پٹنا سے شائع ہو چکی ہے۔ ص: ۴۱ 'اردو شاعری کا جو پہلا تذکرہ لکھا گیا ہے وہ عظیم آباد میں 'تذکرہ شورش' اور تذکرہ 'مسرت افزا' اس کی روشن دلیل ہے۔'

(الف) مولف کو معلوم ہونا چاہیے کہ تذکرہ 'مسرت افزا' اردو کا پہلا تذکرہ نہیں ہے۔

(ب) تذکرے کا مولف ابوالحسن نہ بہاری تھا نہ یہ بہار میں لکھا گیا۔

ص: ۳۷ 'ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی... داغؔ دہلوی کے براہ راست شاگرد تھے'۔ مبارک عظیم آبادی بذریعہ مراسلت داغؔ کے شاگرد ہوے۔ انھوں نے کبھی انھیں دیکھا تک نہیں تھا۔ جب داغؔ دہلوی، پٹنا آے اس وقت بھی وہ وہاں موجود نہ تھے۔ مبارکؔ خود لکھتے ہیں:

'اس وقت میرا عنفوان شباب تھا اور اس کے تفاوت کے سبب میں خود اس انجمن میں شریک نہ تھا جس میں شعراے عظیم آباد پروانہ وار داغؔ کے گرد جمع ہوتے تھے'۔ (نگار لکھنؤ، سالنامہ ۱۹۵۳ء، داغؔ نمبر ص ۸۵)

ص ۴، ص ۴۴، ص ۲۶۶ اور ص ۲۶۹ پر 'کاشف الحقائق' کو تذکرہ لکھا گیا ہے مگر ص ۱۶۱ میں مولف لکھتے ہیں: اثر کی تصنیف 'کاشف الحقائق' اردو تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے'۔

دراصل مولف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے جہاں سے جو حوالہ ملا بلا تصدیق اسے نقل کر دیا۔ 'کاشف الحقائق' تذکرہ نہیں، تنقید ہے۔ ص ۱۶۰: 'اکبر داناپوری مرحوم نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں، ان کتابوں کی فہرست ۲۰ ہی: (۱) اشرف التواریخ، ۴ جلد مکمل (۲) خدا کی قدرت (۳) چہل حدیث (۴) رسالہ الماس (۵) دل (۶) ارادہ (۷) ادراک (۸) مولد غریب (۹) سرمہ بینائی (۱۰) مولد فاطمی (۱۱) چراغ کعبہ'۔

(الف) مولف کو چاہیے تھا کہ 'اشرف التواریخ' چار جلدوں کا نام بتاتے۔ میری معلومات کے مطابق یہ تین جلدوں میں ہے، حصہ اول 'اسرار نبوت'، حصہ دوم 'عہد رسالت' اور حصہ سوم 'عہد خلافت'۔

(ب) اکبرؔ داناپوری کی تمام کتابوں کی تعداد یقین کے ساتھ بتانا فی الحال میرے لیے ناممکن ہے تاہم مولف 'فصیح الدین بلخی...' نے جو نام بتائے ہیں ان کے علاوہ چند مزید یہ ہیں: 'تحفۂ مقبول'، 'اخبار العشق'، 'شورِ قیامت'، 'رسالہ غریب نواز'، 'احکام نماز'، 'نجات اکبر'، 'جذبات اکبر'، 'سیر دہلی' (مشکوک)۔

ص ۱۸۷: فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں: 'نجات قاسم مولفہ شاہ محمد قاسمؔ داناپوری، مطبوعہ ۱۸۵۷ء'۔ جبکہ شاہ قاسمؔ داناپوری کی پیدائش ۱۳۱۱ھ بتائی جاتی ہے جو ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء ہونی چاہیے۔

ص ۲۲۹: مولف نے حکیم ناصر علی غیاث پوری کی صرف ایک کتاب 'عناصر الشہادتین' کا ذکر کیا ہے جبکہ وہ سیکڑوں کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔

ص ۲۶۹: 'شجرۃ الیقین فی جنت النعیم فسبح باسم ربک العظیم' مولفہ شاہ رضا حسین، مطبوعہ ۱۸۸۳ء، کتاب کا تاریخی نام ہے'۔ یہ نام تاریخی نہیں ہے۔ شجرۃ الیقین فی جنت النعیم کا عدد ۲۷۲۱ ہوتا ہے۔ فسبح باسم ربک العظیم ۱۵۲۴۔ یہ ۱۲۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ شاہ رضا حسین شجرۃ الیقین کے ص ۱۱۸ پر لکھتے ہیں: بتاریخ یکم ماہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ... ترتیب پایا۔

(۲) مواد کی فراہمی:

بلا شبہ مقالہ نگار نے اس سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی کی ہے۔ فصیح الدین بلخی کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق تمام گوشوں کو یکجا کر دیا ہے۔ پس منظر کے طور پر بلخی خاندان کی علمی و ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے مگر بحیثیت مجموعی پورے مقالے میں مواد کی فراہمی میں بڑی بے اعتدالی سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام ضروری اور غیر ضروری باتیں بلاوجہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ شامل ہوگئی ہیں۔

مقالہ نگار نے فصیح الدین بلخی کے حیات اور کارنامے کے تمام تر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے چکر میں جو بھی یہاں سے ملا لے لیا ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں جہاں آٹھ سال کے بچے ہیلی کاپٹر اور کار ریس چلا رہے ہیں محقق کے اس انکشاف سے فصیح الدین بلخی کے حیات کا کون سا گوشہ روشن ہوتا ہے کہ:

'مرحوم لگ بھگ دس سال کے ہوں گے۔ مرحوم سائیکل سیکھنے کے خواہش مند تھے۔ سائیکل کا انتظام ہو گیا۔ مرحوم نے پیڈل پر پاؤں رکھ کر مشق شروع کر دی اور بہت جلد سائیکل چڑھنا سیکھ لیا'۔ (ص: ۱۲۲)

مولف نے فصیح الدین بلخی کو اپنے موضوع کی حیثیت سے سامنے نہیں رکھا ہے بلکہ خونی رشتہ ہر جگہ آڑے آ گیا ہے اسی لیے قلم عقیدت مندانہ چلتا گیا پوری کتاب میں انھوں نے فصیح الدین، فصیح یا بلخی یا ضمیر سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ہر جگہ وہ فصیح الدین بلخی مرحوم یا بلخی صاحب مرحوم لکھتے ہیں جو تحقیق کی زبان نہیں، مثلاً ص ۱۱۱ پر ۱۲ جگہ مرحوم، ص ۵۴ کے فٹ نوٹ اور ص ۵۵ پر ۱۵ جگہ بلخی صاحب یا بلخی صاحب مرحوم، ص ۱۴۳ پر ۱۲ مرتبہ بلخی صاحب مرحوم لکھا ہے۔

(۳) زبان و بیان:

اس مقالے کا سب سے کمزور پہلو زبان و بیان ہے اور میرے خیال میں ایک اوسط اخباری مضمون کی زبان سے بھی زیادہ غیر معیاری ہے۔ اس کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جس میں زبان و بیان کی ناہمواری، عجز بیان، بے اعتدالی اور تکرار لفظی کی مثال نہ ملتی ہو۔ محقق، تحقیق کے اسلوب سے یکسر نابلد ہیں۔ بطور نمونہ خط کشیدہ لفظوں پر خاص توجہ فرمائیں:

ص ۱۹: 'عظیم آباد کی شاعری نے داخلی رنگ گہرا قبول کیا ہے، داخلی شاعری سے مراد شاعر کے اندرونی جذبات اور کیفیات اور واردات قلبی کی تشریح ہے۔ چنانچہ میرؔ کا سوز و گداز اور دردؔ کا کیف و درد بھی داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔ چنانچہ شعرائے دہلی نے ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے زیادہ تر داخلی پہلو کو برتا ہے، چنانچہ رازؔ بلخی نے اساتذہ دہلی کے کلام سے عظیم آباد کے اساتذہ کا موازنہ پیش کیا ہے'۔

ص ۱۲۵: 'نصیر الدین بیرسٹر، شریف صاحب بیرسٹر اور عبدالجلیل مجسٹریٹ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے... پروفیسر سید حسن عسکری سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے... انجم مانپوری سے بھی ان کی گہری دوستی تھی... بسملؔ سنہاروی سے بھی ان کی گہری یاری تھی۔ سریرؔ کابری سے بھی ان کی گہری دوستی تھی۔ بلخی صاحب مرحوم سے گہری دوستی تھی جان قمرؔ گیاوی مرحوم سے بھی تھی... سید محمد یوسف وکیل بھی ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ شرف الدین خلیل

دراصل مقالہ نگار نے صرف معلومات کی حصول یابی تک ہی مقالے کو محدود رکھا ہے اور نتائج کو عملی شکل میں دیکھنے کی کوشش تو دور اس ضرورت کا احساس تک نہ ہوا۔ جب ایک درجن باب قائم ہی کیے جا چکے تھے تو آخر ایک اور یعنی تیرہویں باب کے اضافے میں کون سا فرق پڑ جاتا۔ اس حصے میں کم از کم کوئی نتیجہ تو برآمد ہوتا۔

آخری بات: جامعات ہند میں ادبی تحقیق کی صورت حال پر قاضی عبدالودود نے بہت کچھ اور بہت درست لکھا ہے۔ انھوں نے نامور پروفیسر حضرات کی تحقیقات کا جو جائزہ لیا ہے دنیائے ادب کے سامنے موجود ہے۔ ڈاکٹر مظفر بلخی کی کتاب 'فصیح الدین بلخی...' اس لحاظ سے قابل ستایش ہے کہ ادیب کی حیات وخدمات کے گوناگوں گوشے جو پردۂ خفا میں تھے اور بعض غیر مرتب ڈھنگ سے اِدھر اُدھر منتشر تھے وہ ایک دستاویزی شکل میں اس کتاب میں محفوظ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ صاحب مقالہ نے حتی الامکان تحصیل معلومات کی سعی کی لیکن اگر اس پر اچھی طرح نظر ثانی کی جاتی اور حشو زوائد کا خیال رکھا گیا ہوتا تو جو کمزوریاں راہ پا گئی ہیں از خود دور ہو جاتیں۔ تحقیق میں ماخذ اور اس کی صحت جہاں بے حد ضروری ہے وہیں تحقیقی عبارتوں میں ڈرامائی رنگ کی آمیزش مزاج تحقیق کے منافی ہے۔

☆☆☆
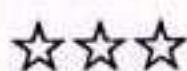
ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

تاریخ مگدھ (صوبۂ بہار کی مکمل تاریخ)

مولوی فصیح الدین بلخی عظیم آبادی (ریونیو افسر و مجسٹریٹ ریاست سرائے کیلا اڑیسہ) کی یہ کتاب صوبۂ بہار کی تاریخ سے متعلق ہے جس میں بقول مرتب ۶۴۲ قبل مسیح سے ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) تک تمام تاریخی واقعات وحالات مستند کتب تواریخ سے اخذ کر کے مسلسل اور مکمل طور پر اصل ماخذ کے حوالوں کے ساتھ تفصیل وار درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۴۵۹ صفحات (بشمول مقدمہ) اور ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ انجمن نے اسے ۱۹۴۴ء میں دیال پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر اپنے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۰۸ کے تحت شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو ہند کی علمی اور ادبی خدمات ص ۳۲۶ مطبوعہ علی گڑھ

بلخی صاحب کے دو غیر مطبوعہ خط بنام ڈاکٹر مختار الدین احمد و مالک رام

حیدر آباد، دکن ۳۰/جون ۵۶ء

کرم گسترمن   السلام علیکم

مجھے افسوس ہے کہ آپ کی فرمایش کی تعمیل میں میں ناکام رہا لیکن یہی ناکامی خوشی کا باعث ہوئی اس لیے کہ جستجو اور تلاش کے ہنگام میں مجھے غالب کی ایک ایسی تحریر مل گئی جو آپ کے لئے یقیناً دل چسپ ثابت ہوگی۔ آپ کو 'ذخیرۂ دولت شاہی' کی مہر کے متعلق تحقیق مقصود تھی (۱) اس لیے میں اول اس بارے میں اپنی جستجو کا حال عرض کرتا ہوں۔ میں نے جامعۂ عثمانیہ، کتب خانۂ آصفیہ' سالار جنگ میوزیم و لائبریری اور سنٹرل رکارڈس روم میں فہرستیں دیکھیں اور لائبریری والوں سے دریافت کیا لیکن نہ تو فہرستوں سے کہیں پتا ملا نہ زبانی کوئی شخص کچھ بتا سکا۔ مختلف اشخاص سے دریافت کرنے پر صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر قاسم صاحب کا کتب خانہ کسی ادارہ نے خرید لیا تھا۔ اتفاق سے جامعۂ عثمانیہ میں مخطوطات کے منتظم صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ قاسم صاحب کی کتابیں کتب خانۂ آصفیہ نے لے لی تھیں۔ میں یہ سن کر پھر کتب خانۂ آصفیہ میں گیا اور میں نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر قاسم صاحب کی جو کتابیں لی گئی ہیں وہ کہاں ہیں۔ ان لوگوں نے بتایا وہ کتابیں اب تک کتب خانہ کی فہرست میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔ میں نے باصرار درخواست کی کہ جو فہرست خریداری کے وقت تیار کی گئی تھی وہ مجھے دکھایئے۔ بالآخر تین دنوں کی متواتر کوششوں کے بعد فہرست مجھے دکھائی گئی لیکن اس میں 'ذخیرۂ دولت شاہی' مندرج نہیں۔ ایک کتاب تذکرۂ دولت شاہی کے نام سے ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ شاید وہی کتاب ہو لیکن اس میں نہ تو کوئی مہر ہے اور نہ وہ کتاب ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس طور پر ساری کوششیں ناکام رہیں اور میں مایوس ہو کر واپس آرہا تھا۔ لائبریری والوں نے کہا کہ غالباً وہ کتاب راشد صاحب نے رکھ لی ہوگی جنھوں نے تقریر نشر کی تھی۔ میرا بھی یہی گمان ہے۔ اب میں نے عالم یاس میں

دریافت کیا کہ آپ کے کتب خانہ میں کوئی ایسی کتاب بھی ہے جس پر غالبؔ کی مہر ہو۔ جن کے پاس مخطوطات کی الماریوں کی کنجیاں رہتی ہیں انھوں نے فرمایا کہ ایک مطبوعہ کتاب پر غالبؔ کی مہر اور تحریر میری نظر سے گذری ہے۔ یہ سن کر میری مایوسی امید سے بدل گئی۔ انھوں نے میری التجا پر وہ کتاب فوراً منگوا کر دکھائی اور جو میں نے دیکھا اس کو نقل کرلیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ مہر اور تحریر بلاشبہ غالبؔ کے دست خاص کی ہے جو حسب ذیل ہے:

غالبؔ کا ایک مطبوعہ دیوان ہے جس پر 'در مطبع احمدی باہتمام اموں جان طبع شد' اور سن طباعت ۱۲۷۸ھ ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ تیسری بار طبع ہوا ہے۔ اس کے آخر میں ضیاالدین احمد خاں نیرؔ کی تقریظ بھی ہے۔ آخری صفحہ میں جدول کے نیچے ایک چوکور مہر ہے جو گویا ایک انچ سے کچھ زیادہ مربع ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

''نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷''

داہنی جانب حاشیہ پر غالبؔ کے دست خاص کی لکھی ہوئی یہ عبارت ہے:۔

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہونچے دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کردیا ہے گویا غلط نامہ اب بیکار محض ہوگیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا میرا بیان کیا۔ میر قمرالدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی یہ مجلد گویا مسودہ ہے اسی کو بھیج دیجیے۔ غالب۔

مجھے یقین ہے کہ یہ چیز آپ کے لیے دلچسپ ثابت ہوگی۔ اگر کسی سبب سے آپ کو دلچسپی نہ ہو (۲) تو میں خود اس کو شائع کردوں گا۔ لیکن حقیقتاً میں آپ کو اس کا اہل اور مستحق جانتا ہوں۔ بہر کیف، اس خط کی رسید ذیل کے پتے سے سع ضرور روانہ فرمایے کہ مجھے اطمینان ہو کہ یہ تحریر آپ کو مل گئی ہے۔ اب میں دو دنوں سے زیادہ یہاں نہ رہوں گا۔ امید ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں۔

نیاز کیش

فصیح الدین بلخی

محلہ گذری

پٹنہ سیٹی ۸

حواشی

(۱) مولانا غلام رسول مہرؔ نے اپنی تصنیف 'غالب' میں غالب کی طب سے آگاہی کے شواہد میں ڈاکٹر سید قاسم (حیدرآباد) کے کتب خانے کی ایک کتاب 'ذخیرۂ دولت شاہی' کا حوالہ دیا تھ اور لکھا تھا کہ اس پر غالب کی مہر ثبت ہے۔ نیز یہ شعر درج ہے:

رضینا قسمة الجبار فینا   لنا علم و للجہال مال

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبی کتاب غالب کے زیر مطالعہ رہی ہے (غالب، ص ۱۳۱، طبع چہارم)

میں نے جرمنی سے واپسی پر آکسفرڈ سے ۱۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو مولانا مہر کو لکھا، بھئی! وہ رضینا قسمۃ الجبار فینا والی مہر ہمارے آپ کے غالب کی نہیں، 'سید اسد اللہ خاں غالب' کی ہے۔ مجھے شبہ پہلے بھی تھا، اب جرمنی میں دیوان کلیمؔ کا ایک نسخہ دیکھا جس پر غالب کی تین مہریں ہیں۔ یہ عربی شعر بھی ہے۔ دوسری مہر میں صرف 'سید اسد اللہ غالب' منقوش ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ غالب، سید نہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس میں ۱۱۴۴ھ کے اعداد منقوش ہیں۔

ان کا ذکر میں نے تذکروں میں پڑھا ہے، یہ طبیب پیشہ تھے۔ آپ کی حیدرآباد والی کتاب پر جو طب کی ہے اُن کے دستخط ہوں یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ (مولانا مہرؔ کے نام میرے کچھ خطوط کی عکسی نقلیں جناب مولانا محمد مختار حق صاحب (لاہور) نے مجھے بھیجی ہیں اس عنایت کے لیے ان کا ممنون ہوں)۔

جس مہر کا اوپر ذکر ہوا وہ ۱۱۴۴ھ کی کھدی ہوئی ہے، اس وقت تو میرزا غالبؔ پیدا بھی نہیں ہوے تھے۔ اصل یہ ہے کہ مولانا مہرؔ نے 'ذخیرۂ دولت شاہی' خود نہیں دیکھی تھی۔ اس کی اطلاع کے لیے انھوں نے محمد عبدالرزاق صاحب راشد (حیدرآباد) کی ایک تقریر کا حوالہ دیا تھا جو انھوں سے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی۔ (مختار الدین احمد)

نوٹ: اس سلسلے میں ملاحظہ فرمائیں مضمون: غالب کی ایک مہر، از مختار الدین احمد، مطبوعہ آجکل دہلی، فروری ۱۹۵۶ء، ص ۲۲-۲۴۔ (مرتب)

(۲) میں نے انھیں ۸ جولائی ۱۹۵۶ء کو ان کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا اور انھوں نے اس سلسلے میں جو زحمتیں اٹھائیں ان کے لیے ان سے معذرت کی۔ پھر لکھا کہ غالب کی اس مہر اور ان کی تحریر کا عکس میرے پاس موجود ہے اور یہ دونوں چیزیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی 'کچھ بکھرے ورق'

یا 'کچھ اور بکھرے ورق' (رسالہ ہندوستانی، الہ آباد) میں شائع کر چکے ہیں۔ (مختار الدین احمد)

P.U.Library

Patna 5

21-9-57

مکرمی تسلیم

خواجہ فخر الدین حسین سخنؔ کے صاحب زادے خواجہ معین الدین حسین مرحوم میرے بچپن کے یار تھے۔ سخنؔ مرحوم میرے والد مرحوم کے دوست تھے اور ہم لوگ ایک ہی محلہ میں رہتے تھے۔ تصویر جو میں نے عزیزی قاضی عبدالودود صاحب کو دی تھی۔ وہ سخنؔ مرحوم کے صاحب زادے سے میں نے لی تھی۔

سخنؔ مرحوم کو میں نے خود بھی برسوں دیکھا تھا۔ ان کی اور تصویر بھی میرے پاس تھی جو شاید تلاش کرنے سے مل جائے لیکن جو تصویر میں نے قاضی صاحب کو دی وہ زیادہ صاف ہے(۱) سخنؔ کے صاحب زادے جنھوں نے مجھے وہ تصویر دی تھی، ان کی بھی ایک تصویر میرے پاس موجود ہے۔

مئی ۱۹۵۳ء کے نگار میں میری ایک تحریر شایع ہوئی تھی جس میں میں نے اور شعرا کے علاوہ سخنؔ کا ذکر اور بعض چشم دید واقعات بھی لکھے تھے۔ اسکو ملاحظہ فرمایئے۔ اس مقالے کا عنوان تھا ''صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت'' (۲)

جوابی کارڈ کی حاجت نہ تھی۔

نیاز کیش

فصیح الدین بلخی

مالک رام

12/ 5 WEA

Karol Bagh

New Delhi

(۱) خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی (۱۳۵۵-۱۳۱۸ھ) پر قاضی عبدالودود کا مضمون 'نوائے ادب' (بمبئی) میں چھپا تھا۔ تصویر انھیں فصیح الدین بلخی صاحب سے بعد کو ملی جو اس

جوابی کارڈ ...
نیاز کیش
فصیح الدین بلخی

पोस्ट कार्ड
केवल पता

Malik Ram
12/5 WEA
Karol Bagh
New Delhi

فصیح الدین بلخی کا خط مالک رام کے نام مؤرخہ 21-09-1957

رسالے کے دوسرے شمارے میں چھپی۔ اڈیٹر صاحب نے تصویر چھاپ دی۔ اس پر کوئی کیپشن درج نہ تھا۔ کچھ لوگ اسے قاضی صاحب کی تصویر سمجھے۔ ان کے پاس اس سلسلے میں خطوط آے اور انھیں اس کی تردید کرنی پڑی۔

(۲) میں اس زمانے 'غالب اور بہار' پر ایک مضمون کے سلسلے میں معلومات جمع کر رہا تھا۔ (مختار الدین احمد)

مکتوبات بنام فصیح الدین بلخی

(1)

REF NO. 106/Contr.   19-01-1956

جناب مکرم

غلام یحییٰ بہاری اور نواب علی ابراہیم خان پر آپ کے مقالے موصول ہوئے۔ یہ مقالے آپ نے خوب لکھے ہیں مگر ماٰخذ کی فہرست ہر مضمون کے ساتھ دنیا ضروری تھا نیز ان دونوں صاحبوں کی طبع شدہ تصنیفات کا مقام و سنہ طباعت۔ میں اب ان کو ڈھونڈھ کر لکھ رہا ہوں۔

والسلام
مخلص
محمد شفیع

مولانا فصیح الدین بلخی
ساکن گذری محلہ پٹنہ سٹی

(2)

REF NO. 139/ Contr.

24-01-1956

مکرمی

میں آپ کو اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ آپ کے دونوں مضمون موصول ہو چکے ہیں اور اس

سلسلے میں میں نے آپ کو یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے حوالوں کی تلاش ابھی جاری ہے اس لیے کہ آپ نے یورپی ماخذ سے کوئی چیز لے کر اس میں درج نہیں کی اور ان کے حوالے ضروری ہیں۔ والسلام

مخلص

محمد شفیع

....

جناب فصیح الدین بلخی صاحب گذری پٹنہ سٹی ۸

(3)

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

(DEPARTMENT OF URDU ENCYCLOPAEDIA ISLAM)

K.B.M.MOHAMMAD SHAFI, UNIVERSITY LIBRARY

BUILDINGS M.A(PB)MA(CANTAB)D.O.L

CHAIRMAN EDITORIAL BOARD

URDU ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM

UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE

REF NO 7/ Contr. LAHORE 2 nd Jan 1957

Dear Mr. Balkhi

I thank you for your letter of the 13th December 1955, in which you have had very kindly promissed to send the articles on Mulla Ghulam Yahya Bihari and Nawab Ali Ibrahim Khan by the end of December 1955. I hope you have already sent the articles. If so, kindly let me know the data of despatch. they have not reached me yet.

with best wishes.

yours Sincerely

Mohammad Shafi

Fasih-ud-Din Balkhi Sahib

Mohalla Guzri,Patna City 8

مالک رام بنام فصیح الدین

(4)

12/6 WEA

۱۸/۹/۱۹۵۷ء

KAROL BAGH

نئی دہلی

کرم فرمائے من

مخدومی قبلہ قاضی عبدالودود صاحب نے اطلاع دی ہے کہ سید فخر الدین حسین سخنؔ کی تصویر آپ نے انھیں دی تھی، لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی تھی۔ انھوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں آپ سے رجوع کر کے دریافت کروں۔ اس لیے کرم فرمائیے اور اس تصویر کے ماخذ کا پتا دیں۔ ان کا نام اور سخن سے ان کا کیا رشتہ تھا۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

شاہ مقبول احمد بنام فصیح الدین بلخی

(5)

16 E. Wellisley Square

Top Floor

Calculta -16

۱/۸/۱۹۵۸ء

مکرمی و محترمی سلام علیک

مزاج شریف

گرامی نامہ کل مل چکا تھا کہ آج پھر ایک کارڈ موصول ہوا۔ تذکرۂ عشقی کا عکس میں نے لندن سے منگوالیا ہے اس لیے اس کی طرف رجوع نہ کریں۔ وہ میرے پاس ہے۔ البتہ تذکرۂ شورش میں میر محمد سلیم، سلیم عظیم آبادی کا ترجمہ مع کل اشعار کے نقل کر کے ارسال فرمائیں۔ 'معاصر' میں

'مسرت افزا' شائع ہوا ہے۔ سلیم کا ترجمہ اس میں درج ہے مگر تمام اشعار سلیم درج نہیں۔ اس میں وہ شعر نقل فرمائیں جو 'معاصر' میں نہیں۔ مگر یہ سارے کام اسی صورت میں کریں کہ اس کے لیے زیادہ زحمت نہ ہو۔ 'تذکرۂ نسوان ہند' کی بابت جلد ہی آپ کو لکھوں گا، مطمئن رہیں۔ خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی کا تذکرہ 'ہندو شعرا' کلکتہ میں آپ کو مل سکتا ہے یا نہیں.... بہاری ہندو شعرا کا حال درج ہے۔ اپنے ماخذ میں متذکرہ بالا کتاب کو ضرور شامل کریں گے۔ اگر یہ کتاب وہاں دستیاب نہ ہو تو مجھے لکھیں میں اس سے جستہ جستہ نقل کر کے آپ کو بھیج دوں گا۔

طالب خیر

شاہ مقبول احمد

(6)

۱۳-۸-۵۸ء

محترم و مکرمی سلام علیک

مزاج شریف

گرامی نامہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ عزیز پروفیسر سید حسن صاحب، سلیم عظیم آبادی کے متعلق جو کچھ کام کر رہے ہیں وہ سب میرے لیے ہے۔ اب آپ اس سلسلہ میں زحمت نہ فرمائیں۔ ترجمۂ سلیم کے لیے ممنون ہوں۔ گلزار ابراہیم نسخۂ کلکتہ میں بھی یہی ترجمہ درج ہے۔ اشعار کی جگہ اسی طرح سادہ ہے۔ نسخۂ رام پور کا بھی یہی حال ہے۔

اب آپ اپنی کتاب 'تذکرۂ نسوان ہند' کی ۱۵ کاپیاں مندرجہ ذیل پتہ پر بھیج دیں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کی قیمت وصول کر کے میں آپ کے پاس روانہ کر دوں گا۔ عثمانیہ بکڈ پو والوں سے بات چیت کر چکا ہوں۔ ان کا پتہ درج ذیل ہے:

منیجر عثمانیہ بکڈ پو ۱۰۴۔ لور چیت پور روڈ کلکتہ ۱

والسلام

طالب خیر

شاہ مقبول احمد

۹-۲-۵۹ء

محترمی ومکرمی سلام علیک

مزاج شریف

تذکرہ نسوان کے ۵ / نسخے فروخت ہوئے جس کی قیمت مبلغ Rs 22/8 ہوئے۔ اس رقم سے کمیشن تاجر مبلغ Rs 7/8 اور منی آرڈر فیس -/30NP وضع کر لینے کے بعد Rs 14/70NP روانۂ خدمت ہیں۔ رسید الگ سے روانہ فرمائیں کیونکہ ڈاکخانہ کی رسیدیں اکثر نہیں ملتی ہیں۔ بقیہ نسخے جب فروخت ہوجائیں گے تو انشااللہ رقم وصول کر کے روانہ کر دیا کروں گا۔

''اشارہ'' کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ رازؔ بلخی پر آپ کا مضمون پسند آیا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے تصویر بھی شائع کرادی۔ مرحوم ان قدر افزائیوں کے یقینی مستحق تھے۔ تاریخ شعرائے بہار جلد دوم کی اشاعت اگر واقعی آپ نے کردی تو یہ نادر مسودہ بربادی سے بچ جائے گا۔ یہ بڑی خدمت ہوگی بلکہ جلد اول ودویم دونوں کو ساتھ چھپوائیں کیونکہ وہ بھی اب نایاب ہے۔

جناب قیوم خضر صاحب مدیر اشارہ ان دنوں کلکتہ میں قیام فرما ہیں۔ ملاقات ہوئی۔ بڑے پرجوش نوجوان ہیں۔ خدا ہمت اور استقلال دے۔

بہار کی اردو صحافت کی تاریخ پر کوئی مقالہ سپرد قلم فرمائیں تو نہایت مفید ہوگا۔ بہار میں اردو مطابع کی تاریخ بھی ایک ضروری اور اہم موضوع ہے جس پر توجہ ضروری ہے کیونکہ ادب کے نشر واشاعت کے یہی ذرائع ہیں۔

والسلام

طالب خیر

شاہ مقبول احمد

مرگِ پدر

کہاں تک ضبط غم سے کام لوں بے اختیاری ہے
جگر پھنکتا ہے، دل جلتا ہے، اشک آنکھوں سے جاری ہے
مصیبت بوجھ ہے، وہ بوجھ جو بھاری سے بھاری ہے
یہ حال بے قراری ہے، زباں کہنے سے عاری ہے
حزیں جذبات کے بادل کہیں تھم کر برستے ہیں
بڑے ظالم، بڑے بے باک ہیں، جم کر برستے ہیں

فراقِ دائمی میں عمر بھر تو رو نہیں سکتا
مگر اس داغ کو دامان دل سے دھو نہیں سکتا
فریب صبر دوں خود کہ تو یہ بھی ہو نہیں سکتا
کہ دل بیدار ہی رہتا ہے ظالم سو نہیں سکتا
اسے تسکین دینے سے بھی کیا تسکین ہوتی ہے
حقیقت جس مصیبت میں ہو وہ سنگین ہوتی ہے

بزرگو! مجھ کو تم ناداں سمجھ کر خیر بہلاؤ
برائے تعزیت ماتم کدے میں شوق سے آؤ
تمہارا کا م ہے تلقین، تم تلقین فرماؤ
مگر اتنی گذارش ہے کہ میرے دل کو سمجھاؤ
بہت جاں سوز ہوتا ہے بڑا منحوس ہوتا ہے
غم مرگ پدر جو بعد کو محسوس ہوتا ہے

جہان آب وگل سے ایک پیر ناتواں اٹھا
سہارے سے نجات دائمی کے شادماں اٹھا
لئے آنکھوں میں خواب زندگی جاوداں اٹھا
مگر میں کیا بتاؤں کیوں مرے دل سے دھواں اٹھا

محبت جس کی ہو یاد اس کی پر تاثیر ہوتی ہے
جو دل پر مثل نقش کا لحجر تحریر ہوتی ہے

مرے دل پر گراں بار اگلم ہے دوستو، سن لو
تسلی بھی تمہاری وجہ غم ہے دوستو، سن لو
مجھے چھیڑا تو یہ بھی اک ستم ہے دوستو، سن لو
تمہیں میری محبت کی قسم ہے دوستو، سن لو

پرائے غم کو اپنے غم سے جو بھی کم سمجھتے ہیں
بڑے ناداں سہی، وہ فطرت آدم سمجھتے ہیں

مرا تم ساتھ دوا ے ساتھیو یہ کہہ نہیں سکتا
مرے گھر آکے تم ماتم کرو یہ کہہ نہیں سکتا
مصائب جو ہیں مجھ پر بانٹ لو یہ کہہ نہیں سکتا
مرے غم میں شریک غم بنو یہ کہہ نہیں سکتا

مگر یہ کہہ تو سکتا ہوں فغاں دل سے نکلنے دو
مرے افکار کو اشعار کے سانچے میں ڈھلنے دو

مرا جذبہ غم و آلام سے مانوس ہوتا ہے
لہو رونے پہ آمادہ دل مایوس ہوتا ہے
تخیل شیشۂ اظہار پر معکوس ہوتا ہے
لباس حزن میں موضوع فن ملبوس ہوتا ہے

کروں دل کو اگر پتھر کلیجہ منہ کو آئے گا
قلم قرطاس پر اب کچھ نہ کچھ تو گل کھلائے گا

سنبھلتا ہوں، سنبھل کر میں زبان و لب ہلاتا ہوں
دماغ و ذہن کو توقیر کا مژدہ سناتا ہوں
پدر کا ذکر ہے میں احتراماً سر جھکاتا ہوں
دل وحشت زدہ کو باادب رہنا سکھاتا ہوں

کہ ہوکر کشتۂ آلام جذبوں سے بھراہوں میں
مقدس ہستیٔ مرحوم کا مدحت سراہوں میں

وہ ہستی جس کے دم سے میری دنیا میں اجالا تھا
وہ ہستی بحر ظلمت سے مجھے جس نے نکالا تھا
وہ ہستی جس نے گرتے دیکھ کر مجھ کو سنبھالا تھا
وہ ہستی جس کا اہل خانداں میں بول بالا تھا

وہ ہستی اٹھ گئی اس سے زیادہ اور کیا ہوتا؟
جواں، اے آسمان پیر تیرا جور کیا ہوتا؟

وہ ہستی ہاں وہی جو حامل علم و لیاقت تھی
وہ ہستی ہاں وہی جو چشمۂ نور سخاوت تھی
وہ ہستی جس سے مجھ بدبخت کو بے حد عقیدت تھی
وہ ہستی ہاں وہی ہستی جو مینار شرافت تھی

اکیلا میں نہیں ہوں دور اس کے دست شفقت سے
ہزاروں ہوگئے محروم اب اس کی محبت سے

وہ مرد باعمل جس کو فرایض آشنا کہیے
مرقع خیر کا آئینہ نورِ ہدا کہیے
فقیہ وقت کہیے متقی و پارسا کہیے
امام علم ودانش اہل فن کا رہنما کہیے

وہ اب لیٹا ہوا زیر زمیں راحت بہ داماں ہے
لحد اس کی زمیں پر زینت شہر خموشاں ہے

ادیب الملک، ادب پرور، ادب کا پاسباں وہ تھا
محقق، ناقد علم وہنر، تاریخ داں وہ تھا
سخن سنج و سخنور، صاحب طرز بیاں وہ تھا
کمال ظاہری وباطنی کا ارمغاں وہ تھا

وطن کی شان تھا اس کا وطن پر بار احساں ہے
وطن کے تاج کا وہ گم شدہ لعل درخشاں ہے

بہ حال زار میں روتا ہوں رولے اے وطن تو بھی
میں ہوں رنجور ہو جا حامل رنج ومحن تو بھی
مرا طرز سخن بدلا بدل اپنا چلن تو بھی
فلک تو سنگدل ٹھہرا، کٹھورا تنا نہ بن تو بھی

اثر تجھ پر نہیں تو ہی نے اپنا لعل کھویا ہے
پس خواب عدم آغوش میں تیرے ہی سویا ہے

نہ تو سمجھے اگر تو اے وطن یہ بد نصیبی ہے
تری محفل کی رونق رفتہ رفتہ گھٹتی جاتی ہے
وہی تجھ سے بچھڑ تا ہے ترا جو بھی فدائی ہے
نہ یہ آثار اچھے ہیں نہ یہ اچھی نشانی ہے

گراں مایہ گہر سے شان رہتی ہے خزانے کی
کسی عالم کا مرنا موت ہے سارے زمانے کی

کہ عالم روح انسانی کا اک معمار ہوتا ہے
رباب زندگی کا سوز پرور تار ہوتا ہے
حکیم وقت یعنی صاحب اسرار ہوتا ہے
بلند اقبال ہوتا ہے، بلند افکار ہوتا ہے

گذرنا اس کا ہر موجود کا معدوم ہوجانا
فروغ نور سے ہر شمع کا محروم ہوجانا

پدر کی موت پر طفل دل معصوم روتا ہے
ہوا ہے شفقت استاد سے محروم، روتا ہے
چراغ رہنمائی بجھ گیا، مظلوم روتا ہے
وگرنہ پھوٹ کر اتنا کوئی مغموم روتا ہے

فراوانی مرے اشکوں کی دیکھوں کون روکے گا؟
زہر افشانئ خون جگر پر کون ٹوکے گا؟

وہی روکے گا رونے پر حقیقت سے جو غافل ہے
غم تازہ کوئی کیسے بھلادے کام مشکل ہے
کرے تو کیا کرے انساں کہ پابند سلاسل ہے
اجل کے ہوش آنے تک اسیر جذبۂ دل ہے

جو دیوانہ ہے خود سمجھے وہ رمز مرثیہ خوانی
پس غم فطرت آدم ہی ہو جاتی ہے دیوانی

پدر کی موت پر میں محو غم ہوں، مرثیہ خواں ہوں
شہید فتنۂ جور وستم ہوں، مرثیہ خواں ہوں
پریشاں حال ہوں باچشم نم ہوں، مرثیہ خواں ہوں
مجسم ایک تصویر الم ہوں، مرثیہ خواں ہوں

مسرت چھن گئی مجھ سے بہار زندگی روٹھی
ہنسی روٹھی، خوشی روٹھی، مری زندہ دلی روٹھی

یہ عالم ہے عجب اس کا عجب دستور ہوتا ہے
یہاں قدرت کے ہاتھوں ہر بشر مجبور ہوتا ہے
بلائے ناگہاں میں جب کوئی محصور ہوتا ہے
تو اس کم بخت کا سایا بھی اسی سے دور ہوتا ہے

منور بزم جب ہوتی ہے خود آتے ہیں پروانے
اندھیرا جب بھی چھاتا ہے چلے جاتے ہیں پروانے

ہوا بدلی، چمن اجڑا، چمن سے دلکشی روٹھی
مجھے ناشاد رکھنے کے لیے قسمت مری روٹھی
پریشاں زندگی کا ذکر ہی کیا موت بھی روٹھی
مرا ماحول روٹھا، دوستوں کی دوستی روٹھی

پرائے کیا کچھ اپنے لوگ بھی دامن بچاتے ہیں
مجھے کھویا ہوا پاکر نظر مجھ سے چراتے ہیں

شکایت کیا کسی کی جبکہ ٹھہری بے وفا دنیا
جفا پرور ستمگر ایک درد لادوا دنیا
اسے کہنے کو کہتے ہیں کہ ہے راحت فزا دنیا
حقیقت میں مگر بے فیض ہے خود آشنا دنیا

گلے اس کو لگاتی ہے کہ جس سے کام رہتا ہے
جو ہے گوشہ نشیں گوشے میں بے آرام رہتا ہے

یہ انساں جس کو کہتے ہیں امین ارتقا انساں
زباں رکھتے ہوئے اکثر ہوا ہے بے نوا انساں
ازل ہی سے رہا ہے کشتۂ دارالفنا انساں
قرار دائمی سے رہ سکا کب آشنا انساں

سکون دائمی تو موت ہی کے بعد ملتا ہے
یہ گل کب گلشن عالم کے گلزاروں میں کھلتا ہے

یہ سچ ہے خواہشوں پر کچھ نہیں ہے اختیار اپنا
اک ارماں پھر بھی رکھتا ہے دل زار و نزار اپنا
کہ جب ہوتا تو بس ہوتا وطن دارالقرار اپنا
پدر کی قبر ہی سے متصل ہوتا مزار اپنا

مگر کہنا یہ مشکل ہے کہ مستقبل میں کیا ہوگا
جب اپنا جسم بے جاں دفن ہونے کو دھرا ہوگا

عبث ہے درحقیقت حسرت ناکام کاشکوہ
نہ کرائے تشنگی میری شکستہ جام کا شکوہ
دل بے تاب یہ کیسا غم وآلام کا شکوہ
و ناداں ہیں وہی کرتے ہیں صبح وشام کا شکوہ

مصیبت زندگی بھرجو بھی ہے برداشت کرنی ہے
یہ نشتر کی انی وہ ہے جو دل ہی میں اترنی ہے

غم ورنج والم کے درمیاں رہنا ہی پڑتاہے
مصائب سہہ کے اکثر بے زباں رہنا ہی پڑتاہے
جہاں میں بے سکون وبے اماں رہنا ہی پڑتاہے
نہیں لگتا ہے جی لیکن یہاں رہنا ہی پڑتاہے

مداوا کچھ بھی ہو یہ درد دل یوں کم نہیں ہوتا
غم آدم، غم دوراں میں جب تک ضم نہیں ہوتا

☆☆☆

صابر آروی

پارسائی ترے دامن کی تری مانگے ہے

(فصیح الدین بلخی مرحوم کی روح کو خراج عقیدت)

رات جب نیند سے چونکا تو اٹھا دل میں خیال
کون آیا تھا علاج غم دوراں لے کر
ناز برداریٔ افکار کا ساماں لے کر
یہ جو اک درد ہے اس درد کا درماں لے کر
کشتیٔ عزم بہ ہنگامۂ طوفاں لے کر
پردۂ ذہن پہ ابھرے کئی دھندلے اشکال

ربط دینے لگا بکھرے ہوئے افسانوں کو
رفتہ رفتہ کوئی تنویر ابھر ہی آئی
حادثوں کی کوئی زنجیر ابھر ہی آئی
کاتب وقت کی تحریر ابھر ہی آئی
ایک مانوس سی تصویر ابھر ہی آئی
اب کہانی کی ضرورت نہیں عنوانوں کو

جہل کی دھوپ میں ہے علم کے دامن کی تلاش
اے فصیح بلخی، تجھ کو عقیدت کا سلام
رسم اخلاص کی دیرینہ روایت کا سلام

ذوق فنکار کا، افکار کی جودت کا سلام
تیری بخشی ہوئی تحقیق کی دولت کا سلام
گل نوازوں کو ہے اب تیرے ہی گلشن کی تلاش

وہ تری دیدۂ بینا، وہ تری دیدہ وری
علم تحقیق کو دینا تھا تجھے ایک مقام
گرچہ چھائی رہی تاریکیٔ ابرِ اوہام
تجھ کو پینا ہی پڑا مصلحت وقت کا جام
نہ ملا تیری وفاوں کا مگر کچھ انعام
چاک پیراہن حالات کی وہ بخیہ گری

کارواں خاک بہ سر ہے کہ پتا پاجائے
رہرو راہ ادب، راہبری مانگے ہے
پارسائی ترے دامن کی تری مانگے ہے
فن ہمیشہ ہنر شیشہ گری مانگے ہے
ذوق شاعر کا تری خوش نظری مانگے ہے
دل بے تاب تڑپنے کا صلہ پاجائے

☆☆☆

فہرست مضامین فصیح الدین بلخی مرحوم

عنوانات	رسائل/ مقام وسنہ اشاعت
۱۔ منیر اور بہار میں مسلمانوں کی آمد	ندیم (گیا) 'بہار نمبر' ۱۹۳۵ء
۲۔ قلعۂ رہتاس کی تاریخی سرگذشت	معاصر، پٹنہ ستمبر اکتوبر ۱۹۴۹ء
۳۔ عظیم آباد میں شعرا کے مزارات	معاصر پٹنہ جنوری ۱۹۵۲ء
۴۔ روز و ماہ و سال کی سرگذشت	ماہنامہ 'تہذیب' پٹنہ، دسمبر ۱۹۵۲ء
۵۔ اردو قواعد و لغت کی تدوین	ماہنامہ 'تہذیب' پٹنہ، اپریل ۱۹۵۳ء
۶۔ صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت	ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ، اگست ۱۹۵۳ء
۷۔ عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر (ضیا)	ماہنامہ 'تہذیب'، پٹنہ، اگست ۱۹۵۳ء
۸۔ مخالفت قیاس	ماہنامہ 'اشارہ'، پٹنہ اپریل ۱۹۵۴ء
۹۔ سرقہ و توارد	ماہنامہ 'اشارہ'، پٹنہ اپریل ۱۹۵۴ء
۱۰۔ وزیر علی عبرتی	ماہنامہ 'اشارہ'، پٹنہ اپریل ۱۹۵۴ء
۱۱۔ فدوی کا ایک مسدس	معاصر پٹنہ جلد ۲ حصہ ۷، ۱۹۵۴ء
۱۲۔ اطرافِ پورنیہ کے بزرگوں کا حال	ہفتہ وار 'انسان'، کشن گنج پورنیہ نمبر، ۱۹۵۵ء
۱۳۔ مثنوی گوہر جوہری	مصور پٹنہ نومبر ۱۹۵۵ء
۱۴۔ موسیقی اور شاعری	پٹنہ جولائی ۱۹۵۶ء
۱۵۔ مولوی شجاع الدین علی	ماہنامہ 'صبح'، پٹنہ اپریل ۱۹۵۸ء
۱۶۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں	ماہنامہ 'صبح'، پٹنہ مئی ۱۹۵۸ء
۱۷۔ ایک ہندو شاعر کا عارفانہ کلام (نندلال گویا)	ماہنامہ 'صنم' پٹنہ نومبر ۱۹۵۸ء
۱۸۔ شوق نیموی	ماہنامہ 'اشارہ' پٹنہ دسمبر ۱۹۵۸ء

۱۹۔	موزوں عظیم آبادی (راجا رام نراین)	ماہنامہ 'اشارہ' پٹنہ جنوری ۱۹۵۹ء
۲۰	تاریخ شعرائے بہار کا مولف (عزیز الدین راز بلخی)	ماہنامہ 'اشارہ' پٹنہ فروری ۱۹۵۹ء
۲۱۔	یاس بہاری	ماہنامہ 'سہیل' گیا مارچ ۱۹۵۹ء
۲۲۔	عظیم آباد میں امیر مینائی کی آمد	ماہنامہ 'اشارہ'، پٹنہ ستمبر ۱۹۵۹ء
۲۳۔	راسخ عظیم آبادی	ماہنامہ 'صنم' پٹنہ 'بہار نمبر'، نومبر ۱۹۵۹ء
۲۴۔	اجاگر چند الفت	ماہنامہ 'اشارہ' پٹنہ جنوری-فروری ۱۹۶۰ء
۲۵۔	پلاموں کی تاریخی سرگذشت	سہ ماہی کوئل ڈالٹن گنج (شمارہ ۱۰) ۱۹۶۱ء
۲۶۔	شبلی نعمانی	ماہنامہ صبح نو پٹنہ اگست ۱۹۶۱ء
۲۷۔	شوق نیموی اور شوق قدوائی کا ایک شاگرد	سہ ماہی کوئل ڈالٹن گنج اپریل ۱۹۶۲ء
۲۸۔	مولوی شجاع الدین	صبح نو، پٹنہ اپریل ۱۹۶۲ء
۲۹۔	عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر	روزنامہ 'صدائے عام'، پٹنہ اپریل ۱۹۶۲ء

ریڈیو ٹاک

۱۔ صوبۂ بہار کی تاریخی اہمیت

۲۔ بہار شریف کا میلہ

۳۔ محمود گانواں

۴۔ ملک محمد جائسی اور پدماوت

۵۔ اکبر کے نورتن فیضی اور ابوالفضل

۶۔ تاریخی کتابوں کی بطور ماخذ اہمیت

درج ذیل مضامین دائرۃ المعارف کے لیے لکھے گئے تھے۔ لیکن دائرۃ المعارف کی جلدوں میں موجود نہیں ہیں۔

۱۔ علی ابراہیم خاں خلیل

۲۔ ملا غلام یحییٰ بہاری

تاریخ مگدھ

(صوبہ بہار کی مکمل تاریخ)

۶۴۲ ق م — ۱۶۴۳ء

مرتبہ

مولوی فصیح الدین بلخی عظیم آبادی

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

فصیح الدین بلخی
حیات اور کارنامے

مرکز تحقیقات اردو وفارسی گوپال پور کی زیر طبع کتابیں

تاریخ الائمہ: وزیر علی عبرتی عظیم آبادی (بہ زبان فارسی)

ترتیب، تدوین مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

بہار میں اردو مرثیہ نگاری (از آغاز تا امروز)

از پروفیسر سید حسن عباس

اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ

ہوش عظیم آبادی کے مرثیے

ترتیب و پیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

مقالات مختار

فارسی ادبیات سے متعلق اردو میں لکھے گئے پروفیسر مختار الدین احمد کے مقالات کا قیمتی مجموعہ

ترتیب و پیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

مقالات دیسائی

تاریخ ہند، فارسی شعر و ادب، دکنی ادب، کتبہ شناسی اور آثار قدیمہ کے موضوعات پر

ڈاکٹر ضیاالدین دیسائی کے اردو مقالات کا بیش قیمت مجموعہ

ترتیب و پیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

خطوط مشفق خواجہ بنام مختار الدین احمد (ہندوستانی ایڈیشن)

ترتیب و پیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

معروف محقق اور غالب شناس پروفیسر حنیف نقوی کے نام مشاہیر کے خطوط
ترتیب وپیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

سنجر تہرانی: احوال وآثار
میرزا عبدالعطوف محمد تقی کمال الدین معروف بہ آغا سنجر کی حیات اور علمی خدمات پر مبسوط کتاب مع انتخاب کلام
ترتیب وپیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

فہرست مقالات فارسی
فارسی زبان وادبیات کے مختلف اور گوناگوں موضوعات پر اردو میں مطبوعہ مضامین کا اشاریہ
ترتیب وپیش کش مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

سفرنامہ سلیمان تاجر
ابن بطوطہ سے پہلے ہندوستان اور چین کی سیاحت کرنے والے عرب سیاح سلیمان تاجر کے سفرنامہ ہند وچین کو پہلی بار مولوی مہیش پرساد عالم فاضل نے براہ راست عربی سے ہندی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۲۱ء میں شایع کیا تھا۔ اس قیمتی دستاویز کا ہندی سے اردو ترجمہ۔
ترجمہ مع مقدمہ: پروفیسر سید حسن عباس

حضرت شیخ سعدی
معلم اخلاق شیخ سعدی شیرازی پر منشی پریم چند کی معرکتہ الآرا ہندی کتاب کا اردو ترجمہ
ترجمہ مع مقدمہ وحواشی: پروفیسر سید حسن عباس

مثنوی 'مرآۃ الجمال' (سراپاے معشوق۔ فارسی)
از: میر غلام علی آزاد بلگرامی
ترتیب وتصحیح مع مقدمہ وحواشی: پروفیسر سید حسن عباس

Jan-June 2015

ISSN 2454-5260

IDRĀK 8

An Urdu Journal of Research and Literary Value

January-June 2015

Editor (Hon.): Prof. Syed Hasan Abbas

ادراک گوپال پور کے آیندہ خصوصی شمارے

اردو طنز و مزاح کے صاحب طرز فن کار احمد جمال پاشا مرحوم پر ایک مثالی
پیش کش عنقریب منظر عام پر۔ شاد عظیم آبادی اور علامہ جمیل مظہری جیسے جہت
ساز شعرا، معروف محقق اور غالب شناس قاضی عبد الودود، پروفیسر نذیر احمد،
پروفیسر مختار الدین احمد اور پروفیسر حنیف نقوی کے نام مشاہیر ادب کے
خطوط، فارسی ادب کے معروف اسکالرز پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر
سید حسن اور ڈاکٹر ضیا الدین دیسائی کی شخصیت اور علمی تحقیقی کارناموں پر مشتمل
ادراک کے خصوصی شمارے زیر ترتیب ہیں جو مستقبل قریب میں اہل علم کی
خدمت میں پیش کیے جائیں گے۔ اہل قلم سے درخواست ہے کہ مذکورہ
موضوعات یا عنوانات پر اپنے رشحات قلم سے نواز کر ان خصوصی شماروں کو مثالی
اور یادگار بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔

₹ 300/-

Urdu & Persian Research Centre Gopālpūr,

Gopālpūr, Bākarganj,Siwan 841 286, Bihar, India
Email: prof.shabbas@gmail.com/9839337979